اُردو میں
لسانی تحقیق
پروفیسر عبدالستار دلوی

اردو میں لسانی تحقیق

پروفیسر عبدالستار دلوی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/193 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1843

Urdu Mein Lisani Tehqeeq
By: Prof. Abdus Sattar Dalvi

ISBN :978-93-5160-073-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای-میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی-110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

''اگر زبان نہ ہوتی تو نیکی اور بدی، سچ اور جھوٹ، اچھائی اور برائی، خوشگوار اور ناخوشگوار میں فرق کرنا مشکل ہوتا۔ صرف زبان ہی سے اِن سب کا ادراک ممکن ہے۔ لہٰذا زبان کے بارے میں غور وخوض کیا کیجئے۔''

چھاندگیہ اپنشد 7-2-1

فہرست

دیباچہ

اردو میں لسانیات کی تاریخ نسبتاً نئی ہے۔ انشاء اللہ خان کی دریائے لطافت، سرسید کی قواعد اردو، محمد حسین آزاد کا ''آب حیات'' کا مقدمہ اور ''سخن دان فارس'' اردو میں لسانیات کے ابتدائی نقوش ہیں۔ بعد میں پروفیسر محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' اور دیگر مضامین اور پنڈت دتا تریہ کیفی کی ''کیفیہ'' اس سمت میں ایک اعلیٰ پیش رفت ہے۔ مذکورہ کتابوں سے اردو میں لسانیات پر مستقل کام کرنے کے لیے رہنمایانہ اشارے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر وحید الدین سلیم اور مولانا سید سلیمان ندوی نے دقت نظر کے ساتھ اپنی دلچسپی کے ساتھ اردو لسانیات کے دائرہ کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری سہیل بخاری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگارشات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو میں جدید لسانیات کی ابتدا کا سہرا پروفیسر محی الدین قادری زور کے سر ہے۔ ان کی کتابیں ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' (بزبان انگریزی) اردو میں جدید لسانیات پر سائنسی اور علمی کتابیں ہیں اور انھیں سے اردو میں جدید لسانی علوم کا شعور پیدا ہوا۔ بعد میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی توضیحی، تاریخی اور اسلوبیاتی لسانیات پر

گراں قدر کام کیا اور ان کی رہنمائی میں اردو لسانیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس سلسلے کے چند اہم نام پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عبدالغفار شکیل اور ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اسلوبیاتی لسانیات کو اعتبار بخشا۔

''اردو لسانیات'' بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح پر ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے، مگر جدید لسانیات اور اس کی مختلف شاخوں پر کوئی مستقل کتاب دستیاب نہیں تھی جس کی روشنی میں ایک عام اردو کا قاری اور طالب علم استفادہ کر سکے۔ لسانیات سے دلچسپی کی خاطر میں نے 1971 میں لسانی علوم پر بکھرے ہوئے مضامین کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے مختلف زاویوں سے غور وفکر کرنے کے بعد ''اردو میں لسانیاتی تحقیق'' پر اپنی کتاب مرتب کی جس میں انگریزی میں ترتیب کے جدید اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔ یہ کتاب اردو میں بہت مقبول ہوئی اور ہندوستان کی تقریباً ہر یونیورسٹی میں اسے نصاب میں شامل کیا گیا۔ علمی و ادبی نیز تعلیمی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی ہوئی۔ گذشتہ چالیس برسوں میں اس کتاب کی مانگ برابر جاری رہی اور آج بھی یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا میں اس کتاب کی برابر مانگ ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اب یہ کتاب دوبارہ شائع کی جارہی ہے۔ تکنیکی نوعیت کی کتابوں کی اشاعت نسبتاً ایک مشکل کام ہے، مجھے خوشی ہے کہ ملک کے ممتاز علمی ادارے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی لی اور اب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہورہا ہے۔ کتاب پر نظر ثانی اور اضافے کی گنجائش تھی لیکن ایسی صورت میں ضخامت کے بڑھ جانے کے خیال سے یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کی تلافی کسی حد تک میری دوسری کتاب ''اردو زبان اور سماجی سیاق'' سے ممکن ہے کہ ہوسکے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مجھے اپنے عزیز دوست پروفیسر محمد ظفرالدین، صدر شعبہ ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور ڈاکٹر مسرت جہاں (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو) کا مکمل تعاون حاصل رہا اور تصحیح کی تمام تر ذمہ داریاں انھوں نے نبھائی۔ میں ان دونوں کی اس لسانیات نوازی کے لیے صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔ میں اپنی بیٹی ڈاکٹر معزہ قاضی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،

ممبئی یونیورسٹی) کا بھی اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کے لیے شکرگزار ہوں۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت دوم سے نہ صرف اردو نصاب کی ضروریات پوری ہوسکیں گی بلکہ زبان کا عام قاری بھی اس سے استفادہ کر سکے گا۔

عبدالستار دلوی

حرف چند

زبان ہر جگہ ہے۔ اس کے بارے میں غور و خوض ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ ہندوستان میں پانن نے اپنی معرکتہ الآرا سنسکرت قواعد، 400 ق۔م۔ میں تصنیف کی تھی۔ یونانیوں میں اپنی زبان کی قواعد کے بارے میں تفحص کا سلسلہ ارسطو کے زمانے سے قائم ہے۔ اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں یورپی عالموں کی سنسکرت کی بازیافت نے تاریخی اور تقابلی لسانیات کا نیا باب کھول دیا۔ بالآخر بیسویں صدی کے آغاز میں علم زبان اپنے ارتقا کی اس منزل پر پہنچ گیا جسے آج ہم "توضیحی لسانیات" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ صوتیہ (Phoneme) اور تشکیلیہ (Morpheme) کے نئے تصورات نے اس علم کی کایا کلپ کر دی۔ 1950 کے بعد نحو اور معنی کے مسائل نئے انداز میں دیکھے جانے لگے۔ آج ان مسائل سے متعلق ہر سال ایک نئے نقطۂ نظر کا اضافہ ہو رہا ہے اور لسانیات باوجود عمرانی علوم میں سب سے نیا علم ہونے کے آج ایک فکری تلاطم کا شکار ہے اور اس کی سرحدوں کی توسیع نفسیات، ادبیات، عمرانیات، بشریات، فلسفہ، ریاضی اور مشینی ٹرانسلیشن تک ہو چکی ہے۔

لسانیات کے بارے میں جو مواد آج انگریزی، فرانسیسی، روسی اور دیگر یورپی زبانوں میں جمع ہو گیا ہے اس کے پیش نظر اردو میں جو کچھ اس علم پر لکھا گیا ہے وہ قطعی طور پر ہیچ ہے۔ اردو

ملا کی ہند آریائی زبانوں، بالخصوص سنسکرت کی معلومات اس قدر واجبی رہی ہے کہ وہ کوئی اہم کارنامہ اس میدان میں نہیں چھوڑ سکے ہیں۔ سنسکرت کی معلومات کے بغیر تاریخی لسانیات یا ہند آریائی زبانوں کی تاریخ پر کام کرنا محال ہے۔ ہندوستان میں توضیحی لسانیات کا چرچا پونا کے سمر اسکولوں سے شروع ہوا جن کا آغاز 1954 سے ہوتا ہے۔ آج اردو کے توضیحی تجزیہ کے بارے میں جو بھی مضامین یا رسالے ملتے ہیں وہ سب کے سب ان اسکالروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں جو بالواسطہ ان اسکولوں سے متعلق یا متاثر رہے ہیں۔ اردو کی پہلی قواعد یں یورپی اسکالروں کی دین ہیں۔ خانِ آرزو ہمارے پہلے عالم زبان تھے جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قریبی تعلق کی جانب ولیم جونز سے بھی قبل اشارہ کیا تھا۔ لیکن وہ اس کی تفصیلات مہیا نہ کر سکے۔ انشاء اللہ خاں انشا ہمارے پہلے شاعر عالم تھے۔ جنھوں نے ''دریائے لطافت'' میں نہ صرف اردو قواعد کے اہم مسائل کو اٹھایا بلکہ اپنے عہد کے شہر دہلی کی بولیوں کے نازک اختلافات کو اُجاگر کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن خانِ آرزو اور انشاء اللہ خاں انشا دونوں نے فارسی کے ذریعہ سے کام لیا۔ اس اعتبار سے اردو میں اردو کی قواعد لکھنے کا سہرا اسی شخص کے سر ہے جسے ہمارے تہذیبی اور ادبی احیاء کے اکثر پہلوؤں میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ میری مراد سرسید احمد خاں سے ہے جنھوں نے تیئیس برس کی عمر میں 1840 میں اردو کی قواعد ''قواعد صرف ونحو زبان اردو'' کے نام سے تصنیف کی اور اس کی غرض وغایت کا ان الفاظ میں تعین کیا:

> ''سبب اس کا یہ ہے کہ اہالیانِ سرکار کمپنی کو بہ مقتضائے تکلم الناس
> علیٰ قدر عقولہم یہ منظور ہوا کہ زبان اردو کو رواج دیجئے ۔۔۔ تا کہ
> ہر کہ ومہ اپنے مطلب کو پہنچے اور مطالب کو سوچے مگر یہ بات بہ
> سبب منضبط نہ ہونے قواعد اس زبان کے بن نہیں پڑتی ۔۔۔ [1]''
>
> (1۔ غیر مطبوعہ، مخزونہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ)

توضیحی لسانیات نہ سہی لیکن لسانیات کے دیگر پہلوؤں پر سرسید کے بعد سے اب تک مختلف اہلِ علم قلم فرسائی کرتے رہے ہیں ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھیں اس علم سے خاص شغف رہا ہے۔ مثلاً وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری

زورؔ، پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ۔ نئی نسل جس نے لسانیات کے توضیحی اور تاریخی دونوں پہلوؤں پر لکھا ہے۔ ان کے نام ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی پیش نظر تالیف میں موجود ہیں کہ یہ پیش کش انھیں لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر دلوی نے لسانیات سے متعلق منتشر مضامین کا یہ انتخاب کر کے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ حرف وصوت، رسم خط، زبان اور بولی، لفظ و معنی اور صوت و شعر کے ابواب کے تحت انھوں نے اردو لسانیات سے متعلق وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے جو علمی لحاظ سے لائق اعتنا ہے۔ اردو لسانیات کا یہ سرمایہ تحقیقی اعتبار سے ایسا نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔ تاہم اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ لسانیات کے بارے میں یہ پہلی کاوشیں ہیں۔ جب بھی کسی نئے علم کو ایک ایسی زبان میں متعارف کیا جاتا ہے جس میں اس پر لکھنے کی روایت موجود نہیں تو سب سے پہلے علمی اصطلاحات کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے وحید الدین سلیم، ڈاکٹر زورؔ اور پروفیسر سروری کی کاوشیں ملحوظ رکھنا ہوں گی۔ اس زبان میں بیان و اظہار کی نئی جہتیں متعین کرنا پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ مضامین نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو لسانیات کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی خاصی جان کندنی اور کوہ کنی کرنا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس تالیف کے ذریعے ڈگر اور جہت کا تعین کر دیا۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو "یہی کچھ ہے ساقی متاع عزیز" کا احساس دلا دیا، اور اگلوں سے آگے جانے کا سامان مہیا کیا۔

مسعود حسین خاں

زبان کی ترقی سے تعبیر کرتا ہے مگر حقیقتاً ادب کی ترقی سے زبان کی ترقی کا جو بھی تعلق ہے وہ اتنا معمولی ہے کہ اسے تعلق کے نہ ہونے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے لسانیاتی ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ماہرین لسانیات کو اردو زبان کی ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کرنا باقی ہے۔ موجودہ سیاسی کساد بازاری کے دور میں اہل اردو کے لیے خاص طور سے اس مسئلے پر فوری طور پر نہ صرف غور کرنے کی بلکہ عملی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے تحقیقی، علمی و ادبی اداروں کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیے۔

محمد حسین آزاد اردو میں غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کی ابتدا اور ترقی سے متعلق اپنی استعداد بھر سائنسی لحاظ سے قلم اٹھایا۔ مقدمۂ آب حیات اس لحاظ سے نہ صرف آب حیات کا مقدمہ ہے بلکہ اردو کے سارے لسانیاتی سرمایہ کے لیے بھی مقدمہ کا کام کرتا ہے۔ آزاد سے پہلے انشاءاللہ خان انشاء نے "دریائے لطافت" لکھ کر جدید لسانی اصولوں کے پیش نظر اردو کی بولیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ افسوس ہے کہ انشاء کی دریائے لطافت کے بعد زبان سے متعلق سائنسی تحقیق اردو میں معدوم ہوگئی۔ انشاء، اور آزاد سے لے کر اب تک جو بھی اس موضوع پر لکھا گیا ہے ان میں پنڈت کیفی، مولانا وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ تاہم ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات نے تاریخی لسانیات پر زیادہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور کی ہندوستانی صوتیات (انگریزی) ڈاکٹر مسعود حسین خان کی A phonetic and phonological study of a word in India ڈاکٹر نارنگ کی Karkhandari Urdu اور "اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور ڈاکٹر گیان چند کے مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں جدید لسانی اعتبار سے اردو پر کام کرنے کی انفرادی کوششیں ہیں، تاہم ابھی انفرادی اور جماعتی لحاظ سے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں ماہرین زبان Linguist کو مندرجہ ذیل سمت و رفتار میں کام کرنا چاہیے:

1۔ اردو کا صوتی تجزیہ

2۔ اردو کا صرفی ونحوی مطالعہ

3۔ اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے

4۔ اردو زبان کی تدریس کا مسئلہ

5۔ اردو کے سماجی وثقافتی پہلو

6۔ ذولسانیت اور اردو

7۔ اردو لغت کی تدوین

مندرجہ بالا موضوعات میں زبان کے صوتی تجزیے کو میں نے پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ کسی زبان کے لسانی مطالعوں کے سلسلے میں صوتی تجزیہ ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، جب تک کہ ہم زبان کا صوتی مطالعہ نہ کریں زبان کے دیگر پہلوؤں پر کام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ آواز ہی سے زبان وجود میں آتی ہے۔ صرفی (Morphological) مطالعہ میں بھی قدم قدم پر صوتی خصوصیات ہی کے تعین کے بعد ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ زبان کے رسم خط کے سلسلے میں بھی صوتی مطالعہ مددگار ثابت ہوگا ابھی اردو کی بنیادی آوازوں کا صحیح تعین نہیں ہوا ہے۔ بہت سے حروف کو ہم آوازوں کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ صوتی تجزیہ کے بعد حرف وصوت میں اعتبار پیدا ہوگا اور زبان کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک سائنسی کڑی ہمارے ہاتھ آجائے گی۔ اسی طرح اردو زبان کے صوتی مزاج کا بھی اندازہ ہوگا جس کے سلسلے میں ہم ابھی بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

اردو قواعد کی جدید ترتیب بھی اتنا ہی اہم کام ہے جتنا کہ اردو کی صوتیات کا مطالعہ اردو قواعد کے سلسلے میں خاص طور سے Descriptive theory of grammar اور Transformational theory کے پیشِ نظر زبان کا صرفی ونحوی مطالعہ ہونا چاہیے ہمارے لیے یہ افسوس ناک بات ہے کہ ہم سائنسی لحاظ سے کوئی مستند قواعد کی کتاب پیش نہیں کرسکتے جو زبان کے عمل (Function) کو دکھا سکے۔

اردو کی مختلف علاقائی اور سماجی بولیوں کے جائزے مثلاً دلّی کی اردو، لکھنؤ کی اُردو، پنجابی اردو، بمبئی کی اردو، دکنی اردو، میسوری اردو، مدراسی اردو جو علاقائی اعتبار سے مقامی بولیوں کے اثرات کے تحت الگ الگ بولیوں کی شکل اختیار کرگئی ہیں، ان کے تجزیاتی مطالعے بھی ضروری ہیں تاکہ اردو کی تمام بولیوں کو ان مطالعوں کے ذریعے محفوظ کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور

ہمزہ کیوں؟

یہ غلط فہمی افسوس ناک حد تک عام ہے کہ لسانیات اردو رسم الخط میں ہمزہ کو گردن زدنی سمجھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی اردو صوتیات کی بحث ہوتی ہے، ہمزہ کو "علامتِ بے صوت" کہا جاتا ہے۔ اور یہ غلط بھی نہیں۔ اپنے کتابچے "اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور اپنی دوسری تحریروں میں جہاں بھی ہمزہ کا ذکر آیا ہے، میں نے یہی عرض کیا ہے لیکن ان سب میں بحث آواز کی تھی۔ علامت کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کی نہیں۔ جنوری 1966 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو زبان وادب پر جو سمینار ہوا تھا، اس میں بھی ہمزہ کا ذکر برسبیل تذکرہ آیا تھا:

> "اردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آتی ہے کہ اُٹھئے، کیجئے، چاہئے، کئے، دئے، لیے وغیرہ الفاظ کو اکثر ہمزہ سے لکھتے ہیں، سو سب آنکھیں بند کیے اسی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ابتدائی اسکولوں کا کیا ذکر، ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمزہ آخر استعمال کس لیے کیا جاتا ہے؟ اردو کے صوتیاتی نظام میں وہ کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم اس علامت کو استعمال کرتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ عربی

نے اپنی انگریزی کتاب ہندوستانی صوتیات میں دکنی کا صوتی مطالعہ پیش کیا ہے اور ڈاکٹر نارنگ نے اپنی مختصر کتاب (Karkhandari Urdu) لکھ کر اردو بولیوں کا جائزہ لینے کی نیوڈالی ہے۔ ان ابتدائی کوششوں سے مدد لے کر اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ صوتی اعتبار سے اردو کے معیار کے سلسلے میں ان بولیوں کی مشترکہ خصوصیات ہی کے پیش نظر کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے گا۔ اردو سے متعلق ذولسانی مطالعہ Bilingual studies بھی دلچسپ اور رنگا رنگ موضوع ہے۔ بولیوں کے سماجی مطالعوں Social dialects میں "بازاراردو" "عورتوں کی زبان" مختلف پیشہ وروں کی زبان کے مطالعے بھی سماجی و لسانی مطالعوں کا اہم موضوع بن سکتے ہیں۔

اُردو میں لغت کی تدوین بھی بنیادی اور اہم ضرورت ہے۔ گو اردو میں لغتوں کی کمی نہیں لیکن مشکل ہی سے آپ کو کوئی ایسی لغت ملے گی جو ہماری تمام تر ضروریات پر حاوی ہو۔ لفظ، اس کی تشکیل، اصل و نسل، اس کی قسم (اسم، فعل، صفت وغیرہ) تلفظ کی صحت کے سلسلے میں تفصیلات ایک اچھی لغت کے ضروری اجزا ہیں۔ اس قسم کی لغت کی ترتیب میں "دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" کو بطور نمونہ سامنے رکھنا چاہئے۔ تلفظ کی صحت کے سلسلے میں جونس کی The English pronouncing Dictionary کے طرز پر لغت کی تدوین ہونی چاہیے لغت کی جدید ترتیب میں وہ سارے الفاظ شامل ہونے چاہئیں جو عام اردو بول چال میں استعمال ہوتے ہیں خواہ وہ کسی زبان سے ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح سولھویں، سترھویں، اٹھارھویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں مستعمل ہونے والے الفاظ پر مشتمل زمانہ کے مطابق لغتیں بھی مرتب ہونی چاہئیں۔

لسانی تحقیق کے دو پہلو ہیں، اردو میں اس نوع کی تحقیقات سے پہلے ان دونوں پہلوؤں کو علاحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اولاً لسانیات (Linguistics) کا سرعت سے ترقی کرنے والے جدید علم کی حیثیت سے مطالعہ۔ تاکہ اس کے ذریعے اردو میں علم زبان کے طالب علم کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو۔ اس سلسلے میں علمِ زبان کے سارے پہلو مثلاً تجزیاتی، تاریخی، جغرافیائی، (دو بولیوں کے مطالعوں کے ساتھ) لفظ و معنی کا تعلق، الفاظ کی تاریخ (Etymology) تدریس زبان، اختلاط زبانی (Languages in contact)

اور اسلوبیات (Stylistics) وغیرہ پیش نظر ہونے چاہئیں۔ دوم۔ ہند آریائی گروہ کی تاریخی اہمیت اور اس کے پیش نظر اردو کے ساتھ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی مطالعے تاکہ اردو کے جدید ہند آریائی زبانوں سے لسانیاتی رشتے بھی بیک نظر ہمارے سامنے رہیں۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں علم زبان کی سائنسی حیثیت تسلیم کر لینے کے بعد، اس نے تین تدریجی منزلیں طے کیں:

پہلی منزل: اس دور میں زبانوں کے خاندانی رشتے اور اس کے قواعد کی تاریخی ترقی سے بحث کی گئی۔ بوپ، گریم، میکس مُلر اور وہٹنے نے زبانوں کے خاندانی رشتے اور اس کی قواعد کی عہد بہ عہد ترقی کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اپنے مطالعے پیش کیے۔

دوسری منزل: اس عہد کے اہم علما وِ مال، برگمن اور ملیٹ ہیں۔ جنھوں نے پہلے پہل صوتی اصولوں (Phonetic laws) اور صوتی تغیرات کے لحاظ سے زبانوں کی تاریخ اور تشکیل سے متعلق نظریے قائم کیے۔ یسپرسن (Jesperson) اور وینڈرایے (Vendryes) نے جن میں اول الذکر ہالینڈ اور موخر الذکر فرانس کا رہنے والا تھا۔ اس عہد کے بنیادی نظریوں پر قائم رہتے ہوئے جنھیں پال، برگمن اور ملیٹ نے پیش کیا تھا۔ زبان کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں پر بھی زور دیا۔

تیسری منزل: یہ علم اللسان کی جدید ترین منزل ہے جس کی ابتداء فونیم (Phoneme) کے نظریے کے بعد رکھی گئی۔ اس نے قدیم تاریخی لسانیات Diachronic Linguistics کے ساتھ توضیحی لسانیات Synchronic Linguistics پر بھی زور دیا۔ 1930 کے بعد اس نے علمی اعتبار سے آزادانہ حیثیت حاصل کر لی اور قدیم تقابلی لسانیات (Comparative philology) کی محدود دنیا سے نکل کر نئی سمتیں اختیار کیں۔ فی زمانہ اس کے پراگ، کوپن ہیگن، لندن اور امریکی، چار اسکول مشہور ہیں۔ اردو کے لسانیاتی ادب کو علمِ زبان کے اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اردو میں اچھے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ تحقیقی مقالات کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے اردو غزل کا ارتقا، اردو تنقید کا ارتقا، اردو افسانے یا ناول کا ارتقا جن میں ادب کی

مختلف اصناف کی تاریخ اور ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کچھ مقالے ادبی شخصیتوں پر مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں موضوع کے اعتبار سے بھی مذکورہ بالا موضوعات پر کام کرنے کا مخالف نہیں ہوں۔ ادب میں ان کی بڑی اہمیت ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے تحقیقی اداروں، اور یونیورسٹیوں سے زبان کے سلسلے میں بھی تحقیقات کروائیں۔ تحقیق کرنے والوں میں کم سے کم پچاس فی صد اساتذہ اور طلبا کو لسانیاتی تحقیق کا کام اپنے ذمے لینا ہوگا۔ اس کے لیے جدید لسانیات میں تربیت یافتہ اشخاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام طلبا اور اساتذہ کو سمر اسکولوں Summer schools of linguistics میں بھیج (depute) کر کے بھی ہو سکتے ہیں۔

لیکن اس سے کہیں بہتر ہوگا اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں کے ایم اے (اردو) کے نصاب میں جدید لسانیات کی تعلیم لازمی کر دیں اور اس کے کم از کم دو پرچے ضروری ہوں۔ نصاب کی اس ترتیب میں زبان کی تاریخ، مختلف نظریے، زبان کا ارتقا (Philology) اور قواعد سے متعلق جو پرچہ عام طور سے ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہی سارے موضوعات لازمی لسانیات کے اور تاریخ ادب کے پرچے میں بہت خوبصورتی کے ساتھ شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے طلبا میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگا اور اردو زبان کے فروغ میں عملی طور سے وہ حصہ بھی لے سکیں گے جو اردو زبان کی بنیادی ضرورت ہے۔

جدید لسانیات کے عروج سے زبانوں کے علمی افق زیادہ تابناک ہو گئے ہیں۔ غیر تحریری زبانوں کو تحریر کی دولت مل رہی ہے۔ "بول چال کی یا گنوارو" زبانیں علم، فن میں عملی حصہ دار بن رہی ہیں۔ جس طرح جدید صنعتی تہذیب نے ذات پات اور رنگ و نسل کے فرق پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اسی طرح جدید علم زبان نے اس مخصوص میدان سے زبانوں کو مختلف طبقاتی درجوں میں انفرادیت اور اہمیت بخشی، ممکن ہے زبانوں سے متعلق سوچنے سمجھنے کا یہ علمی و سائنسی استدلال ہی دنیا کو کوئی عالمی زبان (Universal Language) کا راستہ دکھائے جو موجودہ حالات میں صرف ایک شاعرانہ تصور ہے۔

جس طرح کہ ماقبل السطور میں بیان کیا جا چکا ہے، اردو میں لسانیات سے متعلق بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ اردو جس قدر بڑی زبان ہے اسی قدر اس کے مسائل بھی متنوع اور پھیلے

ہوئے ہیں۔ ان مسائل کا حل زبان کے سائنسی مطالعے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور ان مسائل کے سمجھنے کے لیے علم زبان سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ گو لسانیات سے متعلق پچھلی دہائی سے انفرادی سطح پر چند مضامین اور کتابیں ضرور شائع ہوئیں۔ لیکن [illegible] مضامین زبان سے دلچسپی رکھنے والے طالب علم کی دسترس سے باہر تھے۔ ان سے طلبا کی ضر[illegible]ں بھی مشکل ہی سے پوری ہوتی تھیں۔ اردو میں لسانیات پر کتابوں کی ضرورت گو اب بھی با[illegible] ہے۔ تاہم میں نے مختلف رسائل اور کتابوں میں محفوظ اردو لسانیات سے متعلق مضامین کو شاید پہلی بار یکجا کر کے ایک عملی قدم اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو لسانیات سے متعلق بکھرے ہوئے مضامین کا یہ مجموعہ اردو زبان کے ماہر اساتذہ اور اس کی خدمت کا ذوق رکھنے والے سنجیدہ طلبا میں دیگر لسانی موضوعات پر کام کرنے کے لیے شوق کی آگ کو تیز کر دے گا۔ اس کتاب کی شاید یہی ایک واضح خوبی ہے کہ یہ ایک عام قاری اور اردو زبان کے طلبا کی اردو لسانیات کی بیشتر بنیادی باتیں جاننے کی خواہش پر مشتمل ہے، جن کا جاننا ان کے لیے ضروری ہے۔ اس مجموعہ میں شامل سارے مضامین عمومی لسانیات (General Linguistics) کی حدوں میں اردو زبان سے متعلق مختلف موضوعات پر محیط ہیں۔

میں نے مضامین کو چھ'' حصوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ اس سے زبان کی وسعت اور لسانی مطالعوں کے تنوع کو سمجھا جا سکے۔ پہلا حصہ 'حرف وصوت'' سے متعلق ہے۔ حرف وصوت تحریری و تقریری زبان میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''زبان اور بولی'' ہے۔ اس سے زبان اور بولی میں لسانیاتی فرق کے ساتھ اس کے رشتے بھی منسلک ہیں۔ اس سے زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں بنیادی باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ تیسرا حصہ ''لفظ و معنی'' کا ہے۔ یہ قواعد اور اشتقاقیات سے متعلق ہے۔ صرف لفظوں کا مطالعہ ہے اور معنی کو لفظ سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ چوتھے حصے میں اردو زبان سے متعلق مختلف افکار و مسائل پر بحثیں ہیں اور زبان کی صحت کے سلسلے میں صوتی و لسانی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پانچواں حصہ ''صوت و شعر،، اسلوبیات سے متعلق ہے جو اب لسانیات کا موضوع بھی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اسلوبیات (لسانی مفہوم میں) نیا موضوع ہے۔ اردو میں اس موضوع پر گنے چنے مضامین ہی

میسر آتے ہیں۔ مضامین کی تعداد خود اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضامین اردو لسانیات میں اس موضوع کی آبرو ہیں۔ آخری حصہ رسم الخط سے متعلق ہے۔ رسم الخط کی زبان میں ثانوی حیثیت کے پیش نظر ماہرین زبان نے ابھی اسے بہت زیادہ اہمیت تو نہیں دی ہے۔ تاہم اردو کے تعلق سے یہ موضوع بھی خاصا علمی موضوع ہے۔ اور اردو زبان کے لحاظ سے یہ بھی ایک بنیادی موضوع ہے۔

اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں سب سے پہلے مجھے مضمون نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جن کے مضامین ہی سے اس کتاب کے مرتب کرنے کا خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ مولانا وحید الدین سلیم، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری اور سر رضا علی جن کے رشحات قلم اس کتاب کی زینت ہیں۔ آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں بزرگوں نے اردو میں علم زبان سے متعلق بنیادی مواد فراہم کیا اور اس سے متعلق مختلف مسائل پر سنجیدہ غور و فکر سے اردو میں لسانیاتی تحقیق کے راستے سجھائے۔ موجودہ ماہرین میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین، ادیب، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل تقریباً ہر مضمون نگار نے بخوشی اپنے مضامین کو اس گلدستہ میں سجانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کتاب کا سارا حسن انھیں مختلف النوع پھولوں کا مرہون منت ہے۔ میں اس نوازش کے لیے ان تمام ماہرین کا بے حد ممنون ہوں کہ یہی اس کتاب کی اصل روح ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں مشہور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں (صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا شکریہ نہ ادا کروں جن کی ہمت افزائی اور مشورے نہ صرف اس کتاب کی ترتیب میں شامل حال رہے بلکہ جنھوں نے از راہِ نوازش کتاب کے لیے پیش لفظ لکھنے کی خوش گوار ذمہ داری بھی قبول کر لی اور کتاب کے معنوی حسن میں اضافہ کیا۔ ساتھ ہی اپنے دوست ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ریڈر، شعبہ اردو دلّی یونیورسٹی) کا بھی شکر گزار ہوں جن کے مشورے اس کتاب کی ترتیب میں معاون ثابت ہوئے۔ اپنے دوست جناب حامد اللہ ندوی

(رفیق مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر، بمبئی) بھی ہر قدم پر میرے مددگار رہے ہیں۔ ان کا بھی تہ دل سے مشکور ہوں۔ کتاب کی طباعت کے کٹھن مرحلوں میں پریس کاپیوں سے لے کر پروف ریڈنگ کی صبر آزما منزلوں تک اپنی رفیقۂ حیات ڈاکٹر میمونہ دلوی، عزیزی جمال الدین مقدم اور مسِ اختر مومن (معلمہ ایم۔ اے۔ اسمٰعیل یوسف کالج، بمبئی) کی تگ ودو اور تعاون ہی سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکی۔ میں ان کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

عبدالستار دلوی

پہلا باب: حرف وصوت

ابتدائیہ

زبان میں تقریر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ زبان میں اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی آوازوں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ یہی آوازیں جو مخصوص زبان میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ معنی اختیار کر لیتی ہیں، صوتیات کا موضوع ہیں۔ لسانیاتی علوم (Linguistic Sciences) میں صوتیات ہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ زبان میں قوت گویائی ہی ابتدائی منزل ہے۔ صوتیات لسانیات کی اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی اصوات کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لیے کسی مخصوص زبان سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ صوتیات میں تمام زبانوں کی آوازوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے کسی بھی زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں کی شناخت اور ان کا تعین ہو سکتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی ادائیگی کے وقت اعضائے نطق (Speech Organs) کی مختلف حالتیں، آوازوں کو مختلف اقسام مثلاً بندشی، ہکاری، حنکی، صفیری، تالوی، انفی، وغیرہ میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ صوتیات کے مطالعہ سے غیر تحریری زبانوں کو تحریر کے لباس سے آراستہ کیا جا سکتا ہے اور ثانوی زبانوں پر صوتی اعتبار سے مادری زبان کا سا عبور (Mother Tongue like Control) حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی ہر ممکن آواز کے لیے صوتی علامتیں مقرر ہیں جو رومن تحریر میں لکھی جاتی ہیں:

اسے بین الاقوامی صوتی رسم خط (IPA) کہا جاتا ہے۔ ''حرف وصوت'' کے سارے مضامین مندرجہ بالا صوتیاتی پس منظر کو سامنے رکھ کر مرتب کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضمون ''اردو صوتیات کا خاکہ'' کو اس میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں ہر زبان میں حروف بڑی حد تک آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم ہر حرف صوتی علامت نہیں ہوتا۔ ایسی غیر صوتی علامتیں مختلف زبانیں تاریخی وروایتی پابندیوں کے تحت استعمال کرتی ہیں اور زبانوں کے رسم خط میں بامعنی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مضمون ''اردو املا'' حرف وصوت کے اسی تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس حصہ کے دوسرے مضامین بھی زبان کے ان بنیادی عناصر سے بحث کرتے ہیں اور اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اُردو، صوتیات کا خاکہ

ہر زبان کا ایک صوتی نظام ہوتا ہے جس کے ارتقا کی نشان دہی تاریخی لسانیات کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اردو، صحیح معنوں میں ایک ریختہ اور مخلوط زبان ہے۔ اس کے قواعد کی ہر سطح پر لسانی اختلاط کے آثار پائے جاتے ہیں۔ عربی فارسی کے اثرات اسلوبیات سے ہوتے ہوئے تشکیلی صوتیات، صرف ونحو بلکہ صوتیات تک نفوذ کر گئے ہیں۔ آج ہم اردو زبان کا صحیح تصور اس وقت تک قائم نہیں کر سکتے جب تک کوئی شخص /ز/ /خ/ /ف/ /غ/ وغیرہ کو صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ /ق/ کے بارے میں جبیں پر شکنیں پڑ جائیں گی لیکن یہ بھی اسی صف میں آتا ہے۔ اردو رسم خط، عربی رسم خط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ جس کا اطلاق پہلے ایرانی پر ہوا اور بعد کو ہندوستانی زبان پر۔ بدیسی لباس میں جلوہ گر ہونے کی وجہ سے اردو، کے آریائی خدوخال کسی قدر روپوش ہو جاتے ہیں اور صوتیات کے طالب علم کو حرف پر صوت کا دھوکا ہوتا ہے۔ صوتیات کی تدریس کے سلسلے میں یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اردو، کے طالب علم کے ذہن میں حرف وصوت کا باہمی تعلق بہت دیر میں واضح ہوتا ہے۔ حرف ذہن پر اس قدر مسلط رہتا ہے کہ وہ اردو کی بنیادی آوازوں کو دیر میں پہچانتا ہے۔ وہ "گھر" "بھر" "جھڑ" وغیرہ الفاظ میں /کھ/ کو گ اور ھ /بھ/ کو ب اور ھ اور /جھ/ کو ج اور ھ سے مرکب آوازیں سمجھتا ہے۔ حالانکہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ مفرد آوازیں

ہیں نہ کہ مرکب۔ ہمارے مکتبوں میں اردو کے استاد بچے کو ہمیشہ گ ھ ر (زبر) گھر اور ب ھ ر (زبر) بھر پڑھاتے آئے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ بعض اوقات ہائے ہوز اور دو چشمی (ھ) کا امتیاز تک قائم نہیں رکھا جاتا۔ فرق صرف ایسے مقام پر کیا جاتا ہے جہاں خلط مبحث کا ڈر ہو۔ مثلاً دھر اور دہر۔

صوتیاتی نقطۂ نظر سے ہر زبان کی آوازوں کو دو خاص شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1- مصوتے Vowels

2- مصمتے Consonants

یہاں ہم عمداً اردو، قواعد کی عام اصطلاحات حروفِ علت اور حروفِ صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہمارے فلسفہ قواعد کے تمام پہلوؤں پر ''حرف'' کا تصور چھایا ہوا ہے۔ جب کہ بنیادی طور پر زبان تقریر ہے نہ کہ تحریر۔

اردو کے مصوتے:۔

اردو کے تمام مصوتے ہند آریائی ہیں اور تعداد اور نوعیت کے اعتبار سے فارسی اور عربی کے مصوتوں سے کافی مختلف۔ ان کے اظہار کے لیے جب عربی فارسی رسم خط کو استعمال کیا گیا تو کئی دقتوں کا سامنا ہوا۔ ان سے ہمارے معلمین اور کاتب مختلف زمانوں میں مختلف انداز میں عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ تاحال ان کی مقررہ علامات میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔

ہند آریائی لسانی روایت کے مطابق اردو، کے مصوتے دیوناگری رسم خط میں حسب ذیل ہیں:۔

آٹھ خالص مصوتے:۔

V Vk इ ई उ ऊ ए ऐ ओ औ

دوہرے مصوتے:۔ Diphthongs

دیوناگری میں ان کی ماترائی شکلیں حسب ذیل ہوتی ہیں:

ा ि ी ु ू े ै ो ौ

حرف V کی ماترا مفقود ہے۔ اس لیے کہ دیوناگری کے تمام مصمتوں

Consonants میں یہ مضمر تصور کیا جاتا ہے۔ سنسکرت میں جب کسی مصمتے کو بغیر v کے یعنی ساکن دکھانا مقصود ہوتا ہے تو क کی شکل میں "ہل" کر دیتے ہیں۔ v کے اس مضمر تصور سے آج ہندی پڑھنے میں نوشتوں کو ایک سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندی زبان اب لسانی ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں ارکان تہجی Syllables کے خاتمے پر مصمتے ساکن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس تصور کی وجہ سے دیہاتی مکاتب میں ابھی تک یوں پڑھایا جا رہا ہے चलता بجائے چلتی یعنی (त) متحرک بجائے ساکن کے۔ اس اعتبار سے اردو کا جزم (ْ) زیادہ صحیح تلفظ کی جانب رہبری کرتا ہے۔

عربی فارسی رسم خط میں مصوتوں کی مذکورہ بالا اقدار تین مکمل شکلوں (یعنی ا، ی، و) اور تین اعراب (زبر، زیر، پیش) کے علائم میں اظہار کی جاتی ہیں۔ باقی ماندہ انھیں سے مرکب شکلوں میں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ اگر دیوناگری کی ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے، ہم اپنے مصوتوں کو اردو رسم خط میں پیش کرنا چاہیں تو یہ شکلیں بنتی ہیں:

َ ا (آ) ِ ی ُ و ے ِ یے َ وٴ و

مثالیں:۔

مَل مال، مِل میل، مُل، مول، میل، مَیل، مُول مَول،

دیوناگری رسم خط اور سنسکرت صوتیات لسانی نقطۂ نظر سے اہم ہونے کے باوجود بعض لسانی مغالطوں کا شکار ہے۔ مثلاً v اور vk کے اظہار میں vk کو v کی طویل شکل تسلیم کیا جاتا ہے یہ تصور بارہ کھڑی کے بیشتر جوڑوں میں پوشیدہ ہے۔ لیکن جدید صوتیاتی تجزیے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان مصوتوں میں صرف لسبائی کا اختلاف نہیں بلکہ مخارج کا بھی ہے چنانچہ بین الاقوامی صوتیاتی رسم خط میں (جو رومن پر مبنی ہے) ان مخارج کے اختلافات کو پیش نظر رکھ کر ہر مصوتے کے لیے علاحدہ علامت مقرر کی گئی ہے۔

مصوتوں کے چوکھٹے میں جو انسانی منہ کی علم الاشکال کی روشنی میں شکل پیش کرتا ہے۔ ان مصوتوں کو حسب ذیل انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اردو کے مصمتے :۔

اردو کے مصمتوں کی تاریخ نہایت دل چسپ ہے جبکہ مصوتے خالص آریائی ہیں۔ مصمتوں میں ہندی، فارسی، عربی آوازوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ان آوازوں کو حسب ذیل مرکبات میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

1۔ خالص ہندی آوازیں :۔ بھ۔تھ۔ٹھ۔چھ۔کھ۔بھ۔دھ۔
ڈھ۔جھ۔گھ۔ٹ۔ڈ۔ڑ۔ڑھ۔

2۔ خالص فارسی:۔ ژ

3۔ خالص عربی:۔ ق

4۔ ہندی فارسی مشترک:۔ ب۔پ۔ت۔ج۔چ۔د۔ر۔س۔ش۔
ک۔گ۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی

5۔ ہندی عربی مشترک:۔ب۔ت۔ج۔د۔ر۔س۔ش۔ک۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی

6۔ فارسی عربی مشترک:۔ب۔ت۔ج۔ح۔خ۔د۔ر۔ز۔س۔ش۔غ۔غ۔
ف۔ق۔ک۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی

7۔ ہندی، فارسی، عربی مشترک:۔ب۔ت۔ج۔د۔ر۔س۔ش۔ک۔ل۔
م۔ن۔و۔ہ۔ی

لیکن اردو، رسم خط میں اس سے زیادہ حروف پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ذ۔ض۔ ظ۔ط۔ث۔ص۔وغیرہ

یہ تمام حروف ہیں۔صوت نہیں، اردو رسم خط کے لیے ایک طرح سے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔عربی، فارسی لسانی روایت کی دھاک ابھی تک اس طرح قائم ہے، کہ اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔صوتیاتی نقطۂ نظر سے اردو کی اصوات کو حسب ذیل طور پر مرتب کیا جا سکتا ہے۔

''اردو کے مصمتے''

		دولبی	دندانی	معکوسی	حنکی	غشائی	لہاتی (کوے کی)
بندشی	غیر مسموع	پ	ت	ٹ	چ	ک	ق
(اسکوٹ)	ہاکاری	پھ	تھ	ٹھ	چھ	کھ	
	مسموع	ب	د	ڈ	ج	گ	
	ہاکاری	بھ	دھ	ڈھ	جھ	گھ	
انفی (ناک کی)	مسموع	م	ن				
چستانی (رگڑ والو)	غیر مسموع	ف	س		ش	خ	
یا صفیری	مسموع	و	ز			غ	
تالیکا	مسموع		ر				
پہلوئی	مسموع		ل				
تھپک دار	مسموع			ڑ			
	مسموع (ہا کار)			ڑھ			
نیم مصوتہ					ی		

اس طرح اردو کے کل مصمتے 37 ہوتے ہیں (مقابلہ کیجیے تعداد حروف سے) ان میں (ژ) سے مرکب الفاظ اس قدر کم ہیں کہ اس کا اخراج کیا جا سکتا ہے صرف چند لفظ میں۔ اژدھام۔ اژدہا۔ جن کی دوسری شکل ازدحام، ازدہا بھی رائج ہے۔

(لیکن مژہ اور مژگان کا کیا کیجیے گا؟ خاص طور سے غالبؔ کی ''مژہ ہائے دراز'' کا۔ صرف ایک لفظ کی خاطر اسے آپ اردو صوتیات میں رکھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔)

یہاں میں اردو رسم خط کی کم مائگی کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یعنی ہاکار (ہائے مخلوط والی) آوازوں کی جانب۔ یہ آوازیں اپنی وسعت اور تقسیم کے باعث اردو کے نظامِ صوت کی مفرد آوازیں ہیں۔ ہندی رسم خط میں ان کے لیے علاحدہ حروف بھی قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن اردو، حروف تہجی میں یہ مرکب آوازیں تصور کی گئی ہیں۔ اور اسی بنا پر اردو، تدریس کا یہ انداز ہنوز جاری ہے کہ گ۔ ھ۔ ر۔ زبر گھر۔ ب ھ ر زبر بھر جو صوتی نقطۂ نظر سے مہمل ہے کہ مبنی ہے حرف کے تصور پر۔

مصمتوں کے سلسلے میں ان زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروفِ تہجی اور نظام درس کے لیے پیر تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد، ذ۔ض۔ظ۔ط۔ث۔ص۔ح وغیرہ سے ہے۔

صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔ رح رکی شکل ذرا مختلف ہے۔ ہر چند یہ قریب المخرج مصوتے میں ضم ہو جاتا ہے لیکن بعض جگہ ایک صوتی کھٹک بن کر اپنے اثرات ہمارے لہجے میں چھوڑ جاتا ہے عام طور پر

معلوم کو مالوم

عرب کو ارب

منع کو منا

ہی بولا جاتا ہے (قطع نظر چند عربی دانوں کے) لیکن اس قسم کے مقامات پر دوسری صوت پائی جاتی ہے۔ مثلاً شعرا (مسیح) موعود جہاں رع را ایک مخصوص اعراب کی شکل میں قائم رہتا ہے۔

عربی فارسی کے مصوتے جو اردو کے صوتیاتی نظام کا جز و بن گئے ہیں حسب ذیل ہیں۔ ف۔ز۔خ۔غ۔ق۔ رکو چھوڑ کر یہ بیشتر رگڑ دار آوازوں کی صف میں آتے ہیں۔ ان کا اثر اردو شاعری کے صوتی آہنگ پر کافی پڑا ہے۔ اور جو لوگ آہنگ شعر کے اصولوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک علاحدہ دلچسپ مسئلہ ہے۔

اردو کی انفی آوازیں اور ان کی خصوصیات:۔

Nasalization کے عمل کا اردو صوتیات میں حسب ذیل انداز میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

1۔ انفی مصمتے Nasal Consonants

2۔ انفی مصوتے Nasalized vowels

3۔ انفیاتی ہم آہنگی Homorganic Nasalization

1۔ اردو کے تمام مصوتے (Vowels) انفیائے جاسکتے ہیں۔ گولفظ کے اندر ہر مقام پر یہ ممکن نہیں۔

ڈاٹ ڈانٹ

باٹ بانٹ

ے میں

گئی گئیں

تھی تھیں

ضمنی اور غیر اہم انفیانے (Nasalization) کی مثالیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایسے الفاظ جن میں رم ریا رن کے پاس واقع مصوتے انفی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو کے بعض علاقوں بالخصوص دہلی اور اس کے اطراف میں اس کی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں۔ جن کا اثر ہمیں قدیم دکنی پر بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً

وہیں: کونچ کونچے: آنگے: (قدیم)

یا آنٹا: چانول: گھانس: جاناں (جدید)

یہ غیر ضروری انفیانا اردو میں ناشستہ تلفظ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اردو میں جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے Nasalisation معنی کی تبدیلی اور افعال کی تعداد و تجنیس کی وضاحت کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں تک انفی مصمتوں کا تعلق ہے، اردو، میں صرف دو مصمتے ہیں

/م/ اور /ن/

jkk(V) کی آواز اردو نے اپنے ارتقا کے کسی دور میں نہیں ئی۔ ہندی بولیوں
میں بھی یہ عام طور پر /ن/ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جدید ہندی میں بہت ، سنسکرت کے الفاظ
Clusters کی طرح اس کا بھی تعلیم کے ذریعے احیا ہو رہا ہے۔

/ن/ کی آواز جب کسی دوسرے مصمتے سے قبل واقع ہوتی ہے تو ہم آہنگ
Homorganic ہو جاتی ہے۔ جیسے:۔

ن/ب انبہ

ن/ت/د سنت : اندازہ

ن/ڈ/ٹ انڈا : انٹ

ن/ج/چ رنج : اِنچ

ن/گ رنگ : ڈنگ

لیکن جب یہ آواز عربی صوت /ق/ کے ساتھ واقع ہوتی ہے تو ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ مثلاً
انقلاب: انقباض: انقسام وغیرہ

/ک/ کی آواز کے ساتھ میں حسب ذیل مستثنیات مل جائیں گی

انکار : انکسار : انکشاف

دو لبی : کنبہ

/ن/ کا غیر آہنگ ہونا اس بات کی بھی دلیل ہوتا ہے کہ الفاظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہیں:
اَن مول۔ اَن میل۔ اَن پڑھ۔ اَن بن۔ آن کے : آن بان
لیکن اردو صوتیات کے عام رجحان کے تحت مرکب الفاظ تک میں /ن/ ہم آہنگ
ہو جاتا ہے۔

کنٹوپ (کن+ٹوپ): ان داتا (ان+داتا)

اردو کی کوزی آوازیں:۔

اردو میں کوزی یا معکوسی (Retroflex) آوازیں خالص ہندوستانی بلکہ آریائی بھی نہیں۔ بیشتر ڈراویڈی لسانی روایت کی دین ہیں۔ شاید اسی لیے یہ شمالی ہند کی آریائی زبانوں میں اس قدر نمایاں نہیں جتنی کہ ڈراویڈی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہندی کے برعکس سنسکرت کی بعض معکوسی آوازوں کو اردو نے اپنے ارتقا کے کسی دور میں قبول نہیں کیا: مثلاً

س

ष श ष

جو ہمیشہ اردو میں چھ ن اور ش ہو جاتے ہیں

اردو کی معکوسی آوازیں حسب ذیل ہیں

ٹ ٹھ

ڈ ڈھ

ڑ ڑھ

ان میں ڑ/ ڈ/ ڈھ/ ڑ/ ڑھ/ کی تقسیم اردو کے نظام صوت میں Supplementary انداز میں پائی جاتی ہے۔ جسے ایک جدول کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔

	لفظوں کی ابتدا میں	لفظوں کے درمیان میں	لفظ کے آخر میں
ڈ	✓	x	x
ڈھ	✓	✓	✓
ڈّ (مشدد)	x	✓	x
نڈ (انفی)	x	✓	✓
ڑ	x	✓	✓
ڑّ (مشدد)	x	x	x
ڑھ	x	✓	✓
نڑ (انفی)	x	x	✓

تجزیاتی مشاہدات:۔

1۔ ڈ کی آواز صرف لفظوں کے شروع میں آتی ہے۔ڈر۔ڈال۔ڈول۔آخر میں ہمیشہ نون غنہ کے ساتھ آتی ہے۔انگریزی کے مستعار لفظ مستثنیات میں سے ہیں مثلاً روڈ۔بورڈ۔کارڈ(1)

2۔ اردو، کا کوئی لفظ /ڑ/ یا /ڑھ/ سے شروع نہیں ہوتا

3۔ ڈھ کی آواز صرف الفاظ کی ابتدا میں پائی جاتی ہے۔یہ وسطی طور پر مشدد ہوتی ہے۔ ڈ کے ساتھ (مثلاً بڈھا) لفظ کے اختتام پر یہ /ڑھ/ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔مثلاً علی گڈھ پر علی گڑھ فصیح ہے۔

/ڑ/ اور /ڑھ/ کا باہمی ربط ذیل کی مثالوں سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے

بڈھا	یا	بوڑھا
گڈھا	یا	گڑھا
ٹھڈی	یا	ٹھوڑی

ڑ اور ر کا تعلق (فصاحت کے نقطۂ نظر سے)

پوری	پوڑی
کچوری	کچوڑی
کرور	کروڑ
ساری	ساڑھی
پھلواری	پھلواڑی

(1: ( ) کی علامت موجودگی کو ظاہر کرتی ہے اور X کی علامت غیر موجودگی کو ( ) چند دیسی لفظ جو اس اصول سے مستثنیٰ ہیں حسب ذیل ہیں

لاڈ اجڈ کھڈ

لاڈ کی دوسری معروف شکل لاڈ رائج ہے۔

اجڈ اور کھڈ پراکرت میں مشدد (اجڈ۔اور۔کھڈ) ہیں۔جو اردو میں۔غیر مشدد بنا لیے گئے ہیں۔)

مصمتوں کے خوشے:۔Consonantal Cluster

اردو کئی لحاظ سے آمیختہ زبان ہے۔لیکن اس کی صوتیات کے چو کھٹے میں مستعار الفاظ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ مروڑ کر درست کردی جاتی ہیں۔ یہ عمل سب سے زیادہ Clusters میں نظر آتا ہے۔اردو صوتیات کا عام رجحان Clusters کے خلاف ہے۔اتفاق سے عربی، فارسی، سنسکرت، اور انگریزی جن زبانوں سے اس نے اپنی لغت کا خزانہ بھرا ہے Clusters سے بھری پڑی ہیں۔ یہ Clusters عام طور پر الفاظ کے شروع میں آتے ہیں اور کبھی کبھی خاتمے پر بھی جب کہ خاتمے کے خوشے کا اردو، احترام کرتی ہے۔ لفظ کی ابتدا کے خوشے اس کے لیے نا قابلِ برداشت ہیں۔مثلاً

سنسکرت : برہمن : برہمن		ब्राह्मण
پراکرت : پراکرت		प्राकृत
پرجا : پرجا		प्रजा
انگریزی : اسپرٹ: سپرٹ		Spirit
انگریزی : اسٹیشن : سٹیشن		Station
اسکول : سکول		School
عربی صَدر : صدر		
بَدر : بدر		
غَدر : غدر		

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ چونکہ عربی کے بیشتر ایسے الفاظ میں کلسٹر لفظ کے اختتام پر آتا ہے اس لیے علمیت اور فصاحت یہی اشارہ کرتی رہتی ہے کہ غلط العام سے آگے بڑھ کر غلط العوام کی تہمت اپنے سر نہ لی جائے۔مثلاً

تخت نہ کہ تخَت
مفت نہ کہ مُفَت
ذکر نہ کہ ذِکَر

وقت نہ کہ وَقَت

بڑی دل چسپ بات یہ ہے کہ پنجاب اور یو پی کے مغربی اضلاع پر ایک رجحان عوامی بولیوں میں یہ بھی موجود ہے کہ جہاں کلسٹر نہ ہو وہاں بھی شاید علمیت دکھانے کے لیے پیدا کر دیا جائے۔ مثلاً:

غَلَط کا غَلْط

شَرَف کا شَرْف

غَرَض کا غَرْض

مَرَض کا مَرْض

مصمتوں کے خوشوں کے سلسلے میں یہ بنیادی مسئلہ بار بار ذہن میں اٹھتا ہے کہ آیا اردو، زبان کے ارتقا کے ان مدارج پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں ان کا بولنے والا یہ کہہ سکے کہ:

مُستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس سلسلے میں انشاء اللہ خان (صاحب دریائے لطافت) کا یہ قول نہایت اہم ہے کہ عربی، فارسی، الفاظ کی کسوٹی اردو کی صوتیات قرار پائے گی نہ کہ عربی، فارسی کی۔

مقدمہ

اردو زبان تشکیلی دور سے ارتقا کی اعلیٰ منزلوں تک ادیبوں اور شاعروں کی مرہونِ منت رہی ہے۔ اگر اسے ایک طرف صوفیوں اور درویشوں نے گلے لگایا تو دوسری طرف امراء و سلاطین نے اپنے ذوق وشوق کی پذیرائی بھی اسی زبان سے کی۔ اس ذوق وشوق ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اس زبان کی ادبی تاریخ میں بہت آگے تک نکل گئے ہیں۔ اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اسے زبان کی چار سو سالہ تاریخ میں اہل اردو کے شاندار کارنامے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کی ترقی میں اردو نے اچھا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن کسی بھی زبان میں ادب کی ترقی کوئی آخری منزل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے فروغ کے لیے ہماری نظر ماہر زبان (Linguist) پر پڑتی ہے۔ شاعر و ادیب، نقاد اور افسانہ نویس کا کام جہاں ادب کی خدمت کرنا ہے وہیں پر لنگوسٹ (Linguist) زبان کے فروغ و ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی بھی ادب کی ترقی سے پہلے زبان کی بنیادی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک زبان ترقی نہ کرے تب تک ہم ادب کی ترقی سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ زبان کے حال و ماضی سے متعلق گونا گوں قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بڑا طبقہ ادب کی ترقی کو

میں ہمزہ کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جب کہ اردو میں یہ مصمتہ
نہیں۔ اردو میں اس کی اپنی الگ سے ایسی کوئی آواز نہیں، جیسی
کسرہ یا فتح کی ہے، اس لیے اسے علامت بے صوت کہنا مناسب
ہوگا۔ بعض الفاظ میں عام لوگ تو کیا اردو کے اچھے اچھے ادیب
بھی اوپر ہمزہ اور نیچے دو نقطے بھی لگا دیتے ہیں۔ اردو میں اس کا
رواج اب غلط العام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ مضمون اردو
رسم الخط پر نہیں۔ ورنہ ہم اس موضوع پر اظہار خیال کرتے کہ اردو
میں ہمزہ کی علامت گردن زدنی ہے کہ نہیں۔ اس وقت جس بات
پر زور دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ حرف وصوت کے باہمی رشتے سے
بے توجہی کی جیسی مثالیں اردو میں ملتی ہیں کم زبانوں میں پائی
جاتی ہیں۔ اس میں عام پڑھنے والوں کا کیا قصور؟ جب خود
پڑھانے والوں کو خبر نہیں کہ جس علامت کو وہ استعمال کرتے ہیں،
اُسے کیوں استعمال کرتے ہیں۔"

اس بیان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا کہ لسانیات ہمزہ کے خلاف ہے۔ اور ایک صاحب نے تو "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں مفصل مضمون بھی لکھا، جیسا کہ ان سے توقع تھی۔ انھوں نے نہ تو لسانیات کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور نہ ہی موضوع سے پورا انصاف کیا۔ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ اعتراض اس پر نہیں تھا کہ ہمزہ اردو میں کیوں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ اعتراض اس پر تھا کہ اردو لکھنے والوں پر حرف وصوت کا رشتہ پوری طرح واضح نہیں۔ اس لیے ہمزہ کا استعمال کئی لفظوں میں غلط ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہمزہ کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ صوتیات کی مدد سے ہمزہ کا صحیح منصب معلوم کیا جائے اور اردو رسم الخط کی سطح پر اس کے استعمال کے اصولوں اور حدود کا پتہ چلایا جائے۔ اس کے بعد یہ نتیجہ خود بخود یہی نکالا جا سکتا ہے کہ ہمزہ کو اردو رسم الخط میں باقی رکھنا چاہیے یا نہیں۔

1.1 ۔ سب سے پہلے ان چند الفاظ کو دیکھیے:

جاؤں، کھاؤ، آئیں، پائے، آشنائی، ہیئت، غائب۔

اب انھیں تلفظ کے اعتبار سے صوتیاتی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

/ā:šnā:ī/ /pā+e/ /ā+ẽ/ /khā+o/ /jā+ū/

/gā+ēb/ /hai+at/

ان الفاظ میں جہاں جہاں بھی اردو رسم الخط میں ہمزہ آیا ہے، صوتیاتی رسم الخط میں میں نے اسے جمع کے نشان سے ظاہر کیا ہے۔ اب ان الفاظ میں جن دو آوازوں۔(1) کے درمیان جمع کا نشان ہے، انھیں بالترتیب لکھا جاتا ہے:

/ā+ī/ /ā+e/ /ā+ẽ/ /ā+o/ /ā+ū/[1]

/ā+ε/ /ai+a/

1.2۔ان چند الفاظ کے اس تجزیے کی روشنی میں، ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

1۔ اردو میں ہمزہ محض دو ساتھ ساتھ آنے والے مصوتوں (Conjunct vowels) کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ الگ سے لکھے ہوئے دو دو مصوتوں کے جوڑ سے ثابت ہوتا ہے۔

2۔ اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ مثلاً جاؤں میں پہلے مصوتے / ā / کے لیے الف اور دوسرے مصوتے ū کے لیے واؤ موجود ہے۔ اسی طرح کھاؤ میں /ā / کے لیے الف اور /o / کے لیے واؤ، آئیں اور پائے میں طرح کھاؤ میں /ā / کے لیے الف اور /e / کے لیے یائے مجہول، اور آشنائی میں /ā / کے لیے الف اور /I / کے لیے یائے معروف موجود ہے۔ جب ہر جگہ مصوتوں کے لیے اپنی علامتیں موجود ہیں تو ہمزہ کی آواز کیا ہوئی؟ چنانچہ ثابت ہے کہ ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں بلکہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے۔ یعنی یہ علامت بے صوت تو ہے لیکن بے مصرف علامت نہیں۔ اردو میں اسے املائی سہولت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ الف کے بعد واؤ یا یے کی آوازیں بغیر

1۔ یہ مضمون چونکہ عام پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا ہے اس میں جزواں اور غیر جزواں مصوتوں کا سوال عمداً نہیں اٹھایا گیا۔

ہمزہ کے ادا ہو ہی نہیں سکتیں۔ البتہ آخری دو لفظوں یعنی ہیئت اور غائب سے شبہ ہو سکتا ہے کہ ان میں ہمزہ کی اپنی آواز ہے ہیئت میں پہلا مصوتہ /ai/ یعنی یائے لین ہے اور دوسرے یعنی /a/ کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں، اسی طرح غائب میں پہلا مصوتہ /$\bar{\alpha}$/ یعنی الف ہے اور دوسرے یعنی /e/ کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں تو کیا ان لفظوں میں ہمزہ بالترتیب /a/ اور (e) دونوں چھوٹے مصوتے ہیں اور اردو میں رواج ہے کہ چھوٹے مصوتوں کی علامتیں یعنی فتح، کسرہ وغیرہ اکثر لگائی ہی نہیں جاتیں یہی حال ان دونوں الفاظ کا ہے۔ ہیئت دراصل ہیئت ہے اور غائب دراصل غائب ہے یعنی ہیئت میں جہاں /a/ ہے وہاں دراصل ہمزہ پر فتح ہے اور غائب میں جہاں (e) ہے وہاں ہمزہ کے نیچے کسرہ ہے۔ لیکن چونکہ اردو میں /a/ اور /e/ بالترتیب فتح اور کسرہ کی آوازیں ہیں۔ اس لیے ہمزہ تو پہلے پانچ الفاظ کی طرح ان دو الفاظ میں بھی محض دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان ہے، آوازیں حسب سابق دوسری علامتوں کی ہیں۔ اردو میں ہمزہ کی اپنی کوئی منفرد آواز نہیں۔

3۔ بخلاف عربی زبان کے اردو میں ہمزہ مصمتہ کا درجہ نہیں رکھتا (صرف ایک مستعار لفظ میں یہ حلقی بندشی آواز (Glottal catch) کے مشابہ سے بولا جاتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

4۔ ہمزہ دیسی اور مستعار (Loan) دونوں طرح کے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے اوپر کی مثالوں میں پہلے چار لفظ دیسی ہیں اور آخری تین مستعار

1.3۔ دیسی الفاظ:۔

یہ جان لینے کے بعد کہ ہمزہ کو ہم دیسی الفاظ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو نے ہمزہ کو اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا لیا ہے یعنی ہم نے ہمزہ کی بقول برج موہن دتاتریہ کیفی، ''تارید'' کر لی ہے۔ عربی میں ہمزہ مصمتہ ہے۔ ہمارے ہاں یہ مصمتہ نہیں، بلکہ اس کی مصوتوں سے الگ سے اپنی کوئی آواز بھی نہیں اور یہ صرف دو مصوتوں کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ املائی سہولت کی چیز ہے۔

2.1۔ اس تمہید کے بعد اب ہم پہلے دیسی الفاظ کو لیں گے۔ جن دیسی الفاظ میں ہمزہ کا استعمال ہوتا ہے۔ ان میں نظر سب سے پہلے افعال پر پڑتی ہے۔ ان کی کئی تصریفی صورتوں کو اردو

میں ہمزہ کے بغیر لکھنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھیے

جانا سے جاؤں، جائیں، جاؤ، جائے

کھانا سے کھاؤں، کھائیں، کھاؤ، کھائے

آنا سے آؤں، آئیں، آؤ، آئے۔

علیٰ ہذا القیاس

جانا کی ماضی واحد مذکر، ''گیا'' ہے۔ لیکن اس کی جمع مذکر ''گئے'' واحد مونث ''گئی'' اور جمع مونث ''گئیں'' تینوں کو ہمزہ سے لکھا جاتا ہے۔ گیا میں نیم مصوتہ ری/ y /ر سے پہلے زبر ہے اور بعد میں الف، اس صوتی ماحول میں تو نیم مصوتہ اپنی آواز کو برقرار رکھتا ہے، جبکہ ی/ آ/، اور ے / e / سے پہلے یہ اُن میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہی حال کھانا، آنا وغیرہ دوسرے افعال کا ہے۔ ان کی ماضی واحد مذکر تو ی/ y / ہی سے لکھی جاتی ہے لیکن ان کی تصریفی صورتیں یعنی کھائی، کھائیں، کھائے، آئی، آئیں، آئے ہمزہ سے لکھی جاتی ہیں۔

2.2۔ اوپر ہم نے جانا، کھانا، آنا جن مصادر کو لیا۔ ان میں مادۂ فعل یعنی جا، کھا، آ، الف پر ختم ہوتا ہے۔ اب ان افعال کو لیجیے جن کے مادۂ فعل واؤ پر ختم ہوتے ہیں مثلاً سونا، رونا، دھونا، ہمزہ کے استعمال کے سلسلے میں یہ افعال بھی الف پر ختم ہونے والے افعال کی شق میں رکھے جا سکتے ہیں اور ان کی تصریفی صورتوں میں بھی ہمزہ اسی طرح آتا ہے جس طرح جانا، کھانا، آنا میں مثلاً سوؤں، سوئیں، سوؤ، سوئے، سویا، سوئی، سوئیں وغیرہ (البتہ ہونا کی ماضی ہوا اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔[1] اردو میں واؤ اور الف کے جوڑ پر ہمزہ نہیں لگتا، یعنی ہوٴا میں ہمزہ استعمالِ عام کے خلاف ہے، باقی ہوئی، ہوئیں، ہوئے سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں)

<u>2.3۔ یائے معروف اور مجہول پر ختم ہونے والے افعال کا معاملہ برعکس ہے ان کی تصریفی</u>

---

[1] برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب منشورات میں ہوا کو جگہ جگہ ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے (بعض اور حضرات کے ہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں) شاید اول تو اس لیے کہ ہوا (بہ معنی باد) سے التباس نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ہوئے، ہوئی، ہوئیں سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں اور غالباً وجدانی طور پر یہ احساس کام کرتا ہے کہ جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں گے انھیں ہمزہ سے ظاہر کیا جائے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہوا میں چلن اس کے خلاف ہے۔

صورتوں میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہوتا: اس لیے کہ ان میں جہاں جہاں نیم مصوتہ ی آیا ہے۔ اس سے پہلے رنا ریعنی کسرہ ہے اور اس صوتی ماحول میں نیم مصوتہ / y / اپنی آواز برقرار رکھتا ہے چنانچہ ان الفاظ کا صحیح املا نیم مصوتہ ی / Y / سے ہے مثلاً:

(یائے معروف) پینا سے پیوں، پییں، پیو، پیے، پیا۔

اسی طرح جینا، سینا وغیرہ

کرنا سے کیا، کیئے۔

(یائے مجہول) لینا سے لیا، لیجیے۔ علیٰ ہذا القیاس

2.4۔ اسی طرح وہ تمام افعال جن کے مادۂ فعل مصمتہ پر ختم ہوں، مثلاً بیٹھ، لکھ، سُن، دیکھ، ان کی محولہ بالا تصریفی صورتوں میں ہمزہ کے استعمال کا محل نہیں، اس لیے کہ ان میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

3.1۔ ہمزہ کا استعمال امر میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جمع مخاطب جاؤ، کھاؤ، آؤ، لیکن املا کی گڑبڑ دراصل امر تعظیمی کی صورتوں میں ہوتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ امر تعظیمی کے لیے مادۂ فعل کے بعد !یے / iye / بڑھا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: اُٹھ / uth) جمع / iye) بنا / uthiye /، اس میں دو مصوتوں کا جوڑ سرے سے ہے ہی نہیں تو پھر اس میں ہمزہ کا استعمال کیا معنی؟

چنانچہ اُٹھ سے اُٹھئے غلط ہے اور اُٹھیے صحیح ہے۔ اسی طرح

بیٹھ "	بیٹھئے "	"	بیٹھیے "	"
لکھ "	لکھئے "	"	لکھیے "	"
سُن "	سنئے "	"	سُنیے "	"

چاہنا چاہئے چاہیے (جمع چاہییں) صحیح ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

3.2۔ اب اُن افعال کے امر تعظیمی کو لیجیے جو مصمتوں پر نہیں بلکہ مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں

(الف) آنا، جانا، فرمانا وغیرہ۔ آ / ā / جمع !یے / iye / بنا۔ آیئے / ā+iye / واضح

رہے کہ یہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔ اس لیے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے۔ یعنی آیئے، جایئے، فرمایئے میں ہمزہ لکھا جائے گا۔

(واؤ) سونا، رونا، دھونا، وغیرہ۔ سو/so/جمع اِیے/iye) بنا۔ سویے/so+iye)
پہلی مد کی طرح یہاں بھی دو مصوتے ساتھ ساتھ آرہے ہیں۔ اس لیے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے۔ یعنی سوئیے، دھوئیے وغیرہ۔

(یائے معروف اور مجہول) پینا، سینا، لینا، دینا، کرنا (مادہ کر کے علاوہ کی) قاعدہ ہے کہ ی (i) ریا ے/e/پر ختم ہونے والے مادوں کے ساتھ اِیے/iye/نہیں ملایا جاسکتا اور ان کے بیچ میں تلفظ کی سہولت کے لیے ج/j/بڑھا دیا جاتا ہے یعنی پینا سے پی/pi/ + جیے/jiye/، بنا پیجیے/pijiye/، اسی طرح سیجیے/sijiye/، لیجیے/lijiye/، دیجیے/dijiye/کیجیے/kijiye/۔
ظاہر ہے کہ ان تمام الفاظ میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں ہے۔ اس لیے ان میں ہمزہ کا استعمال غلط ہے یعنی انھیں پیجے، سیجے، لیجے، دیجیے، کیجیے لکھنا چاہیے۔ اردو میں ہمزہ کے استعمال میں سب سے زیادہ بے احتیاطی امر تعظیمی کی انھیں مندرجہ بالا صورتوں میں برتی جاتی ہے۔

4۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ دیسی الفاظ میں صرف افعال میں ہمزہ استعمال ہوتا ہے، اسما اور اسمائے صفت میں بھی جہاں تلفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں گے۔ اس لفظ کو ہمزہ سے لکھا جائے گا۔ مثلاً لکھنؤ، کیکئی، بہرائچ، نیا سے نئی، نائی، بھائی، گہرائی، لمبائی، وغیرہ۔

5۔ مستعار الفاظ: ہمزہ سے لکھے جانے والے وہ الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہیں اُن میں اچھی خاصی تعداد ان الفاظ کی ہے جن کے آخر میں یائے معروف ہے اور جن کے آخری صوتی رکن سے پہلے الف ہے، یعنی جن میں/ ā / اور/ ī/ دو مصوتوں کا جوڑ ہے، مثلاً (اسما) آشنائی، رسوائی، گیرائی، رونمائی، شنوائی، شکیبائی، کج ادائی، حلوائی، خودستائی، خودنمائی، سرخروئی، رعنائی، دانائی، دلجوئی، نغمہ سرائی، رضائی، دائی، یکجائی، یکتائی، شیدائی، خدائی، پذیرائی، بینائی، بے وفائی، بے نوائی، بے حیائی، شناسائی وغیرہ۔

(اسمائے صفت، آبائی، سودائی، گرمائی، سرمائی، انتہائی، صحرائی، تماشائی، حنائی وغیرہ:
باقی الفاظ میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے اور ہمزہ سے لکھے جانے والے الفاظ کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔

(الف کے بعد ابتدائی) آئین۔ آئندہ۔ آئینہ، آئمہ۔

(عین سے پہلے آخری) صنائع، بدائع، صنائع، وقائع، ذرائع (وسطی) شائستگی پائیدار، جزائر، شرائط، حقائق، جائز، عائد، مسائل، ہیئت، تائید، پائجامہ، طاؤس، طوائف، زائد، جائیداد، جرائد، رائیگاں، جرائم، طائر، غائب، فائدہ، زائچہ، دائرہ، ذائقہ، تائب، خائف، انشائیہ، فائق، فضائل، عقائد، قبائل، قائل، قصائد، قائم، کائنات، مطمئن، ماؤف، کوائف، نائب، صائب، دائر، وظائف، عجائب، مؤنث، مؤرخ، متأثر، مؤلف، مؤثر۔

فارسی حاصل مصدر آزمائش، فرمائش، ستائش، آرائش، کو اردو میں ہمزہ سے لکھنے کا رواج ہے۔ یہ الفاظ از روئے اصل ی سے ہیں لیکن اُردو میں ان کا تلفظ نیم مصوتہ ی سے نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے معاملے میں اصل کی نہیں بلکہ استعمال کی پیروی کرنی چاہیے۔ یوں بھی اُردو میں قاعدہ ہے کہ نیم مصوتہ ی صرف اس حالت میں اپنی آواز کو برقرار رکھتا ہے جب اس سے پہلے کسرہ ہو (مثلاً کیے، لیے، دیے، چاہیے، لکھیے، ملاحظہ ہو پیراگراف 2.3) جبکہ مندرجہ بالا الفاظ میں ایسا نہیں ہے۔ ان میں الف کے بعد وہی آواز نکل رہی ہے جو غائب، تائب، نائب، وغیرہ میں ہے۔

5.1۔ ان تمام الفاظ میں جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں، ان کے بیچ میں ہمزہ لگتا ہے۔ البتہ مسئلہ اور جرأت اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ جرأت میں ہمزہ صرف ایک مصوتے کے لیے آتا ہے، مسئلہ میں ہمزہ بجائے خود صوتی رکن ہے۔ میری نظر میں یہ اردو میں استعمال ہونے والا واحد مستعار لفظ ہے جس میں ہمزہ الگ سے صوتی رکن ہونے کی وجہ سے حلقی بندشی کھٹک (Glottal catch) کے شائبے کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔ یعنی مسئلہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔[1]

---

[1] اس لفظ کا عوامی تلفظ مسلہ ہے جس پر جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی صاد فرمایا۔ لیکن دہلی کے تعلیم یافتہ طبقے کی محتاط بول چال میں میں نے اس لفظ کو اکثر خفیف سی حلقی بندش یعنی صوتی کھٹک کے ساتھ سنا ہے۔

لیکن اس سے اردو کے عام صوتیاتی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

5.2۔ مفرد الفاظ میں وسطی حالت میں ہمزہ کثر فتح کے ساتھ (مثلاً مؤنث، مؤثر، متأثر، مؤرخ، مؤلف، ہیئت) اور اکثر کسرہ کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً غائب، جائز، فائدہ، کائنات، آئندہ، عجائب، جرائد، رائگاں، وظائف، حقائق، زائد، صائب، تائب وغیرہ۔ فتح کی آواز تو وہی (a) کی رہتی ہے جیسے چَل، پَل، کَل میں، لیکن کسرہ کا امالہ ہو جاتا ہے اور ان تمام الفاظ میں کسرہ بہ طور (L) یعنی دِل، بِل، سِل کی درمیانی آواز کی طرح نہیں بلکہ نسبتہً منہ کو کچھ کھول کر ادا ہونے والی آواز (e) کی طرح بولا جاتا ہے۔

6۔ ہمزہ کا قاعدہ ہے کہ اگر یہ صوتی رکن کے آخر میں آتا ہے تو یہ یا تو واؤ پر لکھا جاتا ہے (جاؤ، کھاؤ،) یا ے پر لگایا جاتا ہے (آئے، جائے) اور یا ی پر لکھا جاتا ہے (آئی، پائی، حنائی، شناسائی) آخری دونوں صورتوں میں عمودی شوشے کا استعمال ہوتا ہے۔ واؤ پر لگنے والا ہمزہ خواہ وہ لفظ کے بیچ میں ہو، خواہ آخر میں ہمیشہ اپنی حالت میں برقرار رہتا ہے۔ الف اور واؤ کے بعد آنے والا ہمزہ بعض لفظوں میں شوشے کے ساتھ اور بعض میں اس کے بغیر لکھا جاتا ہے (آئیں، جائیں، جرائم، جائز، جرائد، روئیں، مؤنث، مورخ، متاثر، مؤلف)

7۔ اضافت: ہمزہ کے استعمال میں بے احتیاطی کی بعض مثالیں اضافت کی ذیل میں آتی ہیں۔ چنانچہ اضافت کے اصول مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

7.1۔ اگر مضاف ہائے مختفی پر ختم ہو تو اضافت ہمزہ سے لکھی جائے گی۔ مثلاً جذبۂ دل، آلۂ کار، نالۂ دل، پایۂ تخت، بازیچۂ اطفال، تزکیۂ نفس، سانحۂ دردناک، مایۂ ناز چشمۂ آب، خانۂ خدا، واقعۂ شب، منارۂ عظمت، گفتۂ غالب، غمزۂ دلربا، بادۂ ناب، شبہۂ جائز، غصۂ غم، دائرۂ کار، سنۂ اشاعت۔[1]

7.2۔ اگر مضاف کے آخر میں ح آئے یا آخری ہ سے پہلے طویل مصوتہ ہو یا ہ کی آواز تلفظ میں سنائی دیتی ہے تو اضافت زیر سے ظاہر کی جائے گی۔ مثلاً وجوہ غدر، شبیہ غالب، توجیہِ نادر، ماہِ

[1] سن اشاعت غلط ترکیب ہے کیونکہ سن بمعنی عمر ہے۔

برس چودہ یا کہ پندرہ کا سن　　　جوانی کی راتیں مرادوں کے دن　نیز سن تمیز۔ کم سن

نو، نگاہِ ناز، شبہِ حسن، کوہ سلیمان، صبحِ وطن، فتحِ شام، وجہِ جواز، تہِ دل

7.3۔ اگر مضاف اُردو میں الف یا واؤ پر ختم ہو تو اضافت یائے مجہول سے لکھی جائے گی۔ مثلاً صلائے عام، اردوئے معلّٰی، دریائے غم، اجزائے ترکیبی، روئے سخن، دعائے مغفرت، صدائے دل، نوائے ادب، دانائے راز، دنیائے اردو، ایفائے وعدہ، بازوئے قاتل، بوئے گل، بقائے دوام، سوئے وطن، خلفائے اسلام، مقتضائے حال۔

7.4۔ اگر مضاف یائے معروف پر ختم ہو تو اضافت کسرہ سے ظاہر کی جائے گی۔ مثلاً تنگ ظرفیِ منصور، والیِ ریاست، رعنائیِ خیال، یکتائیِ معشوق (رعنائی اور یکتائی، میں ہمزہ اصل لفظ کا حصہ ہے، اضافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں)

7.5۔ اگر مضاف یائے مجہول مابعد الف پر ختم ہو تو اضافت کے لیے نہ ہمزہ لگے گا نہ کسرہ۔ اس لیے کہ اضافت کی آواز اور یائے مجہول کی آواز تقریباً ایک ہے اور دونوں کا انضمام ہو جاتا ہے۔ اُردو میں ایسے الفاظ کی تعداد زیادہ نہیں: تنگ نائے غزل، آبنائے بلوچستان، رائے عالی (لفظ ''رائ'' کی اردو میں تارید ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو، رائے چندرائے بھولا ناتھ، رائے صاحب فلاں) وہ الفاظ جن میں یائے مجہول الف کے بعد نہ ہو بلکہ ماقبل مفتوح ہو، مثلاً پَے، مَے، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کی آخری آواز (/ai/ اور اضافت کی /e/ میں انضمام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے الفاظ کو کسرہ سے مضاف کرنا چاہیے۔ پےِ مغفرت۔ مےِ ہوش ربا، شَےِ لطیف

-

7.6۔ اگر مضاف ہ کے علاوہ کسی بھی مصمتے پر ختم ہو تو اضافت ہمیشہ کسرہ سے لکھی جائے گی، مثلاً وصلِ منہ نگار، رخِ آئینہ، بقدرِ شوق، آئینِ نو، محبانِ اُردو، کارِ جواں مرداں، جانِ ناتواں، حسنِ توبہ شکن، دلِ دردمند، رخِ زیبا، دردِ دل، وغیرہ، اسی طرح شمعِ وفا، رفعِ شر۔

7.7۔ اضافت سے متعلق مندرجہ بالا تمام اصولوں کو تشکیلی لسانیات کے ایک چھوٹے سے قانون میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے۔
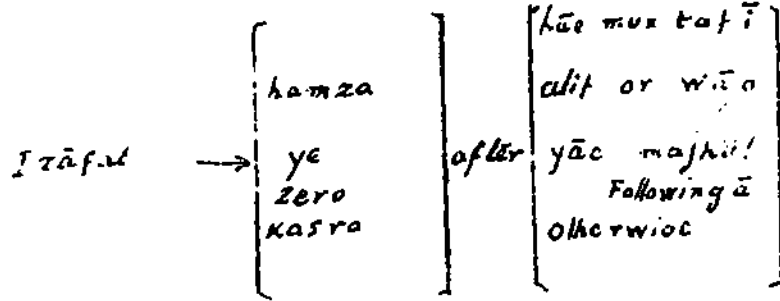
ایسے مختصر اور جامع قوانین کو زبان کے مباحث میں استعمال کرنے کی راہ چامسکی نے اپنی تشکیلی گرامر میں دکھائی ہے۔ان پر علامتی منطق اور الجبرا کا اثر ظاہر ہے۔ یہاں تیر کے نشان کے معنی، میں rewrite یعنی دوبارہ لکھو۔اس کے بعد کھڑی لکیروں کی دو مستطیلیں ہیں۔ کھڑی لکیروں کا مطلب ہے کہ ان میں سے بہ یک وقت صرف ایک چیز لی جائے، اور ایک مستطیل سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کے ساتھ مقابل کی مستطیل سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کے ساتھ مقابل کی مستطیل سے اسی نمبر شمار کی چیز لینی ہوگی۔ مندرجہ بالا قانون لفظ اضافت سے شروع ہوتا ہے یعنی اضافت ایک ذہنی تصور (abstration) ہے۔ ابھی ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے۔ اب دونوں مستطیلوں سے پہلی چیز کو لیجیے تو اس کا مطلب ہوا کہ اضافت لکھی جائے گی۔ ہمزہ سے اگر وہ بعد میں آئے ہائے مختفی کے۔ یعنی اگر مصناف ختم ہو ہائے مختفی پر۔ اسی طرح اضافت لکھی جائے گی یائے سے اگر مصناف ختم ہو الف یا واؤ پر، اضافت لکھی جائے گی صفر سے یعنی کسی چیز سے ظاہر نہ کی جائے گی۔ اگر مصنافات ختم ہو یائے مجہول مابعد الف پر، اور اضافت لکھی جائے گی کسرہ سے دیگر تمام حالتوں میں۔

7.8۔ شمع، رفع، دفع، نفع الفاظ اگرچہ ساکن الآخر ہیں، لیکن اردو کی عام بول چال میں انھیں چھوٹے مصوتے /a/ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ مصناف حالت میں یہ /a/ تلفظ میں ساکت ہو جاتا ہے اور اضافت کا /e/ باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ الفاظ جو آخری /e/ سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً وقائع، صنائع، ذرائع، وغیرہ۔ ان میں مضاف حالت میں اصل لفظ کی /e/ کے بعد اضافت کی /e/ مزید آتی ہے اور پہلی /e/ میں ضم ہو کر الگ سے اپنا وجود کھو دیتی ہے یعنی وقائع نعمت خانِ عالی میں وقائع کو مضاف تو کسرہ سے کیا جائے گا۔ لیکن وقائع کی آخری /e/ اور

اضافت کی /e/ کا انضمام ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ یہ اصول بنیادی زبان کے ہیں۔ شاعری میں عروضی ضرورتوں کی وجہ سے مصوتوں کی طوالت کو گھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمزہ کا استعمال یا اضافت کو ظاہر کرنے کے اصولوں میں حسب موقع تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مصرعوں میں بازو اور گیسو کی اضافت کو بجائے ے کے کسرہ سے ظاہر کرنا زیادہ مناسب ہوگا:

ع شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا
گیسوِ تاب دار کو اور بھی تاب دار کر

8۔ نتائج: اوپر کی بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں، مختصراً وہ یوں ہیں:

1۔ ہمزہ کے معاملے میں بنیادی چیز تلفظ ہے۔ اگر کسی لفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں (رسائل، تائب، عجائب، فائدے، کھائے، آؤ، گئے، فرمایئے، اُٹھایئے، آیئے، جایئے) تو اُسے ہمزہ سے لکھنا چاہیے۔ ورنہ نہیں (ہونا کی ماضی ہوا اس کلیے سے مستثنیٰ ہے) یہ بھی واضح رہے کہ اردو میں دو مصوتوں کا جوڑ جہاں عین سے آتا ہے وہاں ہمزہ استعمال نہیں ہوتا۔

2۔ جن الفاظ میں مصوتے اور نیم مصوتے ی کا جوڑ ہے، وہ ہمزہ سے نہیں لکھنے چاہئیں (دیے، لیجیے، دیے، پیے، جیجیے، دیکھیے، سُنیے، چاہیے، کیے، کیجیے، دیجیے،)

3۔ اضافت کے لیے ہمزہ صرف ان الفاظ پر لگتا ہے جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں (جذبۂ دل، نالۂ درد،) جہاں وہ تلفظ میں ادا ہوتی ہو وہاں اضافت کسر سے لکھی جاتی ہے (تہِ دل، وجہِ جواز، ماہِ نو)

4۔ عربی الفاظ طلباء، انشاء، منشاء، امراء، وزراء، فقراء، اردو میں صرف آخری الف سے بولے جاتے ہیں یعنی ان میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں۔ اس لیے انھیں ہمزہ سے لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اگر پوری ترکیب عربی کی ہے تو وہاں ہمزہ کو برقرار رکھنا چاہیے۔ مثلاً انشاء اللہ، منشاء الرحمٰن، ذکاء اللہ یہی حال سوٗ اتفاق، سوٗظن وغیرہ ترکیبوں کا ہے۔ لفظ سوٗ اردو میں مفرد استعمال نہیں ہوتا اور یہ تراکیب جوں کی توں مستعار لی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں ہمزہ کا استعمال جائز و درست ہے)

5۔ اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ البتہ اردو کے مستعار الفاظ میں لفظ مسئلہ کے تلفظ حلقی بندشی آواز (Glottal catch) کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اردو میں جہاں عین کو حلقی کھٹک سے بولتے ہیں۔ وہاں اس کی آواز بھی یہی ہوتی ہے۔ (عین کے تلفظ پر تفصیلی بحث آئندہ کبھی کی جائے گی)

6۔ ہمزہ کو اردو نے اپنی ضرورتوں کے لیے اپنالیا ہے۔ یہ علامت بے صوت ضرور ہے لیکن بے مصرف نہیں اور اردو املا کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ہمزہ دیسی اور مستعار دونوں طرح کے الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور چونکہ دیسی الفاظ خصوصاً افعال کی تصریفی صورتوں کا استعمال مستعار الفاظ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہمزہ کی پوری پوری تارید ہو چکی ہے۔

7۔ اردو نے عربی، فارسی اور پراکرتوں سے بہت کچھ لیا ہے، لیکن اب اس کی حیثیت ایک آزاد زبان کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا تجزیہ خود اس کی سطح پر آزادانہ کیا جائے۔ زیرِ نظر مقالے کی نوعیت اجتہادی نہیں، اشتہاری ہے۔ اس میں روایت سے خواہ مخواہ انحراف نہیں کیا گیا۔ بلکہ اردو زبان کی سطح پر آزادانہ ہمزہ کے استعمال کا تجزیہ کر کے اس کے صحیح املا کے اصول معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدمانے ہمزہ کو اردو کی ضرورتوں کے لیے اپنایا تو وہ بلاضرورت نہیں تھا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی اصول (وجدانی طور پر ہی سہی) ان کے پیشِ نظر ضرور رہا ہوگا۔ زیرِ نظر مقالے میں اسی اصول کو صوتی سطح پر دریافت کر کے ہمزہ کے استعمال کے قاعدے سائنسی وضاحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحیح املا کے لیے اس صوتی اصول کو سمجھنا اور ان قاعدوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔[1]

---

[1] اس مقالے کی تیاری میں کئی موقعوں پر میں نے اپنے کرم فرما جناب مالک رام صاحب اور جناب رشید حسن خاں صاحب اور مجھی عتیق احمد صدیقی سے تبادلۂ خیال کیا جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اردو میں دخیل آوازیں

اردو ایک مخلوط زبان ہے، اس کی تشکیل میں فارسی، عربی اور یہاں کی مقامی بولیوں کے ربط کو بڑا دخل ہے۔ زبانوں کا یہ ربط (Contact) بعد میں ثقافتی وتہذیبی ربط میں بھی نمودار ہوا۔ زبانوں کے سلسلے میں کبھی کبھی حالات نے نئی اور تیسری زبان کی تشکیل میں مدد دی ہے اور کبھی وہ دوسری زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن تیسری زبان بنانے سے قاصر رہے۔ بقول وائنریخ

"Some situations of language contact have been productive of new, third language while others have not"

علم الانسان کے بعض ماہرین نے زبانوں کے ربط یا اتصال کو تہذیبی یا ثقافتی اتصال ہی کی ایک صورت سے تعبیر کیا ہے۔ زبان اور ثقافت کو ایک دوسرے سے طاقت ملتی ہے۔ خود زبان تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی ابتدائی بلکہ بنیادی منزل ہے۔ لہٰذا زبان اور ثقافت اور ثقافت اور زبان کو الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

"Language contact is considered by some anthropologists but one aspect of cultural contact and language interferance as a fact of cultural diffusion and acculturation".1

1- Languoge in contact urial wignrchich page 104

1- Urial weignreich: Languages in contact page:51-Urial weignreich: Languages in contact page:5

''ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانوں میں اردو ، زبانوں کے اتصال اور اسی مناسبت سے دو تہذیبی قدروں کے اتصال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔اردو کے اسی مزاج کی وجہ سے سرتیج بہادر سپرد نے اسے ''مشترکہ ناقابلِ تقسیم ورثہ'' کے نام سے یاد کیا۔اور دیگر علما اسے ''ہندالمانی'' تہذیب کی خوبصورت اور نادر مثال سمجھتے ہیں۔اردو زبان کی تشکیل میں بیرونی زبانوں کے الفاظ ہی نے مدد نہیں کی۔ بلکہ ان الفاظ کے سہارے اصوات بھی درآئیں جو اردو کے صوتی نظام کا حصہ ہیں۔ اردو میں دخیل آوازوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1۔حروفِ علت یا مصوتے

2۔حروفِ صحیح یا مصمتے

عام طور سے ماہرین اردو زبان میں دس مصوتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

$\partial, a, i, i:u, u:e, o, ai, au$

گویہ اردو کے بنیادی مصوتے ہیں۔لیکن ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے جو مغربی تہذیب ہمارے یہاں درآئی اور یورپی تہذیب وثقافت کا ہمارے یہاں جو عمل دخل شروع ہوا،اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی انگریزی زبان ہے۔انگریزی زبان نے ہندوستانی ذہنوں پر مشرقی ومغربی علوم کے سارے دروازے کھول دیے انگریزوں کی آمد سے تہذیب وثقافت،علم و دانش اور سائنس وحکمت کی نئی روشنی یہاں پھیلنی شروع ہوئی۔اسی کے ساتھ انگریزی زبان وادب کی بدولت ہمارے ادب میں اور مقامی زبانوں میں خاموش تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ زبان کے اعتبار سے انگریزی نے دیسی زبانوں کو ایک ذخیرۂ الفاظ دیا اور مقامی باشندوں کی صوتی عادتوں پر بھی اثرانداز ہونے میں کامیاب ہوگئی۔مقامی زبانوں میں اردو سب سے زیادہ بے تکلف زبان ثابت ہوئی۔خود اس کی ابتدائی تشکیل بھی اردو کے اسی بے تکلفانہ مزاج کا اعلیٰ ثبوت ہے۔اس نے اپنی دوستی کے ہاتھ یہاں کی پراکرتی زبانوں کی طرف بھی بڑھائے اور جنوب کے واسطے سے دراوڑی بھاشاؤں کی طرف بھی۔اردو کی اس میل جول کی ادا نے اپنوں ہی کے دلوں کو مسخر نہیں کیا بلکہ بیگانوں کے ذہنوں کو بھی مسحور کرگئی۔ چنانچہ مقامی زبانوں میں نہایت

فراخ دلی کے ساتھ جنوب میں وہ مراٹھی اور گجراتی سے متاثر ہوتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ رفتار سے انھیں متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی بے شمار مثالیں قدیم اردو میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بیرونی ممالک اور ان کی زبانوں سے اردو کے پختہ اور اٹوٹ رشتے فارسی، عربی، پرتگیزی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے قائم ہیں، انھیں روابط کا نتیجہ ہے کہ اردو کے صوتی نظام میں مندرجہ بالا دس مصوتوں کے علاوہ اور مصوتے بھی ملتے ہیں جو براہ راست اردو کے انگریزی سے تعلق کا نتیجہ ہیں۔ انگریزی کے اثر سے اردو میں دخیل یہ مصوتے تین ہیں جو انگریزی کے اردو کے دخیل الفاظ میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں البتہ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ الفاظ جو اردو میں کسی بھی زبان سے شامل ہو گئے ہوں، انھیں اردو الفاظ ہی سمجھنا چاہیے اور اس لحاظ سے وہ آوازیں جو اردو میں ان دخیل الفاظ کی وساطت سے شامل ہو گئیں۔ وہ بھی اردو ہو جاتی ہیں۔[1] انگریزی کی یہ دخیل آوازیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔ مصوتے دخیل الفاظ ڈاکٹر dektar اور acktar ''اداکار'' میں پائے جاتے ہیں اور /e/ درمیانی حالت میں انگریزی لفظ bell بمعنی گھنٹی /bell/ میں پایا جاتا ہے۔ /bell/ بمعنی گھنٹی کا لفظ اردو میں عام طور سے بولا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اقلی جوڑا /bell/ ''گھنٹی'' اور /bell/ ''بیل'' (Creeper) کو پیش کیا جا سکتا ہے جن میں /وہ/ اور /e:/ تکمیلی بٹوارے میں ہیں۔

ان مصوتوں کی طرح اردو نے اپنی ہمسایہ ہندوستانی دراوڑی زبانوں سے مصمتہ /ر/ بھی اپنا لیا ہے جو اردو کے علاوہ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں میں بھی مستعمل ہے۔ اسی رگڑ الو (Flap) /ڑ/ سے اردو کے دیگر ہکار بندشی (Aspirated stop) آوازوں کی طرح رگڑ الو ہائیہ (Aspirated flap) /ڑھ/ بن گیا۔ گو اردو نے صوتی اعتبار سے یہاں کی مقامی

---

[1] یہاں Bemand blech کے مندرجہ ذیل خیال کی پیروی کی گئی ہے۔

"question souts treat loan words can have only one answer treat them as words" دیکھیے

اسٹڈیز ان کلوکیول جاپانیز مرتبہ مارٹن جوس 1957 صفحہ 239

زبانوں کے اثرات موقع بہ موقع قبول کیے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ دراوڑی زبانوں میں سے یا مہاراشٹری اب بھرنش کی نمائندہ زبان مراٹھی سے صوتی اثرات کے لحاظ سے اردو محفوظ دکھائی دیتی ہے۔

اردو زبان کی تشکیل میں اردو کے صوتی نظام کے تعین میں فارسی اور عربی کا جو حصہ ہے وہ بہت عام اور واضح طور پر لسانی اور تاریخی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہاں اس تاریخی بحث اور حالات کو جن کے تحت اردو نے جنم لیا۔ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ فارسی اور عربی کے واسطے سے جو آوازیں اردو کے نظام اصوات میں شامل ہوئیں۔ ان کا مطالعہ صوتی اعتبار سے بہت دلچسپ بھی ہے اور اردو کے ماہرین اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ میں اختلاف کا باعث بھی۔

اس سے پہلے کہ عربی و فارسی کے صوتی اثرات اردو پر دکھائے جائیں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لسانیات میں صوت اور حرف کے فرق کو واضح کیا جائے اور اسی طرح زبان میں بول چال کی مختلف منزلوں مثلاً (Idiolect)، (Dialect) اور (Language) کی وضاحت کرتے ہوئے عالموں کی زبان اور عام پڑھے لکھوں کی زبان وغیرہ کے فرق کو بھی واضح طور پر دکھایا جائے۔

زبان میں بول چال کی بنیادی منزل کو زبان کے فلسفیوں نے (''Idiolect'') کا نام دیا ہے۔ یعنی وہ زبان جو ایک فرد بولتا ہے یعنی ایک شخص کی اپنی زبان جو کو ''اردو'' ہے اور جسے ب، د، ج، بھی آسانی سے سمجھتے ہیں، ابلاغ کی قوت پر پوری طرح حاوی ہے۔ لیکن پھر بھی صوتی لحاظ سے ہر دوسرے شخص سے الگ ہے بہ الفاظ دیگر جو شخص جس انداز سے زبان بولتا ہے وہ اس کی اپنی زبان (Idiolect) ہوتی ہے۔

زبان میں دوسری منزل بولی (Dialect) کی ہوتی ہے جو ایک مخصوص علاقہ سے متعلق ہو کر رہ گئی ہو لیکن جسے عام طور سے زبان کا جاننے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہو، مثال کے طور پر دلّی اور لکھنؤ کی زبان، گجرات اور دکن کی بولی، بمبئی اور کلکتہ کی اردو وغیرہ۔ زبان کی ایک منزل وہ ہے جو اپنے مخصوص سماجی پس منظر میں بولی جاتی ہو۔ مثلاً کھیل کود کے میدان میں احباب کی

بے تکلف گفتگو میں، گھر میں بچوں اور بھائی بہنوں کے دوران گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان یا پروفیسروں کی وہ زبان جو طالب علموں کو پڑھاتے وقت یا کسی ادبی محفل میں بولی جائے گو یہ سارے درجے (levels) الگ الگ ہیں لیکن زبان ایک ہی ہوتی ہے جو سماجی حالات اور ضروریات کے پیش نظر ایک ہی شخص مختلف انداز سے بولتا ہے، زبان کی مندرجہ بالا قسم لسانی اصطلاح میں ''رجسٹر'' (Register) کہلاتی ہے۔[1] اور ان سب کا مجموعی لسانیاتی مطالعہ (Institutional linguistics) کا حصہ ہے جسے آپ (sociolinguistics) یا سماجی لسانیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

اصوات کے مطالعوں کے سلسلے میں حرف و صوت کے فرق کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ آواز، تقریر یا بول چال میں کم سے کم بے معنی اکائی (Unit) ہوتی ہے۔ اور حرف کا تعلق تحریر سے ہے۔ ہمارے بعض علما حرف و صوت کے اس بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یا اپنی بحثوں میں اس فرق کو بھول جاتے ہیں، نتیجتاً نہ صرف خود غلطیوں کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ اس سے شدید قسم کے ذاتی اختلافات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

اردو ادب میں عربی و فارسی کی دخیل آوازوں میں ع، ف، ق، غ، ث، ص، ض، ط، ظ، اور ح کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اصوات خاص طور سے عربی فارسی الفاظ کا جز و لاینفک ہیں اور ان لوگوں کی بول چال کی زبان میں راسخ ہیں جو اردو کو عربی اور فارسی صوتیات کے مطابق بولنا چاہتے ہیں اور جو خود عربی یا فارسی میں تربیت یافتہ ہونے کے علاوہ ان زبانوں میں اعلیٰ قابلیت رکھتے ہوئے ان آوازوں کو اپنی کم عمری سے ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہیں۔ اسے آپ چاہیں تو اس طرح سمجھ لیجیے کہ یہ آوازیں ایک محدود طبقے کی علمی زبان میں ادا ہوتی ہیں اور ادبی زبان کا جزو ہیں۔ مثلاً مولوی صاحب جو درس دیتے ہیں یا وعظ فرماتے ہیں تب صوتی و نحوی اعتبار سے مفرس و معرب اردو سنائی دیتی ہے۔ یا ان ادبی و سماجی تقریبوں میں سنائی دے گی جو ادبی یا مذہبی اعتبار سے منعقد کی جاتی ہیں۔ یا استاد اگر بہت کامیاب ہوا تو اپنی جماعت میں عربی

1- The linguistic sicences and language teaching by M.A. Halliday page 871-1

و فارسی کی آوازیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گا ورنہ عام طور سے بول چال کی زبان میں عام اردو والا خواہ وہ خواندہ ہی کیوں نہ ہو ع، غ، ق، ص، ض، ط، ظ اور ح کی آوازیں پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس کے اعضائے نطق اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتے کہ وہ ان آوازوں کو ادا کرے۔ البتہ ان اصوات کو ادا کرنے کے لیے اگر ریاضت اور محنت کی جائے تو یہ ناممکن نہیں ہے اور اس کے لیے ابتدا ہی سے تربیت اور مشق کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم ان آوازوں کا مطالعہ دو طرح سے کر سکتے ہیں:

1۔ معرب و مفرس اردو

2۔ ہندوستانی اردو

1۔ اوّل الذکر اردو میں ع، غ، ق، ث، ط، ظ، ص، ض، ح اور خ فونیم کا درجہ رکھتی ہے اور جدید تجزیاتی لسانیات کے اصولوں کے اعتبار سے تکمیلی بٹوارے میں آتی ہیں اور عربی فارسی کی آوازیں ہیں۔

2۔ اردو کی قسم دوم میں ع، غ، ق، ث، ط، ظ، ذ، ص، ض، ح، خ کو فونیم کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس قسم میں عربی کی صوت رف رتنہا آواز ہے جو فونیم (Phoneme) کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے عالم اور عامی بھی ادا کرتے ہیں۔ البتہ ہر اردو داں تحریر میں ان سب علامتوں کو استعمال کرتا ہے چاہے یہ اردو قسم اول کی ہو چاہے قسم دوم کی۔ لہٰذا انھیں عجلت میں خارج از اردو تحریر نہیں کہا جا سکتا یہ علامتیں اردو تحریر (Graphemics) کا موضوع بحث ہیں۔ تاہم ذاتی طور سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اردو تحریر میں ان علامتوں کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔ اردو میں دخیل آوازوں کے سلسلے میں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آوازوں کو صرف بول چال کی زبان کی یونٹ (Unit) سمجھا جائے اور حروف کو تحریری زبان کا جز و سمجھ کر آگے بڑھا جائے۔

دنیا کی بہت کم زبانیں تحریری اعتبار سے سائنٹفک ہیں۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان بھی جو ایک بین الاقوامی زبان ہے، تحریری اعتبار سے سائنسی زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ انگریزی زبان کے حروف بھی ہر آواز کی نمائندگی نہیں کرتے۔ زبانیں خاص طور سے تحریری شکل میں کچھ تاریخی روایتوں کی پابندی بھی کرتی ہیں۔ انگریزی اصوات ///ر اور /θ/ /ð/ کی تحریری

علامت "Th" ہی ہے۔ اسی طرح /K/ اور /C/ انگریزی میں ایک ہی آواز کے لیے دو علامتیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے دو مصمتوں میں /ث/س/، /ص/ت/، /ط/، /الف/، /ع/، وغیرہ۔ ایک ہی آواز کے لیے تین یا دو، دو علامتیں ہیں اور اردو رسم الخط تاریخ اور روایت کا احترام کرتے ہوئے جسے اپنائے ہوئے ہے۔ /ق/ اور /ک/ میں عام اردو جاننے والا شخص صوتی اعتبار سے فرق نہیں کرتا۔ البتہ رسم الخط میں علامت کے طور پر وہ دونوں کے استعمال سے واقف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتے ہیں:

> "/ق/ اور /ک/ میں اشتباہ ایک خاص علاقے کے رہنے والے
> کرتے ہیں یا وہ لوگ جو علم و فضل سے بے بہرہ ہیں اس لیے
> اس کو نظر انداز کر دیا گیا"۔[1]

لیکن جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں صوتی اعتبار سے /ق/ اور /ک/ میں فرق صرف عربی کے تربیت یافتہ لوگ کرتے ہیں اور عام بول چال میں شمال سے جنوب تک سبھی /ق/ کو /ک/ میں بدل دیتے ہیں اور اس کی وجہ وہ نہیں ہے جسے شوکت سبزواری صاحب پیش کرتے ہیں۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی اپنی صوتی عادتوں کے تحت اور اکثر اوقات اردو کے صوتی رجحان سے مجبور ہو کر /ق/ کو /ک/ میں فطری طور پر بدل دیتے ہیں اور ایسا کرتے وقت اس صوتی تبدیلی کا انھیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ دکن میں /ق/ ہی نہیں بلکہ /ک/ بھی /خ/ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لسانیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہمیں یہ کہنے کا قطعاً حق نہیں پہنچتا کہ ہم زبان اور وہ بھی بول چال کی زبان کے بارے میں حتمی طور سے فیصلے صادر کریں۔ علم زبان کا پہلا سبق یہی ہے کہ ہم یہ کہنے سے گریز کریں کہ فلاں صحیح کہتا ہے اور فلاں غلط یا یہ کہ یہ جاہل کی زبان ہے اور یہ عالم کی، علم زبان اس قسم کے فتووں کو برداشت نہیں کرتا۔

مختصراً یہ کہ اردو زبان کی ترقی کی ابتدائی منزلوں میں ع۔ غ۔ ق، خ، ص، ث، ض، ذ، ط، ظ، ممکن ہے عام بول چال کی زبان میں مستعار ہی ہوں لیکن ہند آریائی زبانوں

---

[1] ڈاکٹر شوکت سبزواری: اردو کی مستعار آوازیں۔ مطبوعہ اردو شمارہ 25 اپریل 1967

کے جدید دور میں اردو ان مستعار اصوات کو عربی و فارسی کو لوٹا چکی ہے۔ عربی فارسی کی دخیل آوازوں میں صرف /ف/ رہ گئی ہے جو اردو صوتیات کا جز بن کر رہی اور جسے زبان شاید ہی کبھی عربی کو لوٹائے۔

اُردو حُروف تہجّی کی صَوتیاتی ترتیب

اردو نہ صِرف صَرف ونحو بلکہ صَوتیاتی لحاظ سے بھی ایک مخلوط زبان ہے۔ اس میں خالص ہندوستانی آوازیں (ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ کھ۔ گھ وغیرہ) بھی پائی جاتی ہیں۔ اور خالص عربی (ق) اور فارسی (ژ) بھی۔ مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے فوراً بعد سے یہ مسئلہ ماہرین زبان کے سامنے رہا ہے کہ عربی رسم الخط کو جس کا ایرانی جامہ تیار ہو چکا تھا، ہندوستانی زبانوں کے گوں کا کس طور پر بنایا جائے۔ اردو حروف تہجی کی صوری انداز پر ترتیب صوتیاتی نقطۂ نظر سے ناقابل معافی ہے۔ اگر انھوں نے ذرا بھی کاوش ذہنی سے کام لے کر دیوناگری (ہندی) رسم الخط کی ترتیب کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ عربی رسم الخط کی کورانہ تقلید سے باز رہتے۔

اردو زبان کا ارتقا کچھ ایسے یتیمی کے ماحول میں ہوا کہ اہل علم نے اس زبان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کی۔ ہماری تمام تر لسانی تحریکیں فہرست متروکات تک محدود رہی ہیں۔ بہت آگے بڑھے تو انشا نے لطیفہ گوئی شروع کر دی۔ یہ اغیار تھے جنھوں نے اس کی قواعد کی طرف سائنسی نقطۂ نظر سے توجہ کی۔ لغات لکھیں اور اس کے رسم الخط کو مشین اور ٹائپ کے لیے ڈھالا۔ اردو رسم الخط خاص طور پر ہماری بے توجہی اور غفلت کا شکار رہا ہے اہل دکن نے شروع میں جو رسم ڈال دی اسی کو ہمارے کاتب نبھاتے گئے اور اسی کو ہمارے بچے سیکھتے اور مدرّسین پڑھاتے رہے۔

ذیل میں اردو آوازوں کی نئی ترتیب پیش کی جارہی ہے۔ یہ صوری نہیں صوتی ہے اور اس کو مرتب کرتے وقت دیوناگری رسم الخط کی خوبیوں اور ''بین الاقوامی انجمن صوتیات'' کے اصولوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔

حروف صحیح

ک	چ	ٹ	ت	پ
کھ	چھ	ٹھ	تھ	پھ
گ	ج	ڈ	د	ب
گھ	جھ	ڈھ	دھ	بھ
X	X	X	ن	م
خ	ش	X	س	ف
غ	ژ	X	ز	X
X	X	ڑ	ر	X
		ڑھ	X	X
ق	X	X	X	X
ہ	ی	X	ل	X

اشارات

۱۔ یہ ترتیب دیوناگری رسم الخط کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، جو ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم الخط ہے۔ مثلاً ک حلقی ہے۔ اس کے بعد (چ۔ٹ۔ت۔پ) آتی ہیں جو علی الترتیب حنکی (تالوکی)، کوز (پیچھے کو مڑی ہوئی) دندانی اور شفہی (لبی) آوازیں ہیں۔ یہ سب غیر مسموع (voiceless) آوازیں ہیں جو محض سانس سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور جن کو نکالتے وقت گلے کے پردوں میں تھرتھراہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اسی نہج پر بعد کو مسموع آوازوں (گ۔ج۔ڈ۔وغیرہ) کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہ سب آوازیں ہ، مخلوط کے ساتھ مل کر نئی آوازوں (کھ۔ٹھ۔تھ۔پھ۔گھ۔

جھ۔ڈھ۔بھ)کوجنم دیتی ہے۔ان کی بھی ہندی رسم الخط کے انداز پرترتیب دی گئی ہے۔

اردورسم الخط عربی کے تتبع میں صورتی مناسبتوں پر قائم کیا گیا ہے۔یعنی:

ب،پ،ت،ٹ،ث

ج، چ، ح، خ

د، ڈ

ر، ڑ، ز

س، ش

ص، ض

ط، ظ

ع، غ

اس لیے اردو کے ابتدائی زمانے میں جب خالص ہندی آوازوں کے لیے جگہ تجویز کرنے کا خیال آیاتو

(ڑ)کو(ر)کے پاس رکھ دیا گیا۔

(ڈ)کو(د)کے پاس رکھ دیا گیا۔

(ٹ)کو(ت)کے پاس رکھ دیا گیا۔

حالانکہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے (ک)اور(ج)،(ٹ)کے پاس آتے ہیں۔اور اسی طرح (گ)اور(ج)،(ڈ)کے پاس۔

2۔ مذکورہ بالا آوازوں کی تقسیم بین الاقوامی انجمن صوتیات'' کے اصولوں کو مان کر کی گئی ہے اس انجمن کے اصول بالاتفاق رائے صوتیات کی دنیا میں تسلیم کیے جاتے ہیں اور اس کا پیش کردہ بین الاقوامی رسم الخط صوتیات کی کتب میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مخرج کے اعتبار سے اُردو آوازوں کی حسب ذیل قسمیں ہیں۔

1۔ غشائی یا حلقی آوازیں (ق۔ک۔کھ۔گ۔گھ۔خ۔غ۔ہ وغیرہ)

2۔ حنکی آوازیں جوتالو سے نکلتی ہیں (چ۔چھ۔ج۔جھ۔ش۔ژ۔ی)

3۔ کوزی آوازیں (جن کے نکالنے میں زبان کی نوک تالو کی طرف موڑنا پڑتی ہے۔ (ٹ۔ڈ۔ٹھ۔ڈھ)(ڑ)اور(ڑھ) بھی اس کے ماتحت آتی ہیں (فرق یہ ہے کہ ان دونوں کو نکالتے وقت زبان کی مُڑی ہوئی نوک پھسل جاتی ہے)

4۔ دندانی آوازیں (زبان کی نوک ان کو نکالنے وقت دانتوں کے پیچھے لگتی ہے)
(ت۔تھ۔د۔دھ۔ن۔س۔ز۔ر۔ل)

5۔ شفی آوازیں (جو ہونٹوں یا نیچے کے ہونٹ اور اوپر کے دانتوں کی مدد سے نکلتی ہیں
(پ، پھ، ب، بھ، م، ف، و)

3۔ صوتی نقطۂ نظر سے کھ، چھ، بھ وغیرہ علاحدہ اور مستقل آوازیں ہیں۔ اسی لیے ہندی رسم الخط میں ان کے لیے مستقل اور علاحدہ حروف قائم کیے گئے ہیں۔([k N Hk])اردو والوں نے ''ھ'' مخلوط کی مدد سے اس مسئلہ کو قدرے سہل بنالیا ہے۔یعنی ''ک'' سے ''کھ'' ''ب'' سے ''بھ''، وغیرہ۔ اور اسی طرح حروف کی تعداد کو محدود رکھا ہے۔ لیکن یہ سہل پسندی اس صوتیاتی مغالطہ کا باعث بن گئی ہے کہ ''دھ'' مرکب ہے (د+ھ) سے جبکہ ''دھ'' جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، ایک مفرد آواز ہے۔ اردو والے اکثر (ھ) مخلوط اور (ہہ) کے استعمال میں بڑی لاپرواہی برتتے ہیں۔یعنی (ہے)(ھے) بھی لکھ جاتے ہیں۔ حالانکہ دوچشمی (ھ) کو ہمیں مخصوص کر دینا چاہیے۔ صرف کھ۔ بھ، دھ وغیرہ کے ساتھ۔

(کھ، دھ، بھ وغیرہ) کی فہرست میں (نھ)(ھ)اور(لھ) کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً الفاظ، تمھا، دُلھن، تمھارا۔ میں ''نھ'' (ن+ھ) نہیں بلکہ کھ، بھ۔ دھ کی صوتی قدر رکھتا ہے۔ یعنی مفرد آواز ہے لیکن ایسا نہ کرتے وقت دو باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ ان آوازوں (نھ، لھ، مھ) سے گنتی کے الفاظ بنتے ہیں۔ پھر یہ کہ (دُلھن) اور (دُلہن) کا تلفظ متعین بھی نہیں۔ پورب میں (د+ل+ہ+ن)=دُلہن تلفظ کرتے ہیں جب کہ دہلی اور پنجاب کے لوگ (دُ+ل+ھ+ن)=دُلھن کہتے ہیں۔

4۔ مذکورہ بالا جدول سے عربی کی دوہری آوازیں (ث۔ح۔ط۔ظ۔ص۔ض۔ع۔ذ) غائب کردی گئیں۔ میں عربی، اردو کے تمدنی رشتوں اور تاریخی لسانیات کے

مباحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا۔ صوتیات صرف بول چال کی زبان اور تلفظ سے غرض رکھتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ خالص صوتی نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا آوازیں اردو والوں کے لیے بے معنی ہیں۔ عربی میں اس کا اختلاف صوتی اور معنوی دونوں لحاظ سے کار آمد ہے اور عرب ان کی ادائیگی میں فرق کرتے ہیں۔ اردو کا لہجہ اور تلفظ اب متعین ہو چکا ہے اس لیے ہمیں اپنے حروف تہجی کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہوگا اور اس کے جائزے کے وقت صرف صوتیاتی معیاروں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

5۔ ہم نے 'ع' کو بھی اس جدول سے خارج کر دیا ہے۔ گو کہ مخصوص حلقوں بالخصوص عربی دانوں میں ہمارے یہاں (الف) اور (ع) کی آوازوں میں فرق کیا جاتا ہے لیکن عوامی نقطۂ نظر سے (ح) کی طرح (ع) بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے ''ہ'' اور (الف) آوازیں اردو کی اصل آوازیں قرار دی گئیں۔

6۔ (ژ) کی آواز کو ہم نے اس جدول میں قائم رکھا ہے۔ گو اس سے مرکب صرف چند ہی الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ہم یورپ کی بعض زبانوں مثلاً فرانسیسی کے الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکیں گے۔ فرانسیسی میں یہ آواز بہت عام ہے۔ مثلاً آندرے ژید۔ ژان ژاک روسو وغیرہ۔ اسی طرح انگریزی کے بعض الفاظ مثلاً پلیور۔ میور کا صحیح تلفظ کرنے پر قادر ہوں گے اور انھیں اہلِ پنجاب کی طرح پلیسر اور میسر نہیں بنائیں گے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے ''ژ'' کی آواز مفرد اور منفرد طور پر اردو داں طبقہ میں رائج ہے۔

7۔ گو اُردو بولنے والوں کے ایک بہت بڑے طبقے یعنی اہلِ پنجاب کے لیے (ق) کی آواز بے معنی ہے۔ تاہم مذکورہ بالا جدول میں ہم نے اسے قائم رکھا ہے کہ اہلِ زبان اس کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور معنوی حیثیت سے بھی (ق) اور (ک) کا فرق ضروری ہے۔

حروفِ علّت

اردو کے بُنیادی حروفِ علّت تعداد میں دس ہیں۔ اِس لحاظ سے اُردو ، خالص ہندوستانی زبان ہے۔ یعنی اِس نے عربی، فارسی کے مخصوص حروفِ علّت کو قبول نہیں کیا۔
ہندی رسم الخط کے انداز پر ان کی ترتیب حسب ذیل انداز میں کی جاسکتی ہے۔

ـَـ	(اَ)	=	अ		ا	=	(آ)	=	आ
ـِـ	(اِ)	=	इ		ی	=	(ای)	=	ई
ـُـ	(اُ)	=	उ		و	=	(اُو)	=	ऊ
ـےی	(اِیٖ)	=	ए		ـےی	=	(ای)	=	ऐ
ـُوٗ	(اُوٗ)	=	ओ		ـےو	=	(اَو)	=	औ

اشارات

ا۔ حروفِ علّت اپنی مکمل شکل میں ''ا'' ''ی'' اور ''و'' کے مرکبات سے بنتے ہیں لیکن ماترائی شکل (علامتی شکل) کا اظہار اردو رسم الخط سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے زیر، زبر، پیش (چھوٹے حروفِ علّت) کو ''ا'' ''ی'' ''و'' کے مختلف نشانات کے ساتھ اس طرح مرکب کیا گیا ہے کہ اردو کی تمام ممکن آوازوں کو ادا کیا جاسکتا ہے۔

مثالیں:۔

v	اکبر	برکت
vk	آفتاب	رات
b	اتنا	کتنا
bZ	اکھ	نیند

m	اُتنا	رُکنا
A	اُون	ٹُون
,	ایکا	ٹھیکا
,s	اَیسا	چیسہ
[illegible]	اُولا	گھولا
[illegible]	اَوندھا	گھولا

2۔ اُردو کے تمام حروفِ علّت غنّہ کے طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ غُنّہ کے لیے (ں) کا استعمال کرنا چاہیے۔ خالی (ن) لفظ کے درمیان میں آئے تو اس کے اظہار کا کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ اس لیے:

(ن) بطور حرف صحیح   مثال:۔ بِدا۔ بندا۔ کمان

(ں) بطور غُنّہ   مثال:۔ جہاں۔ نیند

3۔ اردو حروفِ علّت کے مخرج کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جاسکتا ہے۔ جو منہ اور زبان کے انداز پر بتایا گیا ہے۔
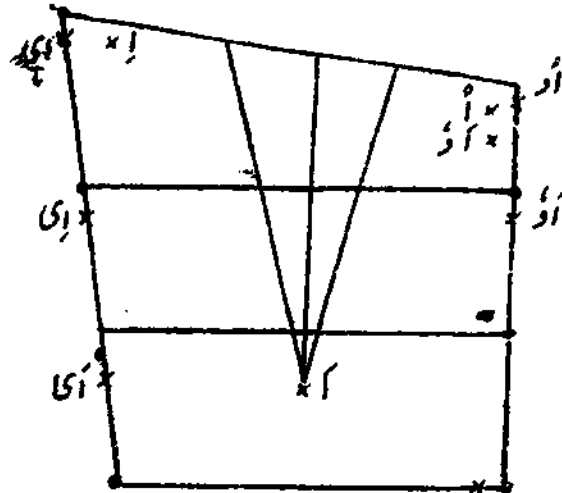
اِس طرح چار حروفِ علّت (اِي، اِيِ۔ اَی۔ اِی) زبان کے اگلے حصّے سے پیدا ہوتے ہیں۔ (ا) درمیانی حصّے سے ہے۔ اور (اُ۔ اُو۔ اُو۔ آ) زبان کے پچھلے حصّہ سے۔ اِن آوازوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے اردو رسم الخط میں۔ ا۔ دری کے علاوہ تین اعراب بھی ہیں۔ زیر۔ زبر اور پیش۔ یائے معروف اور یائے مجہول کو علاحدہ علاحدہ لکھنے کی بجائے (ی) کی صرف ایک شکل استعمال کی گئی ہے۔ مجہول (ی) کو معروف بنانے کے لیے (ی) کے نیچے ایک علامت سے کام لیا گیا ہے۔ (ی)۔

کوئی رسم الخط بذات خود اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ یہ ایک فنّی معاملہ ہے اور طباعت اور اشاعت کی سہولتوں کے مدِّ نظر اس میں تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ چونکہ یہ زمانہ مشین اور ٹائپ کا ہے ان کے لحاظ سے صوری تبدیلیاں ضروری ہیں۔ اس طرح بہت ممکن ہے کہ ہمارا صدیوں کا وہ جمالیاتی احساس جو نستعلیق سے وابستہ ہے بُری طرح مجروح ہو۔ یا عربی اور فارسی سے تاریخی لسانیات کے برسوں کے رشتے ناطے توڑنا پڑیں۔ لیکن ہر صورت میں ہمیں اپنے رسم الخط کو عہدِ جدید کے قابل اور علمُ الصّوت کے مطابق بنانا پڑے گا۔ اور یہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اُردو زبان کی مستقل حیثیت تسلیم کرلیں اور اس کا رسم الخط صَوتی معیاروں پر، نہ کہ تاریخی لسانیات کے معیار پر (جہاں ص۔ ض۔ ط۔ ظ وغیرہ کا قائم رکھنا ضروری ہے) ڈھالنے کی کوشش کریں۔

صوتی تغیر وتبدل

زمان ومکان کے حالات کے مطابق زبان خود بخود بدلتی رہتی ہے۔ اور اس تبدیلی کو ماہرین لسانیات زبان کا فطری ارتقا قرار دیتے ہیں۔ اس ارتقا کا انحصار زیادہ تر صوتی تشکیل اور تغیر وتبدل پر ہوتا ہے۔

تاریخ السنہ میں صوتی تبدیلیوں اور ارتقا کو اس لیے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ زبان کی دوسری اکثر تبدیلیاں اور ارتقا کم وبیش اسی کے تحت ہوتے ہیں اور جو حالات تلفظ اور لب ولہجہ میں تغیر پیدا کرتے ہیں ان کی تحقیق وتفتیش اکثر دفعہ دلچسپ ثابت ہوتی ہے۔

صوتی تبدیلیوں کی سب سے پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو لسانی ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بعینہ ایک اور معین نہیں ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نسل کے بعد اس کی آوازیں اور اس کے عضوی عادات واطوار غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ تبدیلی پاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر نتیجہ ہوتی ہے ہمسایہ زبانوں کے اثر کا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی ایک نسل کو ایک اجنبی زبان بولنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس اجنبی زبان کی آوازیں اس نسل کے اپنے نقطوں پر جو عمل یا ردِعمل کرتی رہتی ہیں ان کے نتیجے کے طور پر اس تمام نسل کے مخارج تلفظ آہستہ آہستہ اپنی جگہوں سے ہٹتے ہیں۔ یہ محض خیال نہیں ہے۔ اس کی واقفیت کا عملی ثبوت اس

طرح بہم پہنچتا ہے کہ ایک ایسے نوجوان کی گفتگو صوتی گردونہ پر اُتاریں جس نے اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کی بھی تحصیل کی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے کسی معمر عزیز سے بھی وہی جملہ کہلائیں (مگر شرط یہ ہے کہ اس دوسرے شخص کی زبان پر کسی اور زبان کا اثر نہ پڑا ہو۔) تو آپ معلوم کریں گے کہ دونوں کے مخارج میں ایک معیّن فرق پیدا ہو گیا ہے۔

یہ تو ایک جدید علمی ثبوت کا ذکر تھا۔ اس کے تاریخی ثبوتوں سے خود ہماری اُردو زبان محروم نہیں ہے۔ آپ صرف اُردو حرف جر "سے" لے لیجیے اور دیکھیے کہ زمانہ اور نسلوں کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال نے بھی کیا تغیر حاصل کیے ہیں۔ لفظ "سے" کی موجودہ شکل اُردو زبان میں صرف سوا سو سال ہی سے مستعمل ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ "سیں" یا "سوں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ ولؔی اور اس کے ہم عصروں کے کلام میں آپ کو ہمیشہ سیں یا سوں نظر آئے گا۔ ولؔی کا مشہور شعر ہے۔

مت غصہ کے شعلوں سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بُجھاتی جا

ولؔی سے تقریباً پچاس سال قبل یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ قطب شاہی سلطنت کے عہد آخر کے شاعروں کا کلام اس کا شاہد ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ اور اورنگ زیب کے معاصر غلام علی کی نظم پدماوت کا ایک مصرع ہے ع

بھلائی ستے تو بھلا پائے گا

غلام علی سے پچاس سال قبل اس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ اس زمانے کے گولکنڈہ کے بسنے والے "مجھ سے کہا" کی جگہ "مج تھے کہیا" کہتے تھے۔ چنانچہ مشہور قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں لفظ "تھے" ہی نظر سے گزرتا ہے۔ محمد قلی کے مصرعے ہیں:

۱۔ " معانی کے باتاں تھے جھڑتا نمک "

2۔ " مرا گلستاں تازہ اس تھے ہوا ہے "

محمد قلی کے عہد سے پہلے اور غالباً گولکنڈہ کی تعمیر کے وقت بھی یہ لفظ ''تے'' کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی جس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے شاعری میں شہرت حاصل کی تھی۔ اکثر ''تے'' لکھتا ہے۔ مثلاً:

''تج تے بچھر جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا''

وجہی سے پہلے تمام اُردو تحریروں میں ''تے'' ہی ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے جو اردو نثر منسوب ہے اور جو ان کی نہیں تو ان کے قریبی زمانے کی ضرور ہے۔ اُس میں بھی ''تے'' ہی لکھا گیا ہے۔ مثلاً ''معراج العاشقین'' کا ایک جملہ ہے۔ ''اگر میں تے ایک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی انچ تے میں جلوں۔''

اس وقت تک جس کتاب کو اُردو زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے۔ وہ میاں خوب محمد گجراتی کی خوب ترنگ ہے۔ اس میں حرف جر کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے مگر چند مقامات پر حرف ''تھیں'' استعمال کیا گیا ہے مثلاً: غیرت تھیں سب کیا قبول۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ لفظ ''سے'' کی صوتی شکل مختلف زبانوں اور مقامات پر بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے تھیں یا تے تھا وہ ''تھے'' ''ستے'' ''ستیں'' ''سوں اور سیں'' ہوتا ہوا آخر کار ''سے'' بن گیا۔ ابھی نہ معلوم آگے چل کر اس کا کیا حشر ہو؟

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ نئی پود اپنے آبا و اجداد کے کسی خاص تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر بھی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ زمانۂ سلف میں کسی حرف کا ایک خاص تلفظ تھا۔ جب بعد میں چل کر وہ آواز ہی غائب ہوگئی تو اس حرف کے تلفظ کے لیے زبان کی موجودہ آوازوں میں سے کوئی آواز کام دینے لگی۔ خود ہماری زبان میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں کی ایک خاص آواز آج ملفوظ نہیں ہوتی۔ قدیم برہمنی دور میں اس کا ایک خاص تلفظ تھا۔ مگر موجودہ ہندوستانی بالعموم اس کے بولنے سے قاصر ہیں۔

یہ حرف ''ری'' (ऋ) ہے جو الفاظ ''کرشنا'' اور ''گھرتم'' (لفظ گھی کی قدیم شکل) میں موجود ہے اور آج بالعموم حرف صحیح ''ر'' کی طرح ملفوظ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ اصل میں ایک حرف علت تھا۔ ہمارے اُردو لفظ ''گھی'' میں وہ ''ی'' بن کر رہ گیا اور ''کرشنا'' میں ''ر'' بن کر۔

اکثر دفعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی حرف کا تلفظ پورا نہ سننے کی وجہ سے بولتے وقت وہ غلط طریقے پر ادا کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تلفظ کا اثر بالعموم کمزور آوازوں اور خاص کر حروفِ علّت پر پڑتا ہے۔ جو یا تو اسی حالت میں باقی نہیں رہتے یا لفظوں میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اردو الفاظ لالٹین (لانٹرن) فلالین (فلانل) اور لمبر (نمبر) کی تشکیل اسی اثر کے تحت عمل میں آئی ہے۔

صوتی ارتقا اور تبدیلیاں نہایت باضابطہ ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات زبانوں کے متعلق متعدد اٹل قوانین وقواعد بنا سکے۔ مثلاً آج آریائی لسانیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ سنسکرت کا ابتدائی حرف "وَ" اردو، بہاری، بنگالی اور اڑیا زبانوں میں بالعموم "ب" کی شکل میں منتقل ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اردو کے اکثر الفاظ کا ابتدائی حرف "ب" پہلے "وَ" تھا۔ مگر صوتی ارتقا و تبدیلی کے تحت آج "ب" بن گیا۔ اس قسم کے چند اردو اور ان کے اصل سنسکرت الفاظ کی مثال یہ ہے:

اردو	سنسکرت	اردو	سنسکرت
باٹ	وَرْتم	بیں	ویشتی
بن	وَنم	بیت	ویتر
بڑ	وٹ	بابو	والوک

ہم : پر معلوم کر آئے ہیں کہ ایک ہی زبان ایک ہی حصہ ملک کے کسی خاص زمانے کے بولنے والوں میں جن خصوصیات کے ساتھ مستعمل رہے گی اسی حصہ ملک میں کسی دوسرے زمانے میں نہیں رہے گی۔ اسی طرح ایک حصہ ملک کے باشندے اس کو جس طرح بولیں گے دوسرے حصے کے عہد کے رہنے والے نہیں بولیں گے۔

اردو زبان میں متعدد لفظ ایسے موجود ہیں جن میں دو دفعہ کوزی (ریٹرو فلکس) آوازیں آتی ہیں۔ ایک ابتدا میں اور ایک لفظ کے درمیان میں۔ مثلاً :۔ ٹاٹ، ٹکڑا، ٹوٹنا، ٹھنڈا، ڈانٹ وغیرہ۔" مگر انہی اور اس قسم کے اور لفظوں میں اصل زبان میں پہلے کوزی (ریٹرو فلکس) آواز نہیں تھی۔ بلکہ دندانی تھی۔ چنانچہ یہ اصل خصوصیت دکنی اردو میں اب تک موجود ہے۔ دکن میں انہی لفظوں کو تاٹ، تکڑا، توٹنا، تھنڈا، اور دانٹ کہتے ہیں اور اس سرزمین میں یہ خصوصیت اس شدت

سے باقی ہے کہ اگر اب بھی کسی اجنبی زبان سے کوئی نیا لفظ ایسا مل جاتا ہے جس میں ابتدائی حرف کوزی (رِٹرو فلکس) ہے تو دکنی اُردو میں اس کی ابتدائی آواز دندانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ ٹکٹ کو دکنی عوام تکٹ کہتے ہیں۔

شمال کی زبان میں یہ ابتدائی دندانی آواز کوزی (رٹرو فلکس) میں کیوں تبدیل ہوئی۔ اس کا سبب غالبًا نفسیاتی ہے۔ ''ٹ'' بمقابلہ ''ت'' کے ایک سخت آواز ہے اور سخت آواز کے تلفظ کے لیے اعضائے مخارج پہلے ہی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ماقبل کے حرف پر اس تیاری کا اثر پڑتا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے ادغامی اثر کی یہ مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی لفظ میں مصمتی اور غیر مصمتی دونوں آوازیں یکے بعد دیگرے آئیں تو اگر مابعد کی آواز مصیبت ہو اور آگے کی غیر مصیبت جیسے لفظ اکبر اور اخبار میں ہیں تو ماقبل کی غیر مصیبت آواز بھی خصوصیت حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ اکبر''ک'' اور اخبار کا ''خ'' قریب ''گ'' اور ''غ'' بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ماقبل کی آواز مصیبت اور مابعد کی غیر مصیبت ہو تو ماقبل کی آواز بھی غیر مصیبت ہو جاتی ہے۔ مثلاً ''آج تک'' اور ''باز پرس'' میں ''ج'' اور ''ز'' دونوں مصیبت ہیں۔ لیکن اگر آپ انھیں کسی سے صوتی گرددنہ پر کہلوائیں تو معلوم کریں گے کہ ''ج'' اور ''ز'' کی آوازیں ''چ'' اور ''س'' کی طرح نکلتی ہیں۔

صوتی تغیر و تبدل سے متعلق ایک اور خاصیت بھی ہے جو زبانوں کے ارتقا میں کسی نہ کسی طرح عمل کرتی رہتی ہے۔ ہر زبان میں آپ کو ایسے لفظ ملیں گے جب کہ تلفظ میں نہایت سُرعت کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ انھیں کے ساتھ دوسرے لفظ بھی زیادہ بدلنے نہیں پائے ہیں۔ ان غیر طبعی تبدیلی حاصل کرنے والے الفاظ میں اکثر وہ ہوتے ہیں جو کسی کو مخاطب کرنے کے لیے یا آداب و روایات معاشرت یا روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی بے تکلف گفتگو میں لفظ مولوی کے تلفظ پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ لفظ صوتی تبدیلیوں کی دو منزلیں طے کر چکا ہے یعنی مولی سے ملی۔ پہلی منزل میں ہی دوسرا ''و'' اُڑ گیا اور دوسری میں پہلا۔ اسی طرح انگریزی لفظ اسٹیشن'' عوام کی زبان میں پہلے'' اسٹیشن'' ہوا۔ اور پھر ابتدائی ''الف'' اور ''س'' اُڑ کر'' ٹیشن'' رہ گیا۔ اور اب تو

بعض جگہوں پر لفظ ''تھیسن'' بھی سنا جاتا ہے۔

اسی قسم کی اور صوتی تبدیلیاں بھی ہیں جن میں اگر چہ لفظ کے معنی اور ایک حد تک شکل بھی قریب قریب وہی رہتی ہے مگر یہ تبدیلیاں نہ تو کسی باضابطہ صوتی اصول کے تحت عمل میں آتی ہیں اور نہ زبان کے اس قسم کے جملہ الفاظ پر حاوی ہوتی ہیں۔

اس قبیل کی ایک تبدیلی یہ ہے کہ قریب المخرج حروف صحیح ایک دوسرے کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ جیسے غالبؔ نے نمبر کو لمبر لکھ دیا۔ جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح ''بیرسٹر'' کا تلفظ ''بیلسٹر'' بھی کیا جاتا ہے یا ''کاغذ'' کو ''قاغذ'' کہتے ہیں۔ ''سرشار'' کو ''شرشار'' شمس الدین کو شمش الدین اور سٹیشن کو شٹیشن کہنا بھی اسی صوتی طریقہ عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری مثالوں پر غور کرنے سے آپ معلوم کریں گے کہ یہ تبادلہ ہمیشہ قریب المخرج حروف ہی کے درمیان عمل میں آتا ہے۔ حروف ''ن'' ''ر'' اور ''س'' کے تلفظ کے لیے تالو پر زبان جن حصوں کو مس کرتی ہے وہ حصے ''ل'' اور ''ش'' کی آوازوں کے اظہار کے لیے آلودہ ہوتے ہیں۔

ایک صوتی تبدیلی اس طرح کی بھی ہوتی ہے کہ بعض لفظوں میں آوازیں اپنی ترتیب بدل دیتی ہیں۔ اس قسم میں وہ الفاظ شامل ہیں جو اگر چہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہوں مگر ان میں کوئی نئی آواز یا حرف بھی داخل نہیں ہوا۔ مثلاً لفظ رجحان کا تلفظ رجہاں، فصیل کا صفیل، مطلب کا مطبل، کیچڑ کا چیکڑ کیا جاتا ہے، یا یہاں کو ہیاں اور وہاں کو ہواں کہا جاتا ہے۔ ان تبدیل شدہ شکلوں میں آپ کو نیا حرف ایک بھی نظر نہیں آئے گا۔ حرف وہی ہیں مگر ترتیب وہ نہیں ہے۔

مگر ان تبدیلیوں میں اور ارتقائے زبان کی باضابطہ اور غیر محسوس تبدیلیوں میں فرق ہے۔ ان متذکرہ بالا مثالوں کو ہم کسی اصول و قاعدہ کے تحت نہیں لاسکتے، یہ محض اتفاقی اور ہنگامی واقعہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ اردو الفاظ ''کوڑی'' اور مچھلی پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سنسکرت الفاظ ''کپرد'' اور ''کیرد'' کے حروف ''رد'' اور ''پ'' کے ان کا لسانیاتی ارتقا یوں ہوا۔

کپرد، کپد، کوڈ، کوڑا اور کوڑی۔

اسی طرح متسیہ سے باضابطہ صوتی اصولوں کے تحت لفظ مچھلی کا ظہور ہوا۔ اور یہ تبدیلیاں محض انھیں الفاظ تک محدود نہیں ہیں۔ جہاں سنسکرت میں "رؤ" کی آواز تھی۔ آج اکثر اردو میں "ڑ" ہے۔ اسی طرح "پ" کی آواز "و" میں اور "ت" "س" کی آواز "چھ" میں منتقل ہو گئی۔

زبان کے اس فطری ارتقا کے سلسلے میں ان سماعی الفاظ کا ذکر بھی ضروری ہے جو زبان کے کسی موجودہ لفظ کو دیکھ کر اس کے ہم شکل بنا لیے جاتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں بنانے والوں کے ارادہ و اختیار کو دخل نہیں۔ زبان استعمال کرنے والے غیر محسوس طریقہ پر الفاظ بناتے اور استعمال کرتے ہیں۔ یہ نئے الفاظ زبان کے موجودہ لفظوں سے شکل و شباہت اور صوتی عناصر میں اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ بنانے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں جو پہلے زبان میں موجود نہیں تھا۔

اُردو املا

ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور ان قاعدوں کی بُنیاد صحیح اصول پر ہو۔ اگر قاعدے متعین نہ ہوں تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا، اور اُردو ابھی تک اسی قسم کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں، ہر لکھنے والا ان کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ املا کی خرابی یا بے ضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اُس کے زبان دانوں نے فوراً اِس خرابی کی اصلاح کی۔ ترقی کرنے والی قومیں اس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں۔ عام طور پر اصلاح کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوئے اس غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی یا وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی، عوام کے لیے یہ ایک بہت بڑی سند ہوگئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ اِن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہیں۔ بڑا گروہ مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے۔ اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ داری اہلِ تحقیق پر

عائد کی جاتی ہے پس ایسی خرابیوں کا انسداد ہوسکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے نہ صرف قاعدے بنائیں بلکہ ہر ممکن ذریعے سے انھیں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ اس وقت صرف چند ضروری مسئلے پیش کیے جاتے ہیں۔

1۔ مختفی ہ یا الف؟

جہاں تک تلفظ سے بحث ہے اردو میں مختفی ہ کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ مختفی ہ فارسی کی چیز ہے۔ اُردو، ہندی کے لفظوں میں نہیں آسکتی۔ لفظ کی ابتدا یا بیچ میں کبھی نہیں آتی۔ آخر ہی میں آسکتی ہے۔ اُردو اور ہندی کی طرح فارسی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے۔ البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پُرانی فارسی زبان میں ان کے آخر میں ک تھا جو ک سے پھر گ ہوا اور پھر گر گیا۔ اگر اس ک یا گ سے پہلے الف تھا تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا۔ جیسے پُرانے اژدھاک سے اژدھا رہ گیا۔ دقت ان لفظوں کی کتابت میں آپڑی جن کے آخر میں ک تھا اور اس سے پہلے زبر اس لیے کہ اخیر حرف پر حرکت رہ گئی اور عام قاعدے کے بموجب اس اخیر حرف کو ساکن ہونا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لے لیجیے:

''بندہ'' پُرانی فارسی میں بندک اور بندگ تھا۔ بعد کو (یعنی اسلامی دور سے کچھ پہلے ہی) گ گر گیا تو ''بند'' رہ گیا اور کتابت میں ''بَند'' اور ''بَنْد'' میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلوی تحریر میں تو پُرانی کتابت (یعنی بندک) ہی جاری رہی مگر جب عربی لفظ اختیار کیے گئے تو فکر ہوئی کہ اخیر حرف کی حرکت جو تلفظ میں آتی ہے تحریر میں کس طرح نمایاں کریں۔ تدبیر یہ ٹھہری کہ ایک ہ اخیر میں لکھیے اور اس کو زبر کی طرح پڑھیے۔ ہ کی آواز اس میں نام کو نہ ہو۔ اس لیے اس کا نام مختفی پڑ گیا۔ اور اس کے مقابلے میں اصلی ہ کو ملفوظ کہنے لگے۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی میں ہوا اور عربی میں ان دونوں اصطلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

فارسی لغات کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے اخیر میں جو ہ ہے وہ مختفی ہے یا ملفوظ۔ فارسی میں بھی املا کے متعلق اچھی احتیاط برتی جاتی ہے اور کبھی کوئی لفظ جس کے آخر میں الف ہے۔ ہ سے نہیں لکھا جاتا۔ سوا اس کے کہ قافیہ کی ضرورت سے

''آشکارا'' کو ''آشکارہ'' اور ''خارہ'' کو ''خارا'' لکھ دیا۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے تک اردو والے بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک بات اور بھی اس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے، وہ یہ کہ فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے تو ان میں سے کسی کسی میں تصرف بھی کیا۔ انھیں میں سے ایک تصرف یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ عربوں کے یہاں ایک حرف ہے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ہے۔ شکل اس کی ہ کی ہے مگر معمولاً اُسے ت پڑھتے ہیں اسی لیے اس پر دو نقطے لگا دیتے ہیں (ۃ) جب اس گول ۃ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آپڑتا ہے اور آواز ۃ پر ٹوٹتی ہے تو اسے ملفوظ ہ کا سا تلفظ ملتا ہے اور اس سے پہلے زبر بھی ہوتا ہے۔ اکثر اس ہ کا تلفظ گہرا نہیں ہوتا۔ کس واسطے کہ آواز کا زور اس پر ختم ہوتا ہے اور اس وجہ سے دھیما پڑ جاتا ہے۔ ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز ان کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ہے اکثر صورتوں میں اسے ہ مختفی کی طرح بولنا شروع کر دیا اور کہیں کہیں اسے ت قرار دے کر اسے اسی طور سے بولنے اور لکھنے لگے۔ عزۃ، خدمۃ، حجۃ وغیرہ کو عزت، خدمت، حجت بنا دیا اور درجۃ مدرسۃ وغیرہ کو درجہ، مدرسہ۔ کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال دیا جیسے اجازہ اور اجازت، ارادہ اور ارادت، افاقہ اور افاقت وغیرہ۔ ان لفظوں میں جہاں جہاں ''ۃ'' ''ہ'' ہوگئی۔ وہاں ہ مختفی ہی قرار پائی۔ یہ مفرس لفظ فارسی سے اُردو میں آئے تو یہاں بھی ان کا تلفظ وہی رہا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا۔

اسی طرح اردو میں مختفی ہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھ مخصوص ہے مگر اس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ہنجار قائم نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بد مذاقی پھیلی اور ٹھیٹ اردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے۔ ہندی کے دیوناگری خط میں تو ایک (vk) ہے اور اس کا نمایندہ اُردو میں سوا الف کے اور کوئی حرف ہو ہی نہیں سکتا۔ ہندی لفظ تو ایک طرف رہے طرہ یہ کہ وہ عربی فارسی لفظ بھی جن کے آخر میں الف ہے ہ سے لکھے جاتے ہیں۔ یہ املا سراسر غلط ہے۔ قاعدہ اس کا یوں ہے:

۱۔ ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے۔ (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ، کلکتہ، پٹنہ، کس واسطے کہ نام ہیں اور ہمیشہ اسی طرح لکھے جاتے ہیں) مقاموں کے ناموں کے سوا

جتنے لفظ ہیں ان کو الف ہی سے لکھنا چاہیے۔ جیسے :۔ اکّا (اسے ''یکہ'' لکھنا تو یوں بھی غلط ہے کہ تلفظ کے سراسر خلاف ہے۔ فارسی میں یہ لفظ گاڑی کے معنوں میں موجود بھی نہیں۔ ہمارے اردو لفظ ایک سے بنا ہے نہ کہ فارسی 'یک، سے اسی طرح ''موم بتی'' کا اکا'' تاش کا اکا'' زیور جسے عورتیں ایک ہی بازو پر باندھتی ہیں اور اس میں ایک ہی بڑا نگینہ ہوتا ہے۔ جس میں زیادہ نگینے ہوتے ہیں اسے ''نونگا'' کہتے ہیں) اکیلا، آنولا، باجا، باجرا، بادلا (ایک قسم کا نفیس کپڑا) باڑا (''امام باڑا'' وغیرہ مرکبوں میں بھی آتا ہے) بٹوا، بٹوارا، بچھونا۔ بچکانا، بچھڑا، بچھونا، بچھیرا، بُلبلا، بنجارا، بھانجا، بھتیجا، بھروسا، بھیڑیا، تانگا، پانورا، پتا (نشان کے معنوں میں) پتّا پتّا، پِتا (باپ) پُتلا، پتیلا، پٹاخا، پٹارہ، پٹھا، پچھتاوا، پڑاقا، پسینا، تارا (جسے فارسی میں ستارہ کہتے ہیں) تایا (چچا جو باپ سے عمر میں بڑا ہو) چارا (گھاس وغیرہ) چبوترا، چراغا، چرسا، چرچا، چکارا، چلا، چھالا چھلّا، چھلا، داسا، دُبلا، دپلکا (دو پلک والا)..........(ایک مصنوعی نگ جسے بلور کے دو ٹکڑوں کو ملا کر بناتے ہیں) دُخما (یعنی دو خم والا پنجا) دگلا، دھکا، دھوکا، ڈوریا، ڈیڑھ خما (یعنی ڈیڑھ خم والا) راجا، سردتا، کتھا، کوئلا، کھلونا، لڑکا، مہینا، میلا، ناتا (رشتہ داری)۔ یاد رہے کہ مذکر صفتیں بھی الف ہی سے صحیح ہیں۔ جیسے چلبلا، دھوکا، نچلا۔

اسی طرح وہ لفظ بھی جو یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں۔ جیسے بلّا (تمغہ وغیرہ کے معنوں میں) ڈراما، فرما، کمرا، مارکا (نشان) وغیرہ اور یہی حال ان لفظوں کا ہے جو فارسی عربی سے نکلے تو ہیں مگر خود ان زبانوں میں ان کا وجود اس ہیئت میں نہیں ہے جیسے بدلا، بے فکرا، نو دولتا، کبابیا (کباب والا) برفیا (برف والا) خاصا (اچھا، خاصا، پورا کے معنوں میں) بعضا (بعض) مسالا، ملیدا (ف، مالیدہ) وسپنا وغیرہ۔

خاصا (جمع۔ خاصے اور مونث خاصی) اور بعضا (بعضے، بعضی) میں کے الف یا ی کو ہ سے ظاہر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ جن معنوں میں خاصہ فارسی میں استعمال ہوتا ہے اگر انھیں معنوں میں استعمال ہو تو البتہ اس کو ہ سے لکھنا ٹھیک ہوگا۔ مسالا ہر معنے میں س اور الف سے لکھنا چاہئے۔ (1) ''گرم مسالا'' (2) ''مسالا'' (گوٹا کناری وغیرہ) (3) مسالا (کسی چیز کے اجزا یا ضروریات یا لوازمات وغیرہ)۔ ''مصالح'' لکھنا یوں غلط ہے کہ یہ مصلحت کی جمع ہے۔ ہمارے لفظ

کوان معنوں سے اصلاً تعلق نہیں۔ مزید براں یہ کہ تلفظ بھی مختلف ہے۔ یہی حال ''مصالحہ'' کا ہے۔ ''مصالحہ'' کے معنے ہیں ''لڑنے والے دو فریقین کے مابین صلح''۔ ملیدہ کا تلفظ بھی فارسی ''مالیدہ'' سے بدل گیا ہے اور اس نے ایک خاص مفہوم اختیار کرلیا ہے۔ پس اسے بھی اس طرح لکھنا چاہیے جس طرح ہم بولتے ہیں۔ دسپنا اور فارسی دست پناہ میں معنی اور تلفظ دونوں بدلے ہوئے ہیں۔ ''دست پناہ'' فارسی میں چمٹے کے معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے معنے ہیں ''دستانہ'')

ان لفظوں کے آخر میں بھی الف لکھنا چاہیے جو ایک اردو اور ایک فارسی یا عربی جُز سے بنے ہیں۔ جیسے ڈیڑھ خما (وہ چیز جس میں ڈیڑھ خم ہو) ''تماھا''، ''چھماہا''، ''پچرنگا''، ''سترنگا'' وغیرہ۔

اس سے ایک کلیہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اور زبان کا لفظ اردو میں دوسرے معنی اور اسی کے ساتھ دوسرا تلفظ اختیار کرلے تو اس کا املا ٹھیٹ اردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے۔

2۔ جو لفظ خود فارسی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں۔ وہ ہرگز ہ سے نہ لکھے جائیں۔ اِن لفظوں کی تفصیل یہ ہے:

(الف) وہ جامد اسم یا صفتیں جن کے آخر میں الف ہے اور حرف اصلی کی حیثیت رکھتا ہے جیسے اژدھا، آسیا (چکی) آشکارا، آشنا، بوریا، چلیپا، پارسا، خارا (ایک قسم کا پتھر) دارا، درا (گھنٹا، ''بانگ درا'') دلاسا، دوبالا، دوتا، سیما (''دیوسیما'' یعنی دیو کی سی شکل والا) سارا (خالص، جیسے ''عنبر سارا'' میں) شوربا (شور+با۔ با کے معنی ہیں پکائی ہوئی چیز۔ یہ لاحقہ کھانوں کے بہت سے ناموں میں آتا ہے) شیوا (فصیح کے معنوں میں جیسے ''شیوا زبان'' مگر ڈھنگ اور حرکات وسکنات کے معنوں میں جو لفظ ہے وہ ''ہ'' سے لکھا جاتا ہے۔ ''شیوہ'') ناشتا، قرنا، گندنا۔

(ب) فارسی فعلوں سے بنے ہوئے اسم فاعل اور صفت مشبہ وغیرہ۔ جیسے بویا، بلبنا، نابینا، دانا، زیبا، پذیرا، جویا، گویا، جہاں آرا، جاں فرسا، جاں فزا، دل کشا، صبر آزما، ہوش ربا وغیرہ۔

(ج) بعض لفظ جن کے اخیر سے کوئی لفظ گر کر الف رہ گیا ہو جیسے پا (پای) خدا (خدای) نا (نای) وغیرہ۔ یا جیسے ''آوا'' (آواز کا مخفف ہے) افتا (افتاں کا مخفف) وغیرہ۔

(د) وہ لفظ جو ھا زیادہ کر کے جمع بنے ہوئے ہیں۔ جیسے صدہا، ہزارہا۔

(ہ) بعض لفظ یا نام جن کے آخر میں پیار یا حقارت یا ندا کے لیے الف بڑھا دیا گیا ہو جیسے بازار یا (بازاری) بشیرا، رکنا، طالبا، حافظا سعدیا وغیرہ۔ (یاد رکھنے کی بات ہے کہ ''(شفیعا'') ایک قسم کا خط ہے۔ جسے مُلّا شفیعا نے ایجاد کیا تھا۔ اس لیے ''خط شفیعا'' مشہور ہوا۔ اسے شفیعہ یا ''شفیہ'' لکھنا غلط ہے۔

3۔ ترکی لفظ جو فارسی اردو میں مستعمل ہیں اور جن کا املا الف سے ہی ہونا چاہیے۔ آلتمغا، تمغا، طغرا، اس طرح ''تمغۂ شرافت'' اور ''طغرۂ سلطانی'' غلط ہوگا۔ صحیح ''تمغائے شرافت'' اور ''طغرائے سلطانی'' ہے۔

4۔ عربی کے جو لفظ خود عربی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں ان کو ہ سے لکھنا صحیح نہیں۔ وہ الف ہی سے لکھے جائیں۔ ان لفظوں کی تفصیل یہ ہے:

(الف) وہ اسم جو افتعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور ان کے آخر میں الف کے بعد ایک ہمزہ ہے۔ یہ ہمزہ اردو میں گر جاتا ہے اور الف رہ جاتا ہے۔ جیسے

ابتدا، اجتبا، ارتضا، ارتقا، اصطفا، اقتدا، اکتفا، التوا، امتلا، انتہا، استثنا، استدعا، استسقا، استعفا، استغنا، استفتا، استقرا، استقصا، استنجا، استیلا وغیرہ۔

(ب) یہ لفظ جن میں سے بعضے اسم جامد ہیں اور بعضے صفت، ان کو بھی ہ سے لکھنا غلط ہے۔
حلوا، سقا، شہلا (''نرگس شہلا'') غرا (''شاعر غرّا'') بیضا (''ید بیضا'') محابا، مدارا، مدارا، مداوا وغیرہ۔

(ج) بعض مذکر نام الف پر ختم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے آخر میں ایک ہمزہ بھی تھا۔ سو وہ اردو میں گر چکا، اور بعضوں کے آخر میں ہمزہ تھا ہی نہیں صرف الف تھا۔ ہ ان میں سے کسی میں نہ تھی:

برخیا، ذکریا، عادیا، مسیحا وغیرہ۔

(د) بعض مونث ناموں کی حالت بھی یہی ہے:

زہرا (حضرت فاطمہؓ کا نام) سارا، حوّا وغیرہ۔

(ہ) بعض جمعیں، جیسے بقایا، برایا، ثنایا، رعایا، عطایا، وصایا، ہدایا وغیرہ۔

(و) بعض متعلق فعل جن کی تنوین فارسی اور اُردو میں گر گئی ہے۔ جیسے اصلا، ظاہرا۔

(ز) ان لفظوں کے آخر میں الف مقصورہ تھا جسے عربی کے قاعدے سے یوں (ی) لکھتے ہیں۔ مگر فارسی اور اردو میں اس کے لیے ایک معمولی الف لکھتے ہیں۔ ہ سے ان لفظوں کو لکھنا سراسر غلط ہے۔

تماشا، تقاضا، ماجرا، مدعا، معما، مربا، مقوا، منقا، دعوا، تقوا، مصفا، مطلا، معرا، وغیرہ۔

(بعض لوگ عربی املا کی پیروی میں دعوا، اور تقوا یا مربا اور منقا کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھتے ہیں جو جائز ہے۔ مگر اردو میں سیدھے سادے الف کو ترجیح ہونی چاہیے۔)

فائدہ: بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں ہ آتی ہے۔ مگر جب ان کی جمع بناتے ہیں تو اس مختفی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی ان تمام مونث اسموں اور بعضے مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر جمع کی علامت لگاتے ہیں جیسے ''بیوہ'' سے ''بیوائیں''، ''بیواؤں''، ''دایہ'' سے ''دایائیں''، ''قبہ'' سے ''قبائیں''، ''قباؤں''، ''قافلہ'' سے ''قافلائیں''، ''قافلاؤں'' وغیرہ اور ''خلیفہ'' سے ''خلیفاؤں''۔ ''علامہ'' سے ''علاماؤں''

(بعض لوگ بیوؤں اور دایوں بولتے ہیں جو صحیح نہیں)

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اپنے کام میں لانا چاہئے۔ سوائے چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املاہ ہے (اور اس ہ کی آواز 'الف، کی سی ہے، اب جن عربی اور فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے ان کے آخر میں بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہ الف سے لکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک حالت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ دو تین حالتیں اور بھی ہیں۔

1۔ جب قافیہ میں مختفی ہ الف کے مقابل ہو تو اس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے۔ جیسے:

تغافل ہائے بے جا کا گلہ کیا

2۔ ایسے لفظوں میں جو اردو میں گھل مل گئے ہیں اور ان کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ہ کی جگہ الف لکھنا جائز ہے۔ جیسے ''مزہ'' کی جگہ ''مزا''۔

3۔ ایسے الفاظ جن میں اردو بولنے والوں نے کوئی تصرّف کرلیا ہو۔ جیسے ''دوماہا'' ''دوخما'' (یعنی دوخم والا) وغیرہ۔

2. مختفی ہ یا ے

(الف) مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کی جمع میں تو باقاعدہ آواز کے مطابق لکھتے بھی ے ہی ہیں۔ جیسے ''دو بچّے کھیل رہے تھے۔،، مگر جب وہی لفظ واحد محرف حالت میں ہوتے ہیں اور تلفظ ان کا وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے تب بھی اکثر لوگ ان کو ہ سے لکھتے ہیں۔ یہ کسی طرح درست نہیں۔ انھیں لکھنا بھی ویسے ہی چاہیے۔ جیسے وہ بولے جاتے ہیں۔ یعنی یوں:

''وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے۔'' ''میں مدرسے جاتا ہوں۔'' ''اس بچّے نے اس مسئلے کو حل کرلیا۔'' ''شیر کے پنجے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔'' ''اس واقعے سے سب کو عبرت ہوئی۔''

(ب) پانچ کے بعد کے عدد کو لوگ عام طور پر ''چھ'' مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا فصیح تلفظ ''چھے'' ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح نہ لکھا جائے۔

(ج) ''کیونکر'' کی جگہ اگلے وقتوں میں ''کیونکے'' بولتے تھے اور ''ے'' کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے ''کیونکہ'' (یعنی کیوں کہ جس میں ''کہ'' کاف بیانیہ ہے) لوگوں نے ''کہ'' اور ''کے'' کے معنوں میں فرق نہ کرکے ''کیونکے'' کو ''کیونکہ'' بنادیا اور پُرانے استادوں سودا، میر، دردؔ وغیرہ کے دیوانوں میں ''اصلاح'' فرمادی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں تصحیف ہے۔ ''کیونکر'' کے معنی میں ''کیونکہ'' اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہوگیا ہے۔ لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ پس نہ صرف پُرانے اساتذہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اس لفظ سے کہیں نہ کہیں دوچار ہوں گے۔ اس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہو تو ''کے'' اور نہیں ''کہ'' لکھا جائے۔ جیسے:

نہ جانے کیونکے مٹے داغ طعن بدعہدی (غالب)

3۔نون غنّہ

بعضے لفظ جن میں نون غنہ ہے کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے صرف اسی طرز کو اختیار کرنا چاہئے جو تلفظ میں سب سے زیادہ قریب ہو۔ ''کنوا'' ''کنواں'' ''کواں'' تین طرح سے لکھتے ہیں۔ تینوں میں بہتر ''کنوا'' ہے۔ (''کنوے'' ''کنوؤں'') اسی طرح ''دھنوا'' (اور ''دھنوے، دھنوؤں'') ''گانو'' (جمع: گانوؤں) ''چھانو'' ''آنو'' ''دانو'' (جمع دانوؤں) پانو (جمع پانوؤں)

اس طرح پر ''کنواں'' ''دھنواں'' ''کواں'' ''دھواں'' ''پاؤں'' ''گاؤں'' ''داؤں'' ''چھاؤں'' وغیرہ صورتیں ترک ہو جائیں گی۔

البتہ ''ڈھلواں'' ''گتھواں'' ''چڑھواں'' اور ترتیبی گنتیاں جیسے پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں وغیرہ اور پانچویں پانچویں (مونث) وغیرہ درست ہیں۔

گنتی کے لفظوں میں (گیارہ سے اٹھارہ تک) اخیر کا حرف ہ ہے۔ بعضے لوگ ان کے آخر میں اں لکھ دیتے ہیں اس لیے کہ بعض خطوں میں ''گیاراں'' ''باراں'' وغیرہ بولتے ہیں اور جو لوگ گیارہ بارہ بولتے ہیں کبھی کبھی اسی طرح لکھ بھی جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ کس واسطے کہ ان لفظوں میں ہ اصلی اور ملفوظ ہے۔ پس ان گنتیوں کو ہ کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ یعنی گیارہ، بارہ۔ اب جس کا جی چاہے وہ گیاراں یا باراں بول لے۔ یہ وہی بات ہے ''ہوا'' کو بعض جگہ ''وا'' بولتے ہیں۔ مگر اس طرح لکھ نہیں سکتے۔

بعض لوگ ''دونوں'' کو ''دونو'' بغیر نون غنہ (ں) کے لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ صحیح ہے ''دونوں'' جیسے ''تینوں'' ''چاروں'' ''پانچوں'' ''چھیوں'' ''ساتوں'' وغیرہ۔

جمع منادا کے ساتھ ساتھ کبھی لوگ ایک نون غنہ بھی لکھ دیتے ہیں یعنی اے لڑکوں!'' یہ درست نہیں بغیر ں کے لکھنا چاہیے۔ جیسے، اے لڑکو' صاحبو'!

جھوٹ کہتا نہیں، میں، سچ جانو
کافرِ عشق ہوں مسلمانو!

(قلق لکھنوی)

4. ہمزہ (ء)

(الف) اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ ہمزہ الف کا قائم مقام ہے۔ پس جب دو حرف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو ان کے بیچ میں ہمزہ آ سکتا ہے۔ نہیں تو نہیں۔ اس لیے ''آؤ''، ''جاؤ''، ''گیت گاؤ''، ''دولڑ کے آئے''، ''آپ آئے''، ''میں آؤں تو کیا لاؤں؟'' ''میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں''۔ وغیرہ میں ہمزہ لکھا جائے۔ مگر ''بناؤ سنگھار''، ''بھاؤ تاؤ''، ''بھاؤ گھماؤ''، ''کڑھاؤ'' میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں۔ اسی طرح ''گائے''، ''چائے''، ''رائے'' اور ''ہائے'' میں بھی ہمزہ نہ چاہئے۔ اور یہی حال ''دیواورسیو'' اور ''ریودریا'' وغیرہ کا ہے۔ ان لفظوں میں الف ی۔ الف دیا ''ے و'' مل کر ایک آواز دیتے ہیں اس لیے ان کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں۔

(ب) ''لئے'' (دونوں معنوں میں) ''اس نے دو سو روپے دئے اور دو گھوڑے لئے'' ''اس نے اپنے لئے چار جوڑ موزے لئے اور بھائی کے لئے ایک ہی جوڑ۔'' سینکڑوں دیئے جل رہے ہیں۔ یہ بھی دیوالی کی بہار ہے۔''

اوپر کے جملوں میں دئے اور لیے کی بہت سی مثالیں آ گئیں۔ ہمزہ کہیں نہیں آنا چاہئے۔ ''چاہئے''، ''دیجئے''، ''لیجئے'' وغیرہ میں بھی ہمزہ نہیں بلکہ یے ہے۔ اسی طرح ''تھالیوں'' ''گالیوں'' وغیرہ میں۔

ہمزہ اسی وقت آئے گا جب اس سے پہلے زبر ہو۔ اگر اس سے پہلے زیر ہوگا تو ے آئے گی۔ یعنی گئے میں ہمزہ ہے مگر کیے میں ے۔

(ج) جہاں ہمزہ لکھنا ضروری ہے وہاں اکثر لوگ کاہلی کے مارے اسے چھوڑ جاتے ہیں، جیسے:

بچھوؤں کو بچھووں، بلکہ کبھی بچھوں۔ ''لکھنؤ'' کو ''لکھنو''۔ ''ہندوؤں'' کو ہندووں'' یہ درست نہیں۔

5. ں ب اور ن ب

جب کسی لفظ میں نون غنہ کے بعد ہی ب ہو تو یہ دونوں حرف مل کر م کی آواز دیتے ہیں

جیسے آنب سے آم (جس کی تصغیر 'انبیا' تلفظ 'ابیا' بلکہ 'امیا' ہوتا ہے) ینب سے نیم، سنب سے سیم۔ ان لفظوں کو میم ہی سے لکھنا چاہیے۔ فارسی عربی لفظوں زنبور، تنبورہ، شنبہ، گنبد، جب میں جو ساکن ن ہے وہ تلفظ میں م ہو جاتا ہے مگر لکھا ن ہی سے جاتا ہے۔ البتہ جب ''گنبد'' سے اردو والوں نے ''گمز'' بنایا اور اس کی تصغیر ''گمزی'' تو ان دونوں لفظوں کو م ہی سے لکھنا پڑا۔ پس قاعدہ یہ نکلا کہ فارسی، عربی کا لفظ ہو تو املا میں ان ہی باتوں کی پیروی کی جائے۔ نہیں تو م لکھا جائے۔

6۔ ذ یا ز؟

فارسی اور اُردو لفظوں میں ذ اور ز کے لکھنے کے متعلق ہمارے ملک میں بڑا اختلاف ہے۔ سب سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی نے ایک خط میں جو انھوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا، یہ خیال ظاہر کیا کہ ذ عربی کے مخصوص حرفوں میں ہے۔ اس لیے فارسی لفظوں کو ز سے لکھنا چاہیے نہ کہ ذ سے۔ ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہا۔ اور اب بھی کبھی یہ بحث چھڑ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذ عربی کے ساتھ مخصوص نہیں اور حقیقت میں ث بھی مخصوص نہیں۔ یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں ان دونوں حرفوں کی آوازوں کا وجود تھا۔ چنانچہ عربی زبان میں جو لفظ یونانی اور فارسی کے لیے گئے ہیں ان میں یہ دونوں حروف ملتے ہیں۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ''استاد'' کی د پر عربوں نے تصرف کر کے ایک نقطہ لگا دیا۔ اصلیت یہ ہے کہ انھوں نے ایرانیوں سے استاذ ہی لیے اور اسی طرح بولنے اور لکھنے لگے۔ خود ایرانیوں کی زبان میں بعد کو وہ ذ د ہو گئی۔ اس لیے کہ اسلامی زمانے میں بلکہ شاید اس سے کچھ پہلے ہی ث اور ذ کی آوازیں زبان سے جاتی رہیں۔ ہر 'ذ'، 'د'، ہو گئی۔ مگر انے گئے لفظوں میں ذ کا تلفظ ز سے بدل گیا لیکن ان لفظوں کو لوگ پرانی عادت کے مطابق ذ ہی سے لکھتے رہے۔ جیسے: ''آذر، گذشتن، پذیرفتن، تذرو، کاغذ، ایک گنبذ ایسا لفظ ہے جو دونوں طرح سے لکھا اور بولا جاتا ہے یعنی ''گنبد'' اور ''گنبذ'' ہندوستان میں لوگوں نے اس لفظ کی اسی دوسری صورت سے ''گمز'' بنا لیا اور اس کی تصغیر ''گمزی'' ہوئی۔ ایران کے بعض مقامات میں ''تذرو'' کی جگہ ''تدرو'' اور ''کاغذ'' کی جگہ ''کاغد'' بھی سنا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان فارسی لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو ز ہے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو ذ ہے۔

اردو میں ''گزر اور گزار'' اور مشتقات کو زیادہ تر ز ہی سے لکھتے ہیں اور یہ کچھ بے جا نہیں۔ مگر ذ بھی ان لفظوں میں صحیح اور جائز ہے۔'' آذر'' اور '' کاغذ'' کو ہمیشہ اور '' پذیرا'' وغیرہ کو اکثر ذ سے لکھتے ہیں۔ ان کو یونہی رہنے دینا چاہیے۔ ان فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں ذ آتی ہے وہ عربی سے آئے ہیں۔ اب چاہے وہ ٹھیٹ عربی ہوں یا کسی اور زبان سے مستعار ایسے لفظوں میں عربی املا کی پیروی لازم ہے۔ گو کہ آواز کے لحاظ سے اردو میں ایک اکیلی ز ہی ذ، ض اور ظ کی قائم مقام ہے۔

چند عربی اور فارسی لفظوں کا غلط املا رواج پا گیا ہے۔ البتہ محتاط لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں یہ مثالیں زیادہ اہم ہیں:

1- ''بحر زخار'' کو بعض کم سواد لوگ ''بحر ذخار'' لکھتے ہیں۔ غالباً اس دھوکے میں کہ ''ذخار'' ''ذخیرہ'' سے بنا ہوگا۔ اصلیت یہ ہے کہ ''زخار'' کو ''ذخیرہ'' سے اصلاً تعلق نہیں۔ بلکہ ''زخار'' کے معنے میں ''بہت امنڈتا ہوا'' (سمندر) یا چڑھا ہوا دریا۔

2- ''ذکی'' اور ''زکی'' اپنی جگہ دونوں صحیح ہیں۔ مگر لوگ ''زکی'' کے محل پر بھی ''ذکی'' لکھا کرتے ہیں۔ یعنی ''زکی الدین'' یا ''محمد زکی'' ز سے لکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ''زکی'' کے معنی ہیں پاک اور ''ذکی'' کے معنی ہیں تیز فہم، اور قابل ملامت بھی۔

3- ''زکریا'' کو بعض لوگ غلطی سے ذ سے لکھتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو یہ ستم کرتے ہیں کہ ''ملازم'' میں بھی ذ لکھ دیتے ہیں۔

4- ''آزوقہ'' عربی لفظ نہیں ہے۔ فارسی ہے اور اس کا املا ز سے صحیح ہے۔ غلطی سے لوگ ذ سے لکھ دیتے ہیں اور یہ غلطی فارسی کی کتابوں میں بھی دیکھنے میں آئی ہے۔

5- ''آزر'' (حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام) ''آزر'' ز سے ہے۔ اسے فارسی لفظ آذر سے کوئی تعلق نہیں۔

6- ''ذات'' ۔ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ ''نفس'' یا ''نفس نفیس'' یا ''شخص'' یا ''نژاد'' ''قوم'' وغیرہ کے معنے نہیں ہیں۔ ان معنوں میں جو لفظ اردو میں بولا جاتا ہے وہ حقیقت میں سنسکرت کا لفظ ''جات'' سے نکلتا ہے۔ ہندی میں ت کا کسرہ اس وجہ سے گر گیا کہ کسی لفظ کا

آخرحرف متحرک نہیں ہوسکتا۔ اردو والوں نے ج کوذ کی آواز سے بدل دیا۔ چاہیے تھا کہ اس لفظ کوز سے لکھتے۔ لیکن عربی لفظ ذات کے دھوکے میں اس کو بھی ذ ہی سے لکھنے لگے۔ اس غلط طریقے کو یقیناً ترک کردینا چاہیے اور جہاں "نژاد" قوم وغیرہ کے معنے ہوں وہاں ز ہی سے لکھنا چاہیے جیسے "زات پات" "زات جماعت" "زات رات۔" "وہ زات کا برہمن ہے۔" "اس کی زات کھری ہے"۔

7۔ عربی کا ایک لفظ "ذرہ" ہے (جس کی ر پر تشدید ہے) اس کے معنی ہیں کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا۔ اردو میں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور انھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جو صرف صفت اور متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جس کے معنے ہیں "تھوڑا" اس کی ر پر تشدید نہیں اور اخیر میں الف ہے ہ نہیں۔ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چونکہ اس لفظ کے پیدا ہونے کا باعث عربی لفظ "ذرہ" ہے اس لیے اسے بھی ذ ہی سے لکھنا چاہیے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تلفظ میں ایک چھوڑ دو دو تصرف ہوئے۔ معنوں میں فرق ہوگیا۔ یہ کہنا چاہیے کہ اردو نے ایک بالکل نیا لفظ پیدا کرلیا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہیں لکھا جائے۔ ادیبوں اور شاعروں کی رایوں میں کتنا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ذ سے لکھو اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا املا ز ہی سے صحیح ہے اور ذ سے غلط۔ اصولاً ز کو ترجیح ہے۔ اِس لیے کہ عربی لفظ "ذرہ" سے اسے اب نہ تلفظ کی رو سے کچھ واسطہ رہا نہ معنی کی جہت سے بلکہ زرا ٹھیٹ اردو لفظ ہوگیا۔

7. ص یا س؟

فارسی والوں نے اپنی زبان کے بعض لفظوں کو عربی حرف سے لکھنا شروع کردیا۔ اس لیے کہ ہم آواز لفظوں کا ایک دوسرے سے امتیاز ہوسکے۔ "صد" سو کے معنے ہیں۔ حقیقت میں س سے ہے۔ مگر اس کا رواج ایسا متواتر ہے کہ اب غلطی کی اصلاح کچھ ناممکن ہی ہوگئی ہے۔ "شصت" (ساٹھ) دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے اس لیے اگر اردو میں کبھی اس فارسی لفظ کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو شست لکھنا بہتر ہوگا۔

"مسالا" کی بحث اوپر آچکی ہے (دیکھو الف اور مختفی ہ کا بیان)

8. ط یا ت؟

فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے ت کی بجائے کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے طپش، طپیدن، طشت، طوطی بحتاط لوگ ت ہی سے لکھتے ہیں اور ہم کو بھی یہ املا اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی تپش، تشت، تشتری، توتا، توپ، تماچا، تیار، کو 'طیار'' بھی لکھتے ہیں۔ ہم کو تیار اختیار کرنا چاہیے۔ سوائے اس کے کہ یہ لفظ ''اڑنے والا'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہو۔

9. کچھ اور لفظ

بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ وہ صحیح لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا غلط املا بھی ایک حد تک رائج ہو گیا ہے۔ ان میں سے چند خاص توجہ کے قابل ہیں۔

صحیح املا	معنے	غلط املا
ازدحام	ہجوم، بھیڑ	اژدھام، اژدہام، اژدحام
اسراف	فضول خرچی	اصراف
تباشیر	بنس لوچن	طباشیر
تریاق	زہر کا مارگ	طریاق
تلاطم	سمندر یا دریا کا تھپیڑے مارنا	طلاطم
توتا		طوطا
دوات	روشنائی کا برتن	داوات
عوض	بدلا	عیوض
مرہم	زخم کی دوا	ملہم
مُسرف	فضول خرچ آدمی	مصرف
مع	ساتھ۔ سمیت	معہ

دوسرا باب: زبان اور بولی

ابتدائیہ

زبان سے متعلق سائنسی تلاش وتحقیق لسانیات کا موضوع ہے۔زبان انسانی جذبات واحساسات کے ابلاغ وترسیل کا نام ہے جسے مخصوص لسانی گروہ استعمال کرتے ہیں۔زبان ابلاغ وترسیل کی مختلف سطحوں پر مختلف رنگ اختیار کرلیتی ہے اور یہی مختلف رنگ شخصی بولیوں (idiolects) جغرافیائی بولیوں (Local dialects) یا سماجی بولیوں (Social dialects) میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔زبان، جب کسی ذمہ دار ادارہ کی قبولیت حاصل کرنے کے بعد ادبی سطح پر استعمال ہوتی ہے تو اسے معیار مل جاتا ہے۔اپنے لسانی حلقۂ اثر میں یکساں قبولیت زبان کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔زبان کے برعکس بولیاں جغرافیائی حد بندیوں اور مختلف سماجی سطحوں پر بولی جاتی ہیں۔افہام وتفہیم Mutual intelligibility بولیوں میں ہم لسانی رشتہ کی بنیاد ہے۔ یہ رشتہ کثرت میں وحدت کا رشتہ ہے۔

اردو معیاری زبان کے لحاظ سے دلّی اور لکھنؤ دو مراکز میں منقسم ہے۔دکنی، گجری، بمبئی کی اردو، تامل ناڈ کی اردو وغیرہ مختلف ذیلی بولیاں اردو کی علاقائی بولیاں ہیں۔بازاری اردو، کرخنداری اردو، عورتوں کی زبان اور مختلف پیشہ وروں کی بولیاں جن کے مختلف رنگ مختلف پیشوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اردو کی سماجی بولیوں کے ذیل میں آتے ہیں۔اردو کی

علاقائی بولیاں مثلاً دکنی، بمبئی کی اُردو، میسوری اُردو وغیرہ علاقائی زبانوں کے اثرات کے تحت بنیں۔

کتاب کے اس حصے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا مضمون ''زبان: آغاز، ماہیت اور تشکیل''جو''ہندوستانی لسانیات'' سے ماخوذ ہے زبان کے عام ارتقا اور تشکیل سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی آغاز نطق سے اردو تک کی عہد بہ عہد دلچسپ کہانی سنائی ہے۔ دکنی زبان پر پروفیسر عبدالقادر سروری کا توضیحی مطالعہ اردو کی معروف بولی کا بھرپور مطالعہ ہے۔ بمبئی کی اردو، میسوری اُردو بھی دراصل دکنی ہی کے دائرۂ اثر کی بولیاں ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا مقالہ ''عورتوں کی زبان'' اردو کی ایک اہم سماجی بولی کا مطالعہ ہے جو مخصوص اخلاقی اقدار کے پیش نظر جنس کی بنیاد پر علاحدہ بولی میں رونما ہوئی۔ عورتوں اور مردوں کی زبان کا یہ فرق اردو میں لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ اور خاص طور سے محاوروں کی بنیاد پر ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ''زبان اور بولی'' کے لسانیاتی رشتہ سے بحث کی ہے، جو خود بہت کارآمد ہے۔

زبان: ماہیت، آغاز اور تشکیل

زبان خیالات کا ذریعہ اظہار ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور اُن کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکاتِ جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لیے خاص خاص زبان بولنے والوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ماہرین لسانیات زبان کی تعریف کرتے وقت اسی جملے پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ خیالات کو خوبی کے ساتھ دوسروں پر واضح کر دینے کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ یہ مقصد تو اور ذریعوں سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ مثلاً حرکاتِ جسمانی یا اشارہ جن سے گونگے یا وہ لوگ اپنا مطلب ادا کرتے ہیں جنھیں کسی غیر زبان بولنے والی قوم سے سابقہ پڑتا ہے۔ اگر آپ جانے کے ارادے سے کرسی سے اُٹھیں اور آپ کا دوست ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کرے تو کیا اشارہ اس جملے کی نیابت نہیں کرے گا کہ ''بیٹھیے'' اور اگر آپ اپنا سر یا مونڈھے ہلا دیں تو کیا آپ کا دوست بغیر کہے نہیں سمجھ جائے گا کہ آپ کو بیٹھنے سے انکار ہے؟ فرانسیسی افراد اپنے اشاروں یا حرکات جسمانی سے وہ کچھ سمجھا دیتے ہیں جو ہم ان کے جملوں سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔

دوسرا ذریعہ جس سے ایک انسان دوسرے پر اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے نقش کاری اور مخطوطہ اشارے ہیں جو مختلف موقعوں پر مستعمل ہوتے ہیں اور خاص گونگوں اور سیاحوں کو مدد دیتے ہیں۔ لیکن محض ان کی مدد جملہ انسانی کاروبار کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیالات کی ترجمانی کے لیے نطق یا قوتِ گویائی ہی ایک مکمل ترین اور سب سے زیادہ واضح ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور اِس بنا پر یہ مقولہ عام طور پر رائج ہو گیا ہے کہ ''قوتِ گویائی ہی انسان اور حیوان کے درمیان باعثِ امتیاز ہے۔''

پس زبان کی واضح تعریف اِن الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دُہرا سکتا ہے۔

''انسانی خیالات اور احساسات کے لیے زبان کیونکر پیدا ہوئی۔'' یہ مسئلہ معرکۃ الآرا ہے اور نہایت دلچسپ۔ زبان کے آغاز یا دوسرے الفاظ میں دنیا کے اہم لسانی خاندانوں کے آغاز پر تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے آج بہت کم مواد موجود ہے کیونکہ بعد کے زمانے کے حالات اور ارتقائی واقعات نے ابتدائی شکلوں پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا ہے جن کا دور کرنا عہد حاضر کے محققین کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کی مختلف لسانی شاخیں اپنی جدا جدا اور آزاد خصوصیتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ انھیں ایک ابتدائی خاندان کے مشتقات قرار دینا آج قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مختلف اور جدا جدا نسلوں کے قسم قسم کی خصوصیتیں رکھنے والے افراد میں ایک ہی فطرتِ انسانی کام کر رہی ہے، تو پھر یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مختلف السنہ ہی ایک ابتدائی زبان یا ایک ہی ابتدائی قبیلہ کی بولی سے متفرع ہوئی ہیں۔

زبان کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ وہ صرف انسان ہی کو حاصل ہے اور جاہل سے جاہل بلکہ وحشی سے وحشی قبیلوں کے انسان بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے حیوانات خواہ ان کی فہم و استعداد کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ امتیاز ظاہر کرتا ہے کہ تکوینِ عالم

کے وقت پروردگار نے اسی طرح ہم میں بات چیت کرنے کی اہلیت پیدا کی جیسا کہ اس نے ہم میں سانس لینے، چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی قابلیت عطا کی۔ یہاں سوال صرف اس قدر باقی رہ جاتا ہے کہ آیا ہم نے اس طرح گفتگو کرنا شروع کر دیا، جس طرح سانس لینے لگے تھے۔ یا جیسا کہ ہمارے جسم میں خون دورہ کرنے لگا تھا، یا اس طرح جیسے کہ ہم حرکت کرنے، یا کھاتے پیتے یا اپنے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے طریقۂ کار میں ہماری مرضی اور ارادے کو دخل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے کام انسانی طبعی قوتوں کے بالا رادہ استعمال کے نتیجے ہیں جن میں ہم خدائے تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی قابلیتوں کے ذریعے اور مدد سے اپنی فطری احتیاجات کا تقذیہ کرتے ہیں۔

ماہرین السنہ کا زیادہ تر رجحان اسی آخری طریقہ کار کی طرف ہے کیونکہ زبانیں آج اتنی مختلف نہ ہوتیں اگر بولنے والے اپنی جدا جدا ضرورتوں اور اہلیتوں کے مطابق خود ان میں ترقی اور تغیر و تبدل نہ کرتے۔ اس کے علاوہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس طرح غیر ارادی طور پر سانس لینے لگتا ہے اسی طرح گفتگو نہیں شروع کر دیتا۔ اگر چہ اس میں پہلے ہی سے پروردگار نے گفتگو کرنے کی قابلیت ودیعت کر دی ہے۔

غرض انسان میں کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعت الٰہی ہے مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیات کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔

زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے اور زبان کی تقسیم ملفوظ آوازوں کے علاوہ انسانی خیالات اور احساسات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فہم انسانی اور نطق انسانی کے نفسیاتی قوانین بھی ایک دوسرے سے بالکل متعلق ہوتے ہیں۔

زبان اور انسانی سوچ بچار کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ سوچنا دراصل اپنے ذہن میں گفتگو کرنا ہے اور زبان اس اندرونی گفتگو کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کو شکل پہناتی ہے۔ خاص خاص ذہنی اشاروں کے ذریعے سے معین کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کو آسان بھی بناتی ہے۔ موہوم ذہنی پیکر تراشیوں کو واضح اور معین کرنا کچھ کم خدمت نہیں ہے۔

کسی شخص کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کے خیالات کو جوں کے توں ظاہر نہیں کر دیتے بلکہ انھیں ایک شکل کے توسط سے نامکمل اور عمومی حالت میں پیش کرتے ہیں۔ کسی لفظ یا فقرے کے سمجھ لینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لفظ یا فقرہ جس چیز کی ترجمانی کرتا ہو اس کی ایک ہو بہو شکل نظروں کے سامنے آ گئی بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سمجھنے والا ان تمام گونا گوں رجحانات سے واقف ہو گیا یا ان کی نسبت اس میں ایک طرح کی بیداری کا احساس پیدا ہو گیا جو ان اشیا کا دیکھنا یاد دلاتے ہیں جن کی الفاظ یا فقرے نے ترجمانی کی ہے۔

اگر لفظوں کی تشکیل کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے ارادے کی پیداوار ہوں یا خود ہی کسی وجہ سے بن گئے ہوں، ہر حال میں انسانی ذہن اور قوت متخیلہ نے ان کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کسی چیز کے نام کے لیے ایک ایسا لفظ یا اس کے مشتقات استعمال کیے جاتے ہیں جو پہلے اس سے کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی چیز کے لیے اختیار کیے گئے تھے۔ یہ فعل اس واقعہ کا نتیجہ ہے کہ انسانی دماغ میں اس شے کے دیکھنے کے بعد گزشتہ کی ایک ایسی شکل منعکس ہو جاتی ہے جس کو اس نے کچھ نہ کچھ نام دے رکھا تھا اور اس انعکاس کے ساتھ ہی اس کے متعلق کوئی لفظ بھی ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ابتدائی نام سے زیادہ دور نہیں ہوتا۔ فارسی اور اردو الفاظ ''نے'' اور ''بانسلی'' جو ایک خاص آلہ موسیقی کے نام ہیں اس نباتی اشتراک اصلیت کا نتیجہ ہیں جو جنگل کی نے اور بانس کے ساتھ ان مخصوص اصطلاحوں کو حاصل ہے۔

اسی قسم کی لفظی تشکیل میں ''بسمل'' اور ''سبحہ'' جیسے الفاظ بھی شامل ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنا اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرنا ان خاص ناموں کی تخلیق کا باعث ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزوں کے نام ابتدا میں اپنے وطن یا اپنے بانی کے نام کی نسبت سے تخلیق پاتے ہیں۔ اگرچہ آج انھیں زبان میں ایک بالکل آزاد حیثیت حاصل ہے۔ ''مصری'' جو شکر کی ایک خاص قسم یا شکل کا نام ہے۔ یا ''چینی'' جو ایک طرح کا مرکب ہے جس سے برتن بنتے ہیں۔ یا ''طفیلی'' وہ شخص جو کسی کے ساتھ بن بلائے مہمان چلا جاتا ہے اور اس طرح کے سینکڑوں اردو لفظ اسی قسم کی لفظی تشکیل کے تحت عالم وجود میں آئے۔

یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ تشکیل الفاظ میں انسان کے گزشتہ اور موجودہ ہر طرح کے خیالات کا تعلق کس قدر اہم ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لفظ اپنی پیدائش کے لحاظ سے انسان کا ایک خود اختیاری یا روایتی اشارہ ہے جس سے واقف ہوتے ہی کسی شخص کے ذہن میں وہی خیال یا خیالات رونما ہو جاتے ہیں۔ جن کو وہ شخص عادۃً یا وراثۃً اس لفظ کے سننے کے بعد پیدا کرتا رہتا ہے مگر عام ذہنوں میں جو خیال یا تصور کسی لفظ کے سُننے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ معین اور تفصیلی نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عالم یا ماہر لسانیات کی نظر میں لفظوں کی صرفی ونحوی ترکیب، ان کی معنوی وسعت یا محدودیت یا ان کی تاریخی اور ارتقائی حالت کے لحاظ سے ان کے معنی خاص اور معین ہوں مگر عام طور پر الفاظ اپنی انفرادی حالت میں نامکمل ہوتے ہیں اور جب وہ جملوں یا فقروں میں منسلک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی قدر و قیمت اور ان کی پیش کی ہوئی ذہنی تصویریں بالعموم نسبتی اور غیر معین ہوتی ہیں۔ غرض لفظ اور خیال کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ استوار اور یکساں نہیں ہوتا۔

دُنیا کی کسی زبان میں نہیں دیکھا گیا کہ کوئی ایک لفظ ہمیشہ کے لیے صرف کسی ایک ہی خیال کے لیے وقف ہو گیا ہو۔ تمام الفاظ اپنی قدر و قیمت میں موقع ومحل کے لحاظ سے تبدیلی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اکثر دفعہ ایک ہی لفظ اپنے ماسبق اور مابعد کے لفظوں کی تبدیلی کی وجہ سے اپنا مفہوم بالکل بدل دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ صرف لفظ ''قطعہ'' کو لیجیے اور دیکھیے کہ ایک شاعر اس کا کیا مفہوم لیتا ہے اور گاؤں کے پٹیل، پٹواری یا کسی ہراج کرنے والے ایجنٹ کے یہاں اس کے کیا معنی ہیں اور کسی خوشنویس کی نظر میں وہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ کسی کو اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قطعہ کے معنی ہیں ٹکڑے کے۔ مگر معنی بتاتے وقت بہت کم حضرات اس وسیع فرق کو محسوس کرتے ہیں جو یہی لفظ ذیل کے تین مختلف جملوں میں پیدا کرتا ہے۔

1۔ زمین کا یہ قطعہ فروخت ہو گیا
2۔ شادی کی مبارکباد ایک فصیح و بلیغ قطعہ کی شکل میں تحریر کی
3۔ قدیم عہد کا ایک پاکیزہ قطعہ کمرہ کی زینت تھا

ظاہر ہوا کہ الفاظ میں اس امر کا رجحان ہر وقت موجود ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی، فنی، عادتی، شخصی اور قومی، غرض ہر نئی فضا میں ایک نیا مفہوم واضح کریں۔ ایک ہی لفظ ایک ہی قسم کا معیارِ زندگی رکھنے کے یہاں ایک معنی دیتا ہے اور دوسرے کے یہاں دوسرا۔ مثلاً اردو کے ایک فعل ''اتارنا'' پر غور کیجیے۔ معلوم ہوگا کہ جتنے قسم کے آدمی ہیں اور جتنی طرح کے کام کرتے ہیں اتنے ہی مختلف پہلو اس خیال میں موجود ہیں جو لفظ ''اُتارنا'' کے ملفوظ ہونے کے بعد کسی شخص کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا حسب ذیل افعال میں لفظ ''اتارنا'' سے ہر جگہ ایک ہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے؟

چربہ اُتارنا، کپڑے اُتارنا، نقل اُتارنا، دیوار اُتارنا، سواریاں اُتارنا، قبر میں اُتارنا، جُھنڈ اُتارنا، رجسٹر میں نشان اُتارنا۔

غرض زبان کی تشکیل اور اُس کے مفہوم کا تغیر و تبدل منحصر ہوتا ہے خیالات پر اور جیسے جیسے خیالات میں تبدیلی یا کمی بیشی ہوتی ہے۔ اُسی مناسبت سے زبان کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔

آغازِ نُطق سے اُردو تک

انسان ارتقائے حیات کی آخری کڑی ہے۔ انسان کو حیوانات کے مقابلے میں کچھ ایسی جسمانی فضیلتیں میسر ہیں جن کی دستگیری سے وہ فطرت کی تسخیر اور تمدن کی چمن بندی کر سکا۔ جانوروں کے برخلاف انسان سیدھا کھڑا ہو کر چلتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دونوں ہاتھ حرکت و عمل کے لیے آزاد رہتے ہیں۔ انھیں ہاتھوں سے انسان نے مادّی تہذیب کی عمارت تعمیر کی اور اس کے کنگروں کو آسمان تک پہنچایا۔ انسان کی دوسری فضیلت اس کی قوتِ نطق میں ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے، یعنی انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز یہی صلاحیت نطق ہے۔

انسان نے گویائی کی نعمت کیونکر حاصل کی اور انسان کی پہلی زبان کیا تھی، یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں متعدد سنجیدہ اور غیر سنجیدہ نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کو ہم مذہب کی آنکھ سے دیکھیں تو معاملہ بالکل سادہ ہے۔ مذہبوں کے مطابق زبان کی اصل الوہی اور آسمانی ہے۔ ہر مذہب کسی نہ کسی حد تک اپنی زبان کو تقدیس میں رچا بسا دیتا ہے۔ ہندوؤں کے مطابق وید ایشور کا قول ہیں اور سنسکرت دیو بانی ہے۔ بودھوں کے مطابق پالی زبان ازلی زبان ہے۔ بعض کا تو یہاں تک عقیدہ ہے کہ اگر بچّہ کو کوئی زبان نہ سکھائی جائے تو وہ پالی بولنے لگے۔ جینیوں کے مطابق مہابیر سوامی کا اردھ ماگدھی زبان کا وعظ نہ صرف انسانوں بلکہ ہر

قسم کے حیوانوں کے لیے قابل فہم تھا۔ یہودیوں کے مطابق عبرانی آدم کی اصل زبان ہے اور اگر مینار بابل کی لعنت نہ حادث ہوئی ہوتی تو آج ساری دنیا میں محض عبرانی کا سکہ رواں دواں ہوتا۔ قرآن شریف کے مطابق خالق نے حضرت آدم کو اشیا کے نام سکھائے جس سے فرشتے نا آشنا تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کلام مجید ہے۔ یعنی عربی آسمانی زبان ہے۔

جدید علوم ہر مسئلہ کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ آج کسی بات کا صحیفہ میں لکھا ہونا کافی نہیں۔ آج ہر دعوے کو تعقل کی آنچ پر پرکھا جاتا ہے۔ علم لسان بھی زبان کے آغاز کو سائنس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حیوان و انسان کو ارتقا کی مختلف کڑیاں سمجھتا ہے۔ ماہرین بشریات نے قدیم ترین انسانی ڈھانچوں کی کھوج کی اور ان کی قدامت کا تعین کیا۔ کچھ عرصہ پہلے جاوا میں پایا گیا انسانی ڈھانچہ قدیم ترین تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا زمانہ دس تا 15 لاکھ قبل تعین کیا گیا تھا۔ اِدھر دو تین سال پہلے افریقہ میں ایک انسانی ڈھانچہ ملا جس کا زمانہ پندرہ لاکھ تا ساڑھے سترہ لاکھ سال قبل قرار دیا گیا ہے۔ یہ ڈھانچے بن مانس اور انسان کے بین بین دکھائی پڑتے ہیں۔ گویا بنی نوع انسان کی عمر سولہ سترہ لاکھ سال کی ہے۔ لیکن تہذیب انسانی اس کے مقابلے میں بہت کمسن ہے۔ لاکھوں سال تک انسان محض شکار کر کے رزق حاصل کرتا رہا۔ بعد میں اس نے مویشی پالنے شروع کیے اور ان کے دودھ اور گوشت پر زندگی بسر کرنے لگا۔ گزشتہ 35 سے لے کر پچاس ہزار سال قبل میں آگ کی دریافت ہوئی جس نے انسان کو پکے ہوئے کھانے سے آشنا کیا۔ 25 سے لے کر 35 ہزار سال قبل تک شمالی اور وسطی یوریشیا برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ گلیشیر قطب شمالی کی جانب سے مراجعت کر گیا۔ اب انسان خانہ بدوش گلہ بانی سے کاشتکاری کی منزل میں داخل ہوتا ہے اور اُس وقت سے گویا موجودہ انسانی تہذیب کی ابتدا ہوتی ہے۔ زراعت کی دریافت کو مشکل سے دس ہزار سال ہوئے ہوں گے۔

انسان کی اس پس ماندہ تاریخ کے پسِ منظر میں زبان کے آغاز کے بارے میں کئی نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق انسان نے حیوانوں کی آوازوں سے الفاظ اخذ کیے۔ چنانچہ آج بھی ہر زبان میں ایسے کچھ الفاظ مل جاتے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں کوئل کے لیے ککو اور مرغ کے لیے کاک، ہندوستانی میں بھونکنا، ہنہنانا، غرّانا، ممیانا، میاؤں وغیرہ۔ لیکن

افسوس کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہیں۔ دوسرا نظریہ اس سے بھی کمزور ہے۔ شدید جذباتی حالت یعنی درد، غم، غصہ، شادمانی، وغیرہ کی حالت میں انسان کے منہ سے بعض فجائیہ کلمے نکل جاتے ہیں۔ یہ اضطراری آوازیں ہی زبان کا تخم اوّل ہیں۔ مثلاً ہائے۔ وائے۔ آہ۔ واہ۔ اُف۔ اوہ۔ اہو ہو۔ انگریزی میں پوہ پوہ۔ لیکن ایسے الفاظ کی تعداد پہلی قسم کے الفاظ سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں میں اس قسم کے الفاظ مختلف ہیں۔ سب سے زیادہ لچر نظریہ ہے کہ محنت کش انسان اپنے کام کے دوران میں کچھ نعرے بپا کرتے ہیں۔ مثلاً بھاری چیزوں کو سرکانے والے''ہیا ہیا'' دھوبیوں کا چھیو چھیو۔ یورپی ملاحوں کا یوہی یو۔ انھیں الفاظ نے زبانوں کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان میں ایسے الفاظ چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ چوتھے نظریے کے مطابق انسان نے اپنے اردگرد کی غیر ذی روح اشیا کے شور کی نقل کی۔ اس قسم کے الفاظ کی تعداد کافی ہے۔ مثلاً اردو میں کھٹ کھٹ، کھڑ کھڑ (پیڑ سے پتا گرنے کی آواز) ٹن ٹن۔ بادل کا گڑگڑانا، گرج، گونج، پانی کا چھل کرنا، انگریزی میں صوت اور مفہوم کی ہم آہنگی کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب نظریے چند الفاظ کی اصل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن ان مخصوص الفاظ سے کوئی عمومی نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ ان سے زیادہ دلچسپ یہ نظریہ ہے کہ ایک لسانی گروہ نے مختلف اشیاء کے بارے میں باتفاق رائے یہ طے کیا کہ فلاں چیز کو فلاں نام دیا جائے۔ یہ نظریہ زبان کی توسیع کی تاویل کرسکتا ہے۔ زبان کے آغاز کی نہیں۔ کیونکہ چیزوں کا نام رکھنے اور طے کرنے کے لیے بھی کسی زبان کی ضرورت ہے۔

جرمنی کے پروفیسر ہیز کی رائے میں ابتدا میں انسان میں ایک ایسی صلاحیت تھی جس کے بل پر اس نے چار پانچ سو مادّے تخلیق کیے۔ بعد میں وہ صلاحیت جاتی رہی۔ مشہور مستشرق میکس ملر نے اس نظریے کی شرح کی۔ اس کے مطابق یہ مادّے ایک رکن پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس نے مثال کے طور پر ایک مادہ 'بار' کا ذکر کیا۔ اس کے معنی ہیں لے جانا۔ اس سے انگریزی لفظ bier,burden,birth,bear, (مردہ انسان کو لے جانا) barrow بنے۔ bear کے معنی تولید بھی قرار پائے۔ اس لیے زمین سے پیدا ہونے والے ایک اناج کو barlay کہا گیا۔ اس سے

born بنا۔ لاطینی میں 'بار' کی شکل feree تھی۔ اس مادہ کو انگریزی میں لے کر متعدد الفاظ conference, deference, difference, fertile, reference وغیرہ بنائے گئے ۔فارسی میں یہ مادہ ''بار'' اور ہندوستان میں بھار (بوجھ) تھا۔اس طرح ایک مادہ میں سابقے، لاحقے لگا کر انگریزی کے سو سے اوپر الفاظ تعمیر ہو سکتے ہیں۔میکس ملر کے مطابق تمام انگریزی الفاظ کی اصل 460 مادے ہیں۔قدیم سنسکرت قواعد نویسوں نے سنسکرت جیسی عظیم زبان کے تمام الفاظ کو 1706 مادوں کی فروعات قرار دیا تھا۔میکس ملر کے مطابق اب انھیں اور کم کر کے محض 587 تک محدود کیا جا سکتا ہے۔اس نظریہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ دنیا میں ایسی بھی زبانیں ہیں جن میں مادہ اور مشتق کا سوال ہی نہیں۔مثلاً چینی زبان میں ہر لفظ مطلق اور جامد حیثیت رکھتا ہے۔ایک لفظ سے کوئی دوسرا لفظ نہیں بنایا جا سکتا۔اس طرح مادوں کا نظریہ باطل ہو جاتا ہے۔پھر یہ اور بھی غور طلب ہے کہ ابتدا میں انسان نے چار پانچ سو مادے کیونکر اختراع کیے۔زبان کے نقشِ اوّل کی کھوج ہی تو اصل مسئلہ ہے۔

امریکی ماہر لسانیات یسپرسن نے زبان کے مسئلہ پر غور کر کے ایک بہتر نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق زبان کی ابتدا خیالات کی ترسیل اور ابلاغ کے لیے نہیں ہوئی، بلکہ جوش اور جذبات کو ہلکا کرنے کے لیے۔غیر متمدن انسان زیادہ جذباتی اور رومانی تھا۔وہ جذبات میں سرشار ہو کر بے معنی نغم فقرے گاتا اور گنگناتا تھا۔یہ موزوں فقرے رقص کے ساتھ بھی گائے جاتے تھے۔ آج بھی بچے بہت سے مہمل الفاظ اور فقرے وضع کر لیتے ہیں۔لیکن یہ فقرے بیشتر موزوں اور خوش آہنگ ہوتے ہیں۔یسپرسن نے مثال کے طور پر لکھا ہے کہ فرض کیجیے کہ ایک وحشی انسان نے ایک جانور کا شکار کیا اور خوشی کے ترنگ میں اُچھل کر ایک نعرہ لگا یا ترارا بوم دے (tarara-boom-de-ay) اس کے ساتھیوں نے اس آواز کو دہرایا اور وہ اس جانور کو یا شکار کے طریقہ یا مرلعا شکاری ہی کو ترارا بوم دے کہنے لگے۔اس طرح متعدد فقرے بنے۔ان فقروں کو بعد میں توڑ کر الفاظ میں تقسیم کر لیا گیا اور ان کو حسب موقع معنی دے دیے گئے۔اس طرح زبان کا آغاز کلام سے ہوا۔کلمہ بعد کی پیداوار ہے۔یہ نظریہ دوسرے نظریوں سے زیادہ معقول اور سمجھ میں آنے والا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ زبان کے آغاز کا مسئلہ ایک اندھیری کوٹھری میں ٹٹولنے کے مترادف ہے۔ قدیم ترین زبانوں اور آج کے غیر متمدن لوگوں کی زبانوں کا مطالعہ کر کے ہم انسان کی ابتدائی زبان کے خدوخال کے بارے میں ذیل کے اصول قائم کر سکتے ہیں اور بس:۔

1۔ ابتدائی زبان میں کئی آوازیں خاصی پیچیدہ اور مشکل سے ادا ہونے والی تھیں۔

2۔ الفاظ بہت طویل ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک جملے کے تمام الفاظ کو مخفف کر کے ایک جگہ ملا دیا جاتا تھا۔

3۔ تکلّم میں ترنّم کا غلبہ تھا۔ گویا وحشی انسان بولتا نہیں گاتا تھا۔

4۔ مادّی اور ٹھوس چیزوں کے لیے الفاظ تھے۔ لیکن مجرّد تصوّرات، اوصاف وغیرہ کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

5۔ ایک لفظ وسیع مفہوم پر دلالت کرتا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ معنی میں تخصیص امتیاز اور نزاکت کا اضافہ ہوتا گیا۔

غیر متمدّن زبانوں کے افلاس کی دل چسپ مثال یہ ہے کہ ریڈ انڈین قبیلہ چیرو کی زبان میں سر دھونے، ہاتھ دھونے اور جسم دھونے کے علاحدہ علاحدہ الفاظ ہیں لیکن محض دھونے کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ تسمانیہ (آسٹریلیا کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ) کی زبانوں میں مختلف پیڑوں کے نام ہیں لیکن پیڑ کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ جنوبی افریقہ کی زولو زبان میں لال گائے، سفید گائے، کالی گائے کے لیے علاحدہ علاحدہ لفظ ہیں۔ لیکن صرف گائے کے لیے کوئی لفظ نہیں۔

بعض مذاہب کا یہ عقیدہ کہ ان کی مخصوص زبان ازلی یا دہبی ہے۔ قابلِ تسلیم نہیں۔ زبان ایک اکتسابی ملکہ ہے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق مصر کے بادشاہ سمٹیکس نے تجربہ کیا کہ انسان کی فطری زبان مصری ہے یا فرتجین (pheygian) اس نے دو بچوں کی پرورش جنگل میں کرائی۔ ان کے نگہبانوں کو حکم تھا کہ ان کے سامنے ایک لفظ نہ بولیں۔ بڑے ہونے پر بچّوں کو دربار میں لایا گیا تو ان میں سے ایک بچّہ نے لفظ بیکوس (Bekos) کہا، جس کے معنی فرتجین میں روٹی کے ہیں۔ اس واحد لفظ کے علاوہ وہ محض غوں غاں کرتے تھے۔ اس لفظ

کی بنا پر طے پایا کہ فریجین قدیم ترین زبان ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک ملازم نے بچے کے سامنے غلطی سے ایک بار یہ لفظ بول دیا تھا۔ اکبر نے بھی اس قسم کا ایک تجربہ کیا تھا۔ وہاں بھی بچے حیوانات کی طرح شور وغوغا کرتے تھے۔ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ جو بچے پیدائشی بہرے ہوتے ہیں وہ گونگے بھی ہوتے ہیں۔

ماہرین لسانیات میں اس پر بھی اتفاق نہیں کہ ابتدا میں بیک وقت کئی زبانیں وجود میں آئیں یا محض ایک زبان جس نے بقیہ تمام زبانوں کو جنم دیا۔ آج دنیا میں زبانوں کے متعدد خاندان ہیں جن کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں۔ متعدد ایسی زبانیں ہیں جن کا کسی دوسری زبان سے کوئی رشتہ قائم نہیں کیا جاسکا۔ بعض اوقات دور دراز کی ایسی دو زبانوں میں جن میں کسی میل جول کا امکان نہیں، بعض مشترک قواعدی خصوصیات مل جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد نہیں۔ یعنی کرۂ ارض پر انسانی زبان کا آغاز کسی ایک جگہ پر نہیں بلکہ کئی جگہوں پر ہوا۔

دنیا کی زبانوں میں سب سے اہم ہند یورپی خاندان ہے۔ جس کے تحت یورپ ایران، افغانستان اور ہندوستان کی زبانیں (دراوڑی اور آسٹرک زبانوں کو چھوڑ کر) آتی ہیں۔ ان کے بولنے والوں کے مورث آریوں کا اصلی وطن کیا تھا، اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ جرمنی اور ہندوستان کے درمیان کے ہر خطے کو کسی نہ کسی عالم نے یہ شرف بخشنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ معقول مسلک پروفیسر شریڈر کا بیان ہے جن کے مطابق آریوں کا وطن بحر اخضر کے شمالی ساحل پر والگا ندی کے دہانے کے قریب تھا۔ ابتدائی ہند یورپی زبان کی تمام اصوات کو ترتیب دی گئی ہے۔ اور سنسکرت اوستا (قدیم فارسی) اور یونانی کا مقابلہ کر کے اصل ہند یورپی کے سات آٹھ سو الفاظ بھی دریافت کر لیے گئے ہیں۔

آریہ 500 ق م کے قریب ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کی زبان کے نمونے ویدوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ آخری وید 1000 ق م تک مرتب ہو چکا تھا۔ ویدی زبان سنسکرت کا نقش اول ہے۔ لسانی ارتقا کا ایک اٹل اصول ہے کہ تحریری زبان کی نسبت تقریری زبان کہیں زیادہ ترقی پسند یعنی تغیر پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ تقریری زبان آگے نکل جاتی ہے اور کتابی خصوصاً

ادبی زبان قدامت پسند، جامد، فرسودہ ہوکر عوام کے محاورے سے بچھڑ اور پچھڑ جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں پانچ پانچ سو سال کے وقفے کے بعد ادبی زبان کو مصنوعی اور مردہ قرار دے کر گدی سے اُتار دیا گیا اور اس کی جگہ عوام کی تقریری زبان کو جواب ایک نیا روپ اختیار کر چکی تھی اس علاقے کی معیاری زبان تسلیم کیا گیا۔ اس طرح تقریباً پانچ سو سال میں ہندوستان کی زبان بدلتی رہی۔

ویدی زبان سادہ زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی تقریری زبان تھی۔ 1000 ق م کے بعد اسے مرصّع اور شائستہ بنا دیا گیا اور اس کا نام سنسکرت (مہذّب) قرار پایا۔ اس میں رامائن اور مہابھارت جیسے رزمیے تخلیق کیے گئے۔ 500 ق م کے قریب معلوم ہوا کہ ملک کی تقریری زبان کتابی سنسکرت نہیں بلکہ وہ ہے جسے پالی کا نام دیا گیا۔ اُسی زمانے میں سنسکرت کا مشہور قواعد نویس مہاتما، پانی نی، ہوا ہے۔ جس نے سنسکرت جیسی پیچیدہ زبان کے پکّے اٹل اور جامع قواعد تیار کیے۔ ان قواعد میں آج تک کوئی ایک نقطہ کا فرق نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ ، پانینی، نے زبان کو اس طرح اصول میں جکڑ بند کر دیا کہ اس کے ارتقا کی راہیں مسدود ہو گئیں اور وہ مردہ ہو گئی۔ یہ غور طلب بات ہے کہ جو سنسکرت 500 ق م اور اس کے بعد قوم کی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکی وہ آج کے معاشرے کے لیے کیونکر کافی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس کی تاریخی عظمت اور اس کے ادبی خزانوں سے انکار نہیں۔ ہم اس ترکے کے وارث ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آج یہ سرمایہ جیوں کا تیوں ہمارا کام نہیں دے سکتا۔

پالی کو بالعموم بہار کی زبان مانا جاتا ہے لیکن اب یہ کم و بیش طے ہو گیا ہے کہ یہ مدھیہ پردیش کی بھی زبان تھی۔ قدیم ہندوستانی جغرافیہ میں مدھیہ پردیش اس علاقے کا نام تھا جو آج انبالہ، سہارن پور، دلی، گوالیار، الہ آباد وغیرہ سے محصور ہے۔ گوتم بدھ نے پالی میں وعظ کیا۔ اس میں بودھوں کی مذہبی کتابیں ملتی ہیں۔ پانچ سو سال کے عرصے میں یہ بھی عوام کو فراموش کر کے کتابی ہو گئی۔ اس لیے عیسوی سن کی ابتدا تک اسے بھی طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا گیا۔ عیسوی سن کی ابتدائی پانچ صدیوں میں جن عوامی زبانوں کا دور دورہ رہا انھیں پراکرت (فطری خودرو) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے پانچ پراکرت زیادہ مشہور ہیں۔ جن میں سب سے اہم شورسینی پراکرت تھی

جو مدھیہ پردیش کی زبان تھی اور جس کا مرکز متھرا تھا۔ لیکن جو شمالی ہند کی مشترک زبان کا کام دیتی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی تک پراکرتوں پر بھی وہی بپتا پڑی۔ معلوم ہوا عوام کا لہجہ بالکل بدل چکا ہے۔ علما نے اس کے مسخ ہونے پر ماتم کیا۔ عوام کی زبان کو اپ بھرنش (بھرسٹ ہوئی۔ بگڑی ہوئی) نام دیا۔ لیکن بعد میں انھیں علما نے اپ بھرنشوں کو ادب کے لیے استعمال کیا۔ ہر پراکرت کی جگہ اسی نام کی اپ بھرنش نے لے لی۔ نقطۂ نظر کا فرق کہیے کہ عالمانہ غرور کا مظاہرہ۔ زبان کے ارتقا اور تبدیلی کو اصلاح کی بجائے مسخ ہونا کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک گلاس آدھا بھرا ہوا ہے۔ قنوطی اسے دیکھ کر کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے۔ رجائی کہے گا کہ آدھا گلاس بھرا ہے۔ زبان میں الفاظ کا تلفظ بدلتا رہتا ہے۔ احیائی ذہنیت کا شخص کہے گا کہ زبان بگڑ رہی ہے۔ ترقی پسند کہے گا کہ زبان منجھ رہی ہے۔ زمانہ ارتقا پذیر ہے۔ گردشِ ایام پیچھے کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔ علما کتنے ہی چیں بہ جبیں کیوں نہ ہوں۔ زبان کو عوام بدلتے ہیں اور بعد میں خواص اسی عوامی لہجے کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی سے اپ بھرنش میں ادب کی تخلیق ہونے لگی۔ ان میں سب سے اہم اور ملک گیر شورسینی اپ بھرنش تھی 1000 کے قریب اپ بھرنشوں کا بھی وہی حشر ہوا جو ان کے اسلاف کا ہوا تھا۔ ان کی خاکستر سے ہندوستان کی جدید زبانیں پیدا ہوئیں۔

1000 کے بعد تین چار صدیاں تبدیلی کا زمانہ ہیں۔ اس زمانہ میں نئی بولیوں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ چنانچہ ان کی واضح شکل چودھویں پندرھویں صدی میں جا کر ملتی ہے۔ شورسینی اپ بھرنش سے جو زبان پیدا ہوئی اسے لسانیات کی اصطلاح میں مغربی ہندی کہا جاتا ہے۔ یہ پانچ زبانوں پر مشتمل ہے۔ ہریانی یا بانگرو، کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی۔ ان میں سے ہریانی اور کھڑی بولی کے بہت سے الفاظ 'آ' کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً آیا، گیا، چھوٹا، بڑا، لڑکا۔ اور بعد کی تین بولیوں کے ''وْ'' کے اوپر مثلاً آیو۔ گیو، چھوٹو، بڑو، لڑکو، کھڑی بوی کا علاقہ ان اضلاع پر مشتمل ہے۔

دلّی، دہرہ دون کا میدانی علاقہ سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ، ضلع بلند شہر کی تحصیل سکندرآباد، بجنور، مرادآباد، رام پور میں مغربی ہندی میں 'آ' کا لہجہ بھی ملتا تھا اور اُو کا بھی۔ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشیں برج بھاشا تھی۔ اس کی واضح تشکیل پندرھویں صدی عیسوی میں ہوتی ہے۔ دسویں

سے چودھویں صدی تک کھڑی بولی کے جستہ جستہ نمونے ملتے ہیں۔ مستقل تصانیف نہیں ملتیں۔
چودھویں صدی کے بعد اردو میں دکنی ادب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی زمانے میں لودیوں نے ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی سے آگرہ تبدیل کر دیا۔ جس کی بدولت برج بھاشا سارے شمالی اور وسطِ ہند کی مشترک معیاری زبان کا رتبہ پا گئی۔ شاہ جہاں نے اپنے دورِ حکومت میں دارالسلطنت پھر دلی میں منتقل کر دیا۔ اس تاریخی واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ برج بھاشا پسپا ہو گئی اور کھڑی بولی جسے کوئی منہ نہ لگاتا تھا، ہندوستان کی مشترکہ زبان بن گئی۔

ہندوستان کی زبانوں کے اِس تاریخی پس منظر کے ساتھ ہم اردو کی اصل کا تعین صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر لسانیات کے چند اصولوں کو دہرا دینا بے موقع نہ ہوگا۔

1۔ تاریخ کے وسیع وعریض ماضی میں کوئی بالکل نئی زبان وجود میں نہیں آئی۔ قدیم زبانوں کی شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ ان کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ ان کے روپ بدلتے رہتے ہیں۔

2۔ زبان[1] کے دو عناصر ہوتے ہیں۔ ایک بنیادی اور اہم، دوسرا غیر اہم فعل اور اس کے اشتقاق کے قاعدے، حرفِ جار، ضمائر بنیادی عناصر ہیں۔ اشیا کے نام یعنی اسم اور صفت کم اہم ہیں۔ قوموں کے میل جول کے ساتھ زبانوں کا میل جول اور لین دین ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ میل جول بنیادی عناصر میں نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ بیشتر اسم وصفت تک محدود رہتا ہے۔

3۔ اوپر کے دونوں اصولوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دو زبانیں مل کر تیسری زبان وجود میں نہیں آسکتی۔ نیلے اور پیلے رنگ کو ملانے سے ہرا رنگ بن سکتا ہے۔ دال اور چاول کو ملانے سے کھچڑی بن سکتی ہے۔ لیکن دو زبانوں کے ارتباط سے کوئی تیسری نئی زبان نہیں بن سکتی وہ اپنی پیش رو دو زبانوں میں سے کسی ایک کا اور محض ایک کا روپ ہوگی۔ فرہنگ الفاظ سے زبانوں کے رشتے کے بارے میں صحیح رہنمائی نہیں ہو سکتی۔

اردو والوں میں یہ نظریہ آیت وحدیث بن کر رہ گیا ہے کہ اردو ایک طرف عربی فارسی تو دوسری طرف ہندی یا برج بھاشا کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ مغربی ہندی کی بولیوں کا تجزیہ کرنے سے واضح ہو گیا تھا کہ اردو اور ہندی کی کوئی علاحدہ حیثیت نہیں۔ دونوں کی تہ میں وہی کھڑی بولی

---

[1] دوسرے اور تیسرے اصول کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو "داستانِ زبانِ اردو" از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ دوسرا باب

ہے۔اس میں اگر تقریباً تمام سنسکرت الاصل الفاظ رہتے ہیں اور ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو ہندی کہلاتی ہے اور اگر دیسی الفاظ کم کر کے ان کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور فارسی سے ماخوذ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔ ہندی کی نسبت اردو میں فارسی کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو ایک ملغوبہ یا دوغلی زبان ہے۔عربی فارسی الفاظ اردو کا جز و لاینفک نہیں۔اردو کے افعال وحروف، اس کی قواعد تقریباً تمام کی تمام ہندوستانی ہے۔جو لوگ اردو کو باہر کی زبان سمجھتے ہیں ان کو ساکت کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ اردو میں ایسی کتابیں جن میں عربی فارسی کا ایک لفظ نہ آئے لکھی جاسکتی ہیں اور لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس طرح کا ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتے جس میں ہندی کا ایک لفظ نہ آیا ہو۔

اردو میں عربی فارسی الفاظ کی اتنی شدت بھی نہیں جس قدر کہ سمجھی جاتی ہے۔صاحب فرہنگ آصفیہ نے اردو الفاظ کا تجزیہ کیا ہے۔اردو میں کثرت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا ایک جزو ہندوستانی اور دوسرا عربی یا فارسی ہے۔یہ الفاظ ایک زبان کے مادّے پر دوسری زبان کا سابقہ یا لاحقہ لگا کر بناتے ہیں۔مثلاً پہرے دار، رنگیلا، آزمانا، تارگھر، بدلنا۔یہ الفاظ فارسی کے ہیں نہ عربی کے نہ ہندی کے، یہ خالص اُردو ہیں۔یہ اُردو کا سب سے زیادہ قابل قدر اور قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔کیونکہ یہ دو قوموں دو کلچروں کے اتحاد کی صریح نشانی ہیں۔ان کی ترکیب ہندوستان میں ہوئی اس لیے انھیں ہندوستانی الاصل مانا جائے گا۔اس مشاہدہ کے بعد فرہنگ آصفیہ کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔

فرہنگ آصفیہ میں شامل کل الفاظ 54009

(ا)ہندی سنسکرت وغیرہ کے الفاظ 222:3

(ب) خالص اردو الفاظ جن کا ایک جز ہندی ہے 175:5

اِدب کی میزان یعنی ہندوستانی الاصل الفاظ 39708 یا 1/2 73 فی صدی

عربی فارسی ترکی عبرانی الفاظ 3748 یا 1/2 25 فی صدی

یورپی الفاظ 553 یا ایک فی صدی

فرہنگ آصفیہ کی تدوین کے بعد اردو کے ذخیرے میں عربی فارسی الفاظ کے بڑھنے کا تو امکان نہیں' ہندی اور یورپی الفاظ ضرور بڑھے ہوں گے۔اس طرح ہم موٹے طور پر کہہ سکتے

ہیں کہ اردو میں تین چوتھائی الفاظ ہندوستانی اصل کے ہیں اور ایک چوتھائی عربی فارسی کے 25 فی صدی الفاظ کی بنا پر اردو کو باہر کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی ٹیوٹانک یعنی جرمن خاندان کی زبان ہے۔ اور فرنچ لاطینی خاندان کی۔ اس کے باوجود انگریزی میں 60 فی صدی فرنچ کے الفاظ ہیں اور ان کے علاوہ کافی الفاظ دوسری زبان کے ہیں۔ انگریزی نے جیسی دور افتادہ زبانوں کے الفاظ قبول کیے ہیں ویسے کسی اور دوسری زبان نے نہ کیے ہوں گے۔ مثلاً Tobacco,cane ریڈ انڈین زبانوں سے Boomrange آسٹریلیا کے وحشیوں کی زبانوں سے Taboo جزائر بحرالکاہل کی زبان سے، اور Kimono جاپان کی زبان سے ماخوذ ہے۔ کیرالا کی زبان ملیالم تامل کی ایک شاخ ہے لیکن اس میں اسی (80) فی صدی سنسکرت الفاظ ہیں۔ فارسی فرہنگوں میں عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس کے باوجود کوئی نہیں کہتا کہ انگریزی اینگلوسیکسن اور فرنچ سے مل کر، ملیالم تامل اور سنسکرت سے، فارسی اوستائی اور عربی سے مل کر بنی ہے۔

اُردو محض کھڑی بولی کا نام ہے۔ اردو نے شروع سے آج تک صرف کھڑی بولی کو نوازا، ہندی نے دوسری عوامی بولیوں کو بھی اپنے اندر سمو لیا ہے۔ چنانچہ آج ہندی دو معنوں میں مستعمل ہے۔ اپنے مخصوص اور تنگ معنی میں ہندی سے کھڑی بولی ہندی مراد لیا جاتا ہے۔ وسیع معنی میں مغربی ہندی، مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی کی جملہ بولیوں کو ملا کر ہندی کہتے ہیں۔ بہار اور راجستھان کی حکومتیں اپنی زبان ہندی قرار دیتی ہیں۔ گو شمالی بہار کے میتھلی بولنے والے اور راجستھان کے ادارے یہ آواز بلند کر رہے ہیں کہ ہم ہندی سے علاحدہ آزاد زبانیں ہیں۔

ہندی میں دو احیائی رجحانات بہت زور پکڑ رہے ہیں۔ 1۔ ہندی پریمی عربی فارسی کے آسان اور مستعمل الفاظ سے چھوت برتنا چاہتے ہیں۔ 2۔ ہندی میں کھڑی بولی کے الفاظ کو قدیم اصلی سنسکرت روپ میں استعمال کرنا دلیل علم سمجھا جاتا ہے۔ رات دن، چاند، سورج، گھر، دودھ کوئی عربی فارسی لفظ نہیں۔ ہندی میں انھیں راتری، دوس، چندر، سوریہ، گرہ، دُگدھ کہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ ادیب اور شاعر ایسے الفاظ استعمال کریں تو ہمیں زیادہ اعتراض نہ ہو۔ کاروباری اور سرکاری ہندی میں بھی اس قسم کی فرسودہ صورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب کئی

ذمہ دار افراد یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ملک کو سنسکرت نما ہندی نہیں آسان ہندی چاہیے۔ ابھی اس پر عمل نہیں ہوا۔ کاش ایسا ہو سکے۔

اُردو میں بھی اصلاح زبان کے نام پر ہمیشہ دیسی الفاظ کو بدر کیا گیا۔ ولی سے ناسخ تک کے متروکات کا جائزہ لیجیے۔ ہر موقع پر ہندی لفظ کو ترک کیا گیا اور اسے صفائی زبان کا نام دیا گیا۔ آج ضرورت یہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ایک دوسرے سے مغائرت کم کریں۔ کیونکہ یہ دونوں کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ لسانیاتی حیثیت سے یہ ایک زبان ہیں۔ لیکن تہذیبی اور ادبی اعتبار سے دو زبانیں ہو گئی ہیں جن سے انکار کرنا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔

زبان کی بنیادی غرض خیالات کی ترسیل اور ابلاغ ہے۔ زبان کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہیے۔ زبان اس شکل میں استعمال کرنی چاہیے جس میں مخاطب یا قاری جلد از جلد مفہوم کو سمجھ سکے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو مشکل عالمانہ زبان کا استعمال زبان کے بنیادی مقصد کو مجروح کرتا ہے۔ لیکن آسان زبان کا استعمال مشکل زبان کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ آسان اسلوب کے استعمال کی ہدایت خود مشکل اسلوب میں کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ سطور بھی اس آسان زبان میں نہیں جس کی ان میں وکالت کی جا رہی ہے۔

دکنی زبان

دکنی قدیم اُردو کا وہ روپ ہے، جس کی ادبی نشو ونما ابتدائی زمانے میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے سترھویں صدی کے اواخر کے دوران میں ہوئی۔ یہ زبان بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے اور اس کا آغاز بھی جدید ہند آریائی زبانوں، پنجابی، سندھی، مغربی، ہندی، راجستھانی، گجراتی، مراٹھی، اُڑیا، بنگالی اور آسامی کے ساتھ ساتھ ہوا۔ لیکن نشو ونما کے اعتبار سے یہ اودھی کی معاصر ہے۔ دکنی کا سارا سرمایۂ الفاظ ہند آریائی ماخذوں پر مبنی ہے۔ اور قواعد کا ڈھانچہ بھی ہند آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

بارھویں صدی کے اواخر میں شمال سے فوجوں کی آمد کے ساتھ ہند آریائی کی ایک بولی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ بولیاں دکن پہنچی تھیں۔ اس کا اندازہ ہم کو ادبی دکنی کی قواعد کے روپ اور خاص طور پر ضمیروں اور افعال کی شکلوں کے تنوع سے ہوتا ہے۔ شمال سے دکن کا باضابطہ ربط اور طبعی، تہذیبی اور لسانی الحاق اسی زمانے سے ہونے لگا۔ علاء الدین خلجی نے 1325 میں دیوگیر پر حملہ کیا۔ اس زمانے میں وہ الہ آباد کے قریب، کڑہ میں افواج کا سپہ سالار تھا۔ وہ ایک باہمت اور مہم پسند نوجوان تھا۔ اسے اپنی اطلاعی تنظیم کے ذریعے دیوگیر کے معاملے میں معلومات بہم تھیں۔ دیوگیر کو ہند وسطی کی سیاست میں اپنے موقف اور اپنے استحکامات کی وجہ سے بہت اہمیت حاصل

تھی۔ دیوگیر کا قلعہ تقریباً وسطِ ہند میں واقع ہے۔ اور جنوبی ہند میں پیش قدمی اور عمل دخل کے لیے دیوگیر پر تسلط ضروری تھا۔ دیوگیر کا پہاڑی علاقہ اپنے استحکام کی بدولت متوسط ہند میں عدیم النظیر مانا جاتا تھا۔ دیوگیر کی اسی جغرافیائی اور طبعی اہمیت کے مدنظر بعد میں محمد تغلق نے اسے ہند کا پایۂ تخت بھی تجویز کیا تھا اور یہاں ایک نئے شہر دولت آباد کی بنیاد ڈالی تھی۔

علاء الدین کے حملہ دیوگیر سے کچھ پہلے شمال کے مسلمان صوفی اس نواح میں آنے لگے تھے۔ چنانچہ مومن عارف باللہ اور ان کے بہت سے معتقدین اسی زمانے میں دیوگیر آئے تھے۔ اور قلعہ کے مقابل پہاڑ کے دامن میں قیام کیا تھا۔ آپ کا قیام یہاں کافی عرصہ تک رہا اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ چنانچہ آپ کا مزار پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد اور خانقاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ اس نواح میں آپ کے بارے میں کچھ روایتیں بھی مشہور ہیں۔ آپ کے مزار کے پاس ایک خاتون کا بھی مزار ہے۔ اور یہ راجہ رام دیو کی لڑکی کا مزار بیان کیا جاتا ہے جو آپ کی معتقد ہو گئی تھی۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دیوگیر پر راجہ رام دیو کی حکومت تھی۔ علاء الدین کو اس کو زیر کرنے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس کے بیٹے شنکر دیو نے بعد میں کچھ مقاومت کی۔ لیکن بالآخر اسے بھی شکست کھانی پڑی۔ علاء الدین کو شنکر دیو کی مقاومت کی وجہ سے کچھ مزید مال و دولت ہاتھ آیا۔ دیوگیر سے جاتے ہوئے علاء الدین نے کچھ فوجیں اس نواح میں چھوڑیں۔ چنانچہ دیوگیر سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر جالنہ میں ایک فوجی کیمپ قائم کیا گیا تھا جہاں فوجیں رہا کرتی تھیں۔ دیوگیر کے مطیع ہو جانے سے شمالی قوتوں اور اثرات کے لیے جنوب کا راستہ کھل گیا۔ چنانچہ علاء الدین کے جنرل ملک کافور نے معبر (موجودہ ملیبار) اور ورنگل پر فوج کشی کی۔ اور یہاں کے راجاؤں کو مطیع کیا۔ اس کے حملے جنوب میں رامیشورم تک ہوئے تھے۔ یہاں اس نے ایک مسجد بنوائی تھی جو اب تک موجود ہے۔

ان فتوحات سے جنوب میں بڑا انقلاب اس لیے نہیں آیا کہ علاء الدین نے دیوگیر پر قبضہ نہیں کیا بلکہ راجہ سے باج وصول کر کے اور اپنی کچھ فوجیں چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا۔ تاہم شمال کے ہند آریائی زبانیں بولنے والوں کی ایک خاصی تعداد دکن میں آ گئی اور اس سے دکن میں

شمال والوں کی آمد ورفت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اور جہاں تک لسانی اثرات کی اشاعت کا تعلق ہے اس کے لیے راستہ کھل گیا۔

شمالی ہند میں محمد غوری کے نائب، قطب الدین ایبک کی حکومت کے استحکام کے بعد سے اور خاص طور سے بلبن کے عہد سے صوفیائے کرام اسلام کا پیغام اہل ہند تک پہنچانے کے لیے مختلف علاقوں میں جاتے تھے۔ جنوبی ہند کا راستہ کھل جانے کے بعد کئی صوفی اور عالم جنوبی ہند کا رُخ کرنے لگے، اِس کے علاوہ یاتریوں، تاجروں، اور اتفاقی آنے جانے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان سارے واقعات کا نتیجہ بھی دکن میں اس ہندآریائی بولی کی اشاعت تھا۔

دکن میں اس زبان کے جلد نشو ونما پانے اور ادبی بولی کے طور پر اختیار کر لیے جانے کا ایک سبب یہ تھا کہ جنوبی ہند کے مختلف اللسان علاقوں میں شمال سے آنے والوں کے لیے اتحاد کا واحد سہارا یہی زبان تھی۔ ابتدا میں یہ یقیناً الگ الگ متجانس بولیاں تھیں۔ جن کا پتہ ہم کو دکن کے ابتدائی دور کے کارناموں میں الفاظ اور قواعد کی شکلوں کے اختلاف سے چلتا ہے۔ لیکن دکن میں مِل جُل کر رہنے کی ضرورت کی وجہ سے ایک متحدہ بولی جلد ہی متعین ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب کے ارتقا تک اختلافات کی شکلیں بہت گھٹ گئی ہیں۔

دکن میں اُردو کی موجودگی کے آثار ہم کو چودھویں اور پندرھویں صدی سے ملنے لگتے ہیں۔ دکن کی زبانوں میں اُردو ''تُرک مَاٹ'' یعنی ترکوں کی زبان کے نام سے موسوم ہے۔ تلنگی میں یہ ''تُرک ماٹ'' اور کنڑی میں یہ ''تُرک مَات'' سے موسوم کی جاتی ہے۔ دراوڑ علاقوں میں اُردو زبان اب بھی اسی نام سے موسوم کی جاتی ہے اِس کا سبب یہ ہے کہ دکن پر دہلی کے تسلّط کے بعد بھی یہاں کی مقامی قوتیں وقتاً فوقتاً اُبھرتی اور دہلی کو دعوت مبارزت دیتی رہتی تھیں۔ ان بغاوتوں کے سدِّ باب کے لیے دہلی کی حکومت نے بہت سے ترک خاندانوں کو دکن میں نظم ونسق سنبھالنے کے لیے روانہ کر دیا تھا اور انتظام کا اصول یہ اختیار کیا تھا کہ سوسو گاؤں پر ایک امیر مقرر کیا جاتا تھا تاکہ وہ انتظام قائم رکھے اور عوام سے ربط پیدا کرے۔ یہ سوسو گاؤں کے انتظامی عہدہ دار ''امیرانِ صدہ'' کہلاتے تھے۔ شمال سے آنے والے ترکوں کی زبان بھی وہ ہندآریائی بولی یا بولیاں تھیں جو دہلی کے دورنزدیک کے

علاقوں میں نشو ونما پا رہی تھیں اور بعد میں مخلوط ہو کر ہندی، ہندوی، ریختہ، دکھنی اور اُردو، کہیں گوجری کے نام سے موسوم ہوئیں۔

چودھویں صدی کے نصف آخر تک جو علما اور صوفیا دکن آئے تھے۔ان میں حاجی رومی، شیخ عین الدین گنج العلم، شیخ نصیرالدین نصر اللہ ولی، جو حضرت فریدالدین گنج شکر کے بڑے فرزند اور خلیفہ تھے۔حضرت پیر جمنا اور حضرت پیر مقصود قابل ذکر ہیں۔شیخ عین الدین اردو کے رسالوں ''گل باس'' اور ''جلترنگ'' کے مصنف بتائے جاتے ہیں۔لیکن اب یہ رسالے دستیاب نہیں ہوتے۔تاہم بعض شہادتوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُردو سے کام لیتے تھے۔ارشاد و ہدایت اور تعلیم وتدریس سے ان کا واسطہ تھا اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بغیر اُردو، ہندی یا دکنی جانے ہوئے عوام تک رسائی حاصل کر لیتے۔اصل میں اِن عربی اور فارسی بولنے والے علما کو اُردو، ہندی ،ہندوی اسی مقصد سے اختیار کرنی پڑی تھی۔

دکن میں ہندآریائی یا اُردو، بولنے والوں کا سب سے بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانے میں آیا۔محمد تغلق دکن کی مسلسل بغاوتوں کی وجہ سے امیران صدہ سے بھی مشتبہ ہو گیا تھا۔ ان بغاوتوں کو روکنے کے لیے اُس نے بعض طریقے افراط وتفریط کے بھی اختیار کیے تھے۔لیکن بالآخر اُس نے یہ تجویز سوچی کہ اپنا پایۂ تخت دیوگیر میں منتقل کر دے۔اپنے مقصد کی تکمیل میں اُس نے دیوگیر کے قریب ایک نیا شہر دولت آباد کے نام سے آباد کیا۔طنجہ کا جہاں گرد، ابن بطوطہ اس زمانے میں ہندوستان آیا تھا۔اس نے دولت آباد کو دیکھا تھا۔اس کی رونق اور آبادی کی بڑی تعریف کرتا ہے۔اپنے بسائے ہوئے شہر کی ذہنی اور تہذیبی تعمیر کے لیے اس نے دہلی کے علما اور صوفیا کو یہاں بھجوایا تھا۔چنانچہ مشہور ہے کہ دولت آباد میں عالموں، صوفیوں اور زاہدوں کی چودہ سو پالکیاں آئی تھیں۔ہر پالکی نشین عالم اور صوفی کے ساتھ ان کے شاگردوں اور معتقدین کا ایک خاصا گروہ بھی ہوتا تھا۔

یہ علما دولت آباد کی آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے پر مقیم ہوئے تھے۔جہاں یہ پہلے خیموں میں ٹھہرے تھے۔پھر معتقدین نے اِن کے لیے مکانات بنوائے۔اب اس ٹیلے پر ایک عالیشان مسجد ہے جو مسجد چہاردہ صد اولیا کے نام سے موسوم ہے۔صوفیا میں سلطان المشائخ

نظام الدین اولیاؒ کے خلفا اور مریدین بھی تھے۔ جنھوں نے دکن میں اسلامی عقائد اور علوم دین کی اشاعت میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اِن بزرگوں میں سید یوسف حسینی الموسوم بہ شاہ راجایا شاہ راجو قتال جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کے والد تھے۔ حضرت شیخ بُرہان الدین غریب، شیخ منتخب الدین زربخش، امیر حسن، علائے سنجری جو امیر خسرو کے پیر بھائی اور دوست تھے۔ اور شیخ زین الدین خلد آبادی اردو کے تعلق سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ راجو سے کچھ چکی نامے اور ایک آدھ نثر کا رسالہ بھی منسوب ہے۔ امیر حسن کی ایک دوغزلیں ریختہ کے روپ میں دستیاب ہوتی ہیں۔ شیخ زین الدین کا کوئی کارنامہ دستیاب نہیں ہوتا۔ تاہم ان کے ملفوظات میں کچھ جملے اُردو کے بھی مل جاتے ہیں۔

محمد تغلق کی سخت گیریوں نے دکن کے سربرآوردہ عہدہ داروں کو آخر کار اس سے برگشتہ کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے دہلی سے اپنا رشتہ توڑ لینے کا تصفیہ کیا۔ اور دولت آباد میں اپنے ایک معمر اور معتبر قائد اسماعیل مغ کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ لیکن جلد ہی مغ نے سبک دوشی اختیار کر لی۔ اور علاء الدین حسن نے دکن کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ محمد تغلق جب اس کی تنبیہہ کے لیے دکن کی طرف بڑھا تو علاء الدین حسن نے دولت آباد سے پایۂ تخت کو گلبرگہ میں منتقل کر لیا۔

گلبرگہ میں اُس نے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں بہمنیوں کا پایۂ تخت بیدر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس خاندان کی حکومت 1347 سے 1527 تک قائم رہی۔ اور کل اٹھارہ حکمران اس خاندان کے گزرے۔ بہمنی سلطنت دکن کے سارے طول وعرض میں اور جنوبی ہند کے کچھ حصّوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُردو کے پہلے مصنف، حضرت بندہ نواز گیسودراز، اس خاندان کے آٹھویں حکمراں فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں دہلی سے گلبرگہ آئے اور اسی جگہ کو ارشاد وہدایت کا مرکز بنایا۔ اُس وقت آپ کی عمر اسی برس کی تھی۔ ایک سو پانچ برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا اور گلبرگہ میں آپ مدفون ہیں۔ خواجہ صاحب اُردو کے کئی متصوفانہ رسالوں، جیسے ''معراج العاشقین''، ''تلاوت الوجود''، ''شکار نامہ''، ''تمثیل نامہ'' وغیرہ کے مصنف ہیں۔ کچھ نظمیں بھی آپ سے منسوب ہیں۔ آپ کے پوتے سید عبداللہ حسینی بھی اردو کے مصنف گزرے ہیں۔

اردو کو ایک مستقل ادبی زبان کی حیثیت دینے میں حضرت شاہ میران جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ کا تعلق بہمنیوں کے آخری عہد سے تھا۔ لیکن جب بہمنی سلطنت پانچ خود مختار سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی تو آپ بیجاپور منتقل ہو گئے۔ عوام کے ارشاد و ہدایت کے لیے آپ بھی اردو سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ نظم و نثر میں آپ کے کئی رسالے ہیں۔ آپ کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ آپ کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ روحانی پیشواؤں کی اِس پشت پناہی نے جدید بولیوں کو اُبھارا اور عوام بھی ان کی تقلید میں ان زبانوں میں لکھنے لگے۔

دکنی کا یہ دور مذہبی تحریروں کا دور ہے۔ امین الدین اعلیٰ کے زمانے سے بیجاپور میں غیر مذہبی ادب بھی پیدا ہونے لگا۔ بیجاپور میں ابراہیم کی کتاب ''نورس'' اور مقیمی کی ''چندر بدن و مہیار'' سے اور گولکنڈہ میں محمد قلی اور وجہی سے ادبی ذوق کو ترقی ہونے لگی اور غواصی، ابن نشاطی، غلام علی جیسے شاعر اور میران یعقوب، شاہ میران جی خدا نما اور شاہ ملک جیسے نثر نگار اُبھرے۔

احمد نگر کی سلطنت کا زیادہ وقت شمال اور جنوب کی قوتوں سے نبرد آزمائی میں گزرا۔ اس لیے وہاں ادبی روایات کی مسلسل ترقی نہیں ملتی۔ صرف ایک شاعر حسن شوقی کا کارنامہ ''فتح نامہ نظام شاہ'' نظام شاہی خاندان کی ادبی سرپرستی کی یادگار کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ یہ شاعر بعد میں بیجاپور اور پھر گولکنڈہ بھی گیا۔ اس کی غزلوں اور ریختی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

بہمنیوں کا آخری پایۂ تخت بیدر رہا تھا۔ بیدر میں برید شاہی دور کے ایک شاعر کا ''پرت نامہ محی الدین'' ملتا ہے۔ فیروز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بعد میں گولکنڈہ آ گیا تھا۔

دکنی ادب کی ترقی کا زمانہ سولھویں صدی اور سترھویں صدی کا زمانہ ہے۔ سترھویں صدی کا اختتام دکن کی علم دوست سلطنتوں، بیجاپور اور گولکنڈہ کا بھی اختتام ہے۔ سترھویں صدی کے اواخر میں یہ سلطنتیں دہلی کا جز و بن گئیں مغل حکمراں فارسی کی روایات میں پلے تھے۔ اس لیے ہندی، ریختہ، دکنی یا اردو ان کے پاس ادبی اغراض کے لیے قابلِ اعتنا نہیں تھی۔ اس لیے ان کے زمانے میں دکنی ادب کی ترقی رُک گئی اور شاعر اور انشا پرداز شمال اور جنوب کے مختلف حصّوں میں منتشر ہو گئے۔ اور اپنے ساتھ اپنے ادبی ذوق کو بھی لیتے گئے۔ اس سے دکنی ادب کی سرحدیں وسیع

ہوگئیں۔اورنگ زیب کے بعد دکن میں کچھ عرصہ تک نراجیت سی رہی لیکن نظام الملک میر قمرالدین خان کے دکن پر تسلط کے بعد اس علاقے کو تہذیبی اور ادبی اعتبار سے پھر مرکزیت حاصل ہونے لگی۔دورِ وسط کی آخری ادبی بساط اورنگ آباد میں بچھی۔ جہاں دکن، اس کے اطراف واکناف اور شمالی ہند کے بہت سے اچھے اچھے شاعر اکٹھے ہوگئے تھے۔لیکن اس نئے ماحول میں ادبی روایات نے بھی نیا موڑ پایا۔اور لسانی صورت حال میں تبدیلی ہوگئی۔چنانچہ اورنگ آباد کا ادب شمال اور جنوب کی بہترین روایات کا سنگم بن گیا۔اس زمانے میں ولی اور سراج جیسے عظیم شاعر اُبھرے اور شفیق اور سامی وغیرہ نے ان کی روایات کو آگے بڑھایا۔

دکنی کا حلقۂ اثر جنوب کی تقریباً ساری موجودہ ریاستوں، مدراس، کیرالا، آندھرا اور مہاراشٹر پر پھیلا ہوا تھا۔شمال میں وسط ہند کے مقامات جیسے ساگر، مالوہ وغیرہ تک بھی اس کے اثرات پھیلے ہوئے ہیں۔اس وسیع خطے میں پھیلی ہوئی زبان کی فطرتاً کئی بولیاں بھی رائج ہوگئی ہیں۔چنانچہ مدراس، کیرالا، اور میسور کی زبان حقیقی دکن کے علاقوں سے کچھ مختلف ہے۔اور اس میں آج تک دکنی کی کئی پُرانی خصوصیات باقی رہ گئی ہیں۔اس کے علاوہ اس میں کچھ لفظ مقامی زبانوں کے آگئے ہیں اور اظہار کے انداز میں بھی مقامی زبانوں کا اثر سرایت کرگیا ہے۔اسی طرح مہاراشٹرا کے علاقے میں مرہٹی کا اثر اس پر نمایاں ہے۔پھر جیسے جیسے شمال کی طرف بڑھتے ہیں یہ شمال کی بولیوں سے قریب تر ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ان میں مدغم ہو جاتی ہے۔

اس ساڑھے تین سو برس کے عرصے میں یہ ہند آریائی بولی اپنی بولیوں سے کٹ کر دور دکن دیس میں نشو ونما پارہی تھی۔اس میں شمال کی بولی، ہندوی، ہندی یا ریختہ کے مقابلے میں فطرتاً کچھ ممیز خصوصیات پیدا ہوگئی تھیں۔ذیل میں ان پر ایک اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے۔

''چندلسانی خصوصیات'':۔

۱۔ دہرے مصمتے Double consonants یا لمبے مصمتے:۔یہ درمیانی ہند آریائی بولیوں کی ایک ممیز خصوصیت تھی۔ ہندوی یا ریختہ جب دکن پہنچی تھی۔اس میں درمیانی ہند آریائی کی خصوصیتیں باقی تھیں۔زبان اپ بھرنش مرحلے کی بولیوں کی طرح ابھی سیال حالت میں تھی۔قواعد کے بہت سے روپ متعین نہیں تھے۔اس لیے درمیانی ہند آریائی بولیوں میں دہرے مصمتہ قدیم

ہندآریائی کے متصل مصمتے میں جنیائی Assimilation یا انجذاب کے عمل کا نتیجہ تھے۔قدیم ہند آریائی میں متصل مصمتے بہت آتے تھے۔ جیسے ہستہ (ہاتھ) سُورن (سونا) سپشٹ (کُھلا) سُشک (سوکھا) وغیرہ۔

قدیم ہندآریائی کے:

س ت، س ش، رپ، رن، وغیرہ

جنسیائی کے عمل کے ماتحت:۔

ت ت۔ک ک، پ پ، ن ن

ہوجاتے ہیں۔جیسے:

س ت، ہستن (قدیم ہند آریائی) ہتّی (درمیانی ہند آریائی، دکنی میں بھی یہی صورت ہے)

. . بَست (ہاتھ سے بنانا ہے) ہتّ ( ) ( )

س ش۔سُشک ( ) سُکّا ( ) ( )

رن۔سُورن ( ) سُنّا ( ) ( )

۔۔کَرن ( ) کن ( ) ( )

۔۔پُورن ( ) پُنّا ( ) ( )

بعض وقت جدید ہند آریائی بولیوں میں بھی یہ روپ بھٹک بھٹکا کر آ گئے مثلاً ادبی اُردو میں:

پتہ (پتّا) (اس کا جڑواں لفظ ''پات'' میر نے استعمال کیا ہے۔'' پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں''۔ سنسکرت پت = گرنا)

سَچ۔(درمیانی ہند آریائی سَت اور ت کی چ میں تبدیلی کے ساتھ ''سچّ'' جدید ہند آریائی بولیوں اور اردو میں درمیانی ہند آریائی کے دُہرے مصمتے میں سے ایک گر جاتا ہے اور اس کے ماقبل کا مصوتہ vowel دراز ہوجاتا ہے جس سے پات ساچ کے روپ حاصل ہوتے ہیں۔چنانچہ اُردو میں کہادت ہے۔''ساچ کو آنچ نہیں''۔یا قدیم اردو ''سانچا موتی''، ''سانچا

حضرت شاہ بُرہان" میں یہ روپ محفوظ رہے۔ اردو میں محاورے میں بندھ جانے کی وجہ سے جدید ہند آریائی کا روپ کھسکنے نہیں پایا۔ "سانچ" میں انفیت " آنچ" کی مماثلت کا نتیجہ ہے)

نتھ۔ (ناتھ ہونا چاہیے تھا) چنانچہ بیل کی ناک کی ڈوری اور سرپرست یا شوہر کے لیے یہ لفظ مستعمل ہے۔ اور معنوں کے لیے "نتھ" کا یہ جڑواں لفظ متعین ہو گیا ہے۔ اور عورتوں کی ناک کے زیور کے لیے "نتھ" مخصوص ہے)

کل۔ (گزشتہ یا آنے والا دن۔ "کال" سے جس کے معنی وقت یا زمانے کے ہیں)

مذکورہ بالا روپ پنجابی میں عام ہیں۔ اردو میں یہ روپ کچھ تو پنجابی کے اثر کا نتیجہ ہیں اور کچھ ابتدائی دور میں ادبی دکنی سے آ گئے ہیں۔

2۔ ہکار (Aspirate) کو غیر ہکار استعمال کرنے کا رجحان۔ جیسے:۔ مورک (مورکھ)، راک (راکھ)، ابی (ابھی)

شمال کی بولیوں اور ادبی اردو میں بھی اس رجحان کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً بھوک (ہندی بھوکھ)، ڈھونڈنا (ہندی ڈھونڈھنا)، ہونٹ (اونٹھ یا ہونٹھ) بھابی (ہندی بھابھی)

ہکار کے ترک کے رجحان سے دکنی میں ہکار اصوات کی صورتیں حسب ذیل ہو جاتی ہیں۔

ک بجائے کھ۔ دیک (دیکھ) مورک (مورکھ)

گ ہاتھ سے گھ۔ باگ (باگھ) پگلنا (پگھلنا)

ٹ " ٹھ۔ اونٹ (اونٹھ) ہونٹ (ہونٹھ) ٹھاٹ (ٹھاٹھ)

ت " تھ۔ سات (ساتھ) ہات (ہاتھ) تے (تھے)

ڈ " ڈھ۔ ڈھونڈنا (ڈھونڈھنا)

د " دھ۔ ادک (ادھک) دود (دودھ)

چ " چھ۔ کچ (کچھ)

ج " جھ مج (مجھ) تج (تجھ)

ب " بھ جیب (جیبھ)

ن' نھ　　　پنانا (پھانا)

ل' لھ　　　چولا (چولھا)

ڑ ہا تھ سے　ڑھ　　چڑنا (چڑھنا)

3۔　لفظ کے درمیان کبھی کبھی "ھ" کی جگہ بدلی (Trasposition) ہو جاتی ہے۔ جیسے۔

بھتر (پتھر) پچھانتا (پہچانتا) پھنکوی (پنکھڑی) کبھی یہ "ھ" غائب ہو جاتی ہے جیسے (پنکوی) نھتے (تھے) گھنٹہ (گنٹھہ) اکھٹا (اکٹھا)

آخری صورت کی مثالیں ادبی اردو میں بھی ملتی ہیں۔

4۔　بعض لفظوں میں "ھ" اضافہ ہو جاتی ہے۔ جیسے:

بھلاا (ملفوظ مثل مرہٹی (d) سنگھاتی (ساتھی سنگاتی) کھیسا (کیسہ)

5۔　ایسے لفظوں میں جن کی ابتدائی صورت معکوسی ہو اور بعد بھی معکوسی صوت آتی ہو تو دکنی میں عموماً معکوسی صوت مسوڑھوں سے نکلنے والی اسی درگ یا مخرج کی صوت میں بدل جاتی ہے۔ جیسے

تیڑا (ٹیڑھا) تھنڈا (ٹھنڈا) داٹنا (ڈانٹنا) تٹو (ٹٹو) تاٹ (ٹاٹ)۔

6۔　دکن کی ایک اور نمایاں لسانی خصوصیت اُس کی جمع کا طریقہ ہے۔ مصمتہ پر ختم ہونے والے سارے اسموں کی جمع آں سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے:

گھر۔ گھراں۔ بیل۔ بیلاں۔ رات۔ راتاں۔ دل۔ دلاں۔

مصوتہ "ا" یا مختفی "ھ" پر ختم ہونے والے اسموں میں عموماً جمع آخری حرف کو "ے" سے بدل کر بنائی جاتی ہے۔ جیسے گھوڑا، گھوڑے بندہ۔ بندے لیکن بعض صورتوں میں "آں" اِس پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور جمع کی صورت "بندیاں" کی ہو جاتی ہے۔

ادبی اردو میں جمع کی شکلیں بہت گھٹ گئی ہیں۔ چنانچہ مصمتہ پر ختم ہونے والے مذکر اسماء کی جمع نہیں بنائی جاتی بلکہ وہ واحد کی شکل ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جمع کا اظہار صفت، صفت عددی اور فعل سے ہو جاتا ہے۔ زبانیں اپنے ارتقا کے مراحل میں بہت سی غیر ضروری تصریفوں کو چھوڑ جاتی ہیں جس سے زبانوں میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مونث اسموں کی جمع "یں" سے بنتی ہے جیسے "راتیں" "بیلیں"۔

دکن میں غیر فاعلی حالت (oblique case) میں یعنی فاعلی حالت کے علاوہ دوسری جتنی حالتیں مثلاً مفعولی، اضافی، ظرفی، اسخراجی (Oblative) جس کا اظہار "منیں"، "سنی"، "میں"، "سے"، "تک"، "پر"، "تلک"، "نے"، "والا" لگن وغیرہ سے جنھیں حروف مغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمع کی صورت "آں" پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جیسے: راتاں میں۔ گھراں منیں۔

لیکن کچھ "وں" کے ساتھ بھی جمع آتی ہے (کہ یاروں سے سب مل ہو، سینہ صفا) قصہ رضوان شاہ وروح افزا، ص 60)

"آں" کے ساتھ جمع بنانے کا قاعدہ پنجابی اور ہند آریائی بولیوں میں ہے۔ یہ فارسی علامت جمع کے لیے جانے کی صورت نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ ہند آریائی ہے۔

7۔ امر کی صورت میں دینا، لینا سے دکنی میں دیو (دو)، لیو (لو) کے روپ ہیں۔ یہ روپ ہند آریائی بولیوں میں آتے ہیں۔ ادبی اردو میں صرف تمنائی اور شرطیہ تک محدود ہو گئے ہیں۔ جیسے دیوے، لیوے، دیویں، جاویں، اس میں اسم فاعل کی صورت "لیوا"، "دیوا" میں بھی یہ "ی" موجود ہے۔ اس کے علاوہ "لیجیے"، "دیجیے" کے روپ میں بھی یہ ملتا ہے۔

8۔ دکنی زبان میں ماضی مطلق کے یہ روپ:۔

بولیا، کھولیا، رولیا، دیکھیا وغیرہ۔

ادبی زبان میں اب ناپید ہو چکے ہیں۔ لیکن بولی میں موجود ہیں۔ جیسے "کریا"، "کھیا" وغیرہ۔

9۔ افعال میں حال ناتمام کی شکل میں کھی:۔ کہتا، کہتا ہوں، کے روپ بھی آتے ہیں۔

"دکنی کی اصوات یا حروف تہجی"

دکنی ادب اور بول چال میں حسب ذیل اصوات یا حروف تہجی ہیں، جو اپنی نوعیت اور مخرج کی ترتیب کے لحاظ سے ذیل میں جدولوں کی صورت میں درج کیے جاتے ہیں۔

مصمتہ	غیر مصیتی		مصیتی		انفی
consonants	غیر ھکار	ھکار	غیر ھکار	ھکار	
حلقی	ک	کھ	گ	گھ	

تالوی	چ	چھ	ج	جھ			
معکوسی	ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ			
دنتی	ت(ط)	تھ	د	دھ		ن	نھ
لبی	پ	پھ	ب	بھ		م	مھ

سیٹیے (Sibilants) س (ص، ث) س

رگڑالو (Fricative) خ ر ز

ف و

پہلوی (Laterals) ل لھ ل (مثل، مرہٹی، (y))

مصوتہ Vowels

مختصر اُ ی ا اُو

طویل آ ئی اوٗ

ملواں مصوتہ (Diphthongs) آو۔ آئی

ایک اور مختصر مصوتہ و بھی آتا ہے، جسے بین قومی تحریر میں ɔ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جیسے پُنڈ (لونڈا) جو درمیانی ہند آریائی ''پُنّا'' اور قدیم ہند آریائی پُتّر سے حاصل ہوا ہے۔ دکنی میں دوسرا مصوتہ مختصر ہو گیا ہے۔

اسماء

1۔ ایسے اسماء جن کے پہلے اور دوسرے رکنوں (Syllables) میں طویل مصوتے آتے ہیں۔ ان میں پہلا مصوتہ عموماً مختصر ہو جاتا ہے۔ جیسے:

اُدی۔ اُسمان۔ اُنکھ

2۔ اسم کیفیت:۔ ایسے اسماء کے آخر میں آٹ ۔ ت ۔ گی ۔ ن ۔ ئی آتے ہیں جیسے:۔ گھبراٹ، تمتماٹ، بےخراگی (بےخبری)۔ چلنت۔ چلن۔ دیکھت (دیکھنے کا فعل) کڑوائی۔ سرمساری۔ ساد (سائی) دل داشتی۔ صبوری۔

3۔ اسم ظرف:۔ جن اسموں سے مقام یا وقت کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ عام طور پر وہی ہیں

جوادبی اُردو میں آتے ہیں۔ان کے علاوہ کچھ مخصوص اسم ظرف ہیں۔جیسے دیول (دیوآلہ) (دیو کا گھر، دیومندر) پھلباری۔(پھلواری)

4۔ اسم آلہ:۔اوزار یا آلہ کا مفہوم رکھنے والے اسماء زیادہ کثرت سے اور متنوع روپ میں نہیں ملتے۔صرف چند عام اسماء دستیاب ہوتے ہیں۔جیسے:۔

چھنی (چھلنی) لہوا (تلوار) قلم، تیشا (تیشہ)

5۔ اسم فاعل:۔وہ اسم ہوتا ہے جس سے کسی کام کے کرنے والے کا مفہوم نکلتا ہے۔یہ اسماء والا، ہارا، ہار، دال، دار، پاڑو۔کرنے والا۔بولن ہارا، چلنہار، رکھوال، ادب دار (وجہی) باٹ پاڑو۔

ان کی جمع میں ''ا'' ''ے'' سے بدل جاتی ہے:۔بولنہارے۔چلنہارے' تانیث میں ''ی'' سے تبدیلی ہوجاتی ہے۔

مذکورہ بالا کے علاوہ وند، دان، ونت، وار، مند، لاحقوں سے بھی اسم فاعل بنتے ہیں۔جیسے: بلوند (نصرتی) اندیشہ داں (اندیشہ کرنے والا) میاونت (محبت کرنے والا) عقل مند۔بخت وار (نصیبہ ور)

کبھی ایک اسم یا صفت کے ساتھ فعل کا کوئی روپ جوڑنے سے، جیسے:

بھوگنی، گن بھرا، جگ اُجال، (دنیا کو روشن کرنے والا) دل شکار (سب رس ص،86)

کبھی فعل کی صورتِ ناتمام بھی اسم فاعل کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔جیسے، جانتا۔اجانتا۔ ''انجان'' بھی اسم فاعل کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

جنس۔اسماء جن کے آخر میں ''ا'' یا ''ہ'' ہوتی ہے۔مذکر ہیں۔جیسے:

خدا۔بندہ۔بیٹا۔قلعہ:۔

جن اسموں کے آخر میں ''ی'' ہوتی ہے۔مونث ہیں۔جیسے:۔

لڑکی۔صراحی۔تازگی لیکن ہتی۔پانی۔آدی۔مونث نہیں ہیں۔

جو اسماء مصمتہ پر ختم ہوتے ہیں ان کی تذکیروتانیث یا تو مماثلت پر منحصر ہوتی ہے یا محض قیاس پر کبھی جس زبان سے لفظ مستعار لیا گیا ہے اس کے ساتھ اس کی جنس بھی آگئی ہے۔

مماثلت میں یہ ہوتا ہے کہ مماثلت یا قربت رکھنے والے اسموں کے مطابق کسی اسم کی جنس معین کر لی جاتی ہے۔ جیسے:۔

زمین (کھیتی کی مماثلت ہے) جیو، روح (دل کی مماثلت ہے)

محض قیاس سے جہاں کام لینا پڑتا ہے۔ جنس میں اختلافات نظر آتے ہیں۔

قدر (مذکر) امانت (مذکر)

تعداد:۔ دکنی میں اُردو کی طرح واحد اور جمع کی دو ہی صورتیں ہیں:۔

واحد اسموں کی جمع بنانے کے اصول حسب ذیل ہیں۔

1۔ اسماء جو مصوتہ ''ا'' یا ''ہ'' پر ختم ہوتے ہیں ان کی جمع میں ''ا'' اور ''ہ'' ''ے'' سے بدل جاتی ہے۔ جیسے:۔

بیٹے، گھوڑے، بندے

لیکن بعض وقت ایسے اسماء کی جمع بھی ''آں'' سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے:۔

گھوڑیاں۔ بندیاں (جمع مذکر)

غیر فاعلی حالت (معنوی، اضافی، ظرفی، اختراجی، ندائی وغیرہ) میں ''ا'' یا ''ہ'' پر ختم ہونے والے اسماء کی تصریف کی صورت بھی جمع کی ہوتی ہے۔ جیسے:۔

بیٹے کوں سے، میں، پر وغیرہ:۔

2۔ مصمتہ پر ختم ہونے والے اسماء کی جمع کا عام اصول جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے آخر میں ''آں'' کا اضافہ ہے۔ جیسے:۔ صورتاں، گھراں، بیلاں

غیر فاعلی حالت میں ان جمع اسماء کی تصریف ''وں'' سے لازماً نہیں ہوتی بلکہ اسم جمع ہی اس حالت میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔ صورتاں میں، گھراں سے

حالتیں:۔

دکنی اور اردو، دونوں میں مختلف حالتوں کے لحاظ سے اسم میں تصریف کی صورتیں نہیں ہیں۔ بلکہ حالتوں کا تعین محض مفہوم سے ہوتا ہے۔ لیکن تصریف کے اعتبار سے اکثر ہند آریائی زبانوں میں صرف دو حالتیں ہوتی ہیں۔

1۔ فاعلی حالت :۔ جس میں اسم اپنی اصلی حالت مین رہتا ہے۔ اُردو، اور ہندی میں اس کے بُعد ''نے'' لگاتے ہیں۔ جسے علامت فاعل کہتے ہیں۔ اس سے ماضی کی بعض صورتوں اور حال کی ایک صورت میں فعل مفعول کے مطابق ہو جاتا ہے۔ دکنی میں یہ علامت لازی طور پر نہیں آتی۔ اور آتی بھی ہے تو فعل فاعل کے مطابق رہتا ہے۔

2۔ غیر فاعلی حالت :۔ جس میں ''ا'' اور ''ہ'' پر ختم ہونے والے واحد اسموں کی تصریف ''ے'' سے ہوتی ہے۔ اور جمع اسموں کی کبھی کبھی ''وں'' میں تصریف ہو جاتی ہے۔ جیسے :۔

بندے سے میں، کو، پر، تلک وغیرہ یا

بندیاں سے میں ۔۔۔۔ وغیرہ بندوں سے میں، پر وغیرہ

فاعلی حالت :۔ جب جملے میں اسم کے ساتھ کسی کام کا کرنا متعلق ہو، وہ فاعلی حالت میں ہوتا ہے۔ جبکہ اوپر کہا گیا ہے فاعلی حالت میں اسم کی تصریف نہیں ہوتی۔ جیسے :۔ خدا کہیا۔ نبی بولے۔ لڑکی لکھی وغیرہ

بعض وقت فاعل کے ساتھ ''نے'' آتا ہے۔ لیکن اس کا اثر اسم پر عموماً کچھ نہیں پڑتا اور فعل فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے :۔ آدمی نے روٹی کھایا۔ پری نے تخت پر بیٹھی۔

مفعولی حالت :۔ مفعولی حالت میں بھی عموماً اسم کی تصرف نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی اسم کے بعد ''کو'' یا ''کوں'' آتا ہے۔ بعض وقت ضمیر شخص میں تصریف کا عمل ہوتا ہے اور ''ی'' یا ''ین'' یا ''نا'' جوڑے جاتے ہیں۔ کبھی کچھ نہیں آتا۔ بلکہ اسم یا ضمیر کے مقام سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ان تینوں صورتوں کی مثالیں یہ ہیں۔

1۔ نہ اپس کوں جانے دسرے کون پچھانے (وجہی)

2۔ خدا کے کاماں موں ہمنا کیا غرض (وجہی)

3۔ ہمن دے ہدایت جو تیری ہو چاہ (نصرتی)

4۔ جسے انصاف اچھے گا، وو ہمنا بہت مانے گا (وجہی)

حالتِ اضافی :۔ جس میں کسی اسم یا ضمیر کا تعلق دوسرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اضافت کے حروف کا، کے، کی اور کبھی کبھی کیں بھی جمع مونث کے لیے آتا ہے۔ ورنہ جمع کے لیے بھی کی ہی

استعمال ہوتا ہے۔ جیسے :۔

نظر کا ردیش (روش) حسن کوں بھوت بھایا۔ (وجہی)

غمزے نے نظر کوں دسرے دیس حسن کے حضور لایا۔ (وجہی)

نظر کی ماں تھی ہندوستانی (وجہی)

اضافت کے لیے پوربی کے کیرا، کیرے، کیری (رکرا، رکرے، رکری) بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر قدیم صوفیا کے کارناموں میں ۔ یہ حروف کبیر اور دوسرے بھگت شاعروں کے یہاں زیادہ مستعمل ہیں۔ اسی تعلق سے ابتدائی صوفیوں کی زبان میں یہ بہت آتے ہیں۔ جیسے :۔

اللہ کیرا ناوں۔ سعادت کیرے باغ کا گل (نصرتی) دکنی کیری بولی۔

ظرفی حالت :۔ اسم میں ظرفیت کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے دکنی میں حسب ذیل حروف آتے ہیں۔

میں ۔ منیں ۔ منے ۔ میاں ۔ میاے ۔ ماتھ ۔ مانہیں ۔ مانہی ۔ منہ ۔ بھیتر ۔ بھتر ۔ بچ ۔
اور ماٹھ، مانہیں گوجری میں زیادہ آئے ہیں۔ کبھی حروف متروک بھی ہوتا ہے۔ جیسے علی ہٹ لیے ذوالفقار (وجہی)

حالت اخراجی :۔ Allatives جس میں اسم سے کسی چیز کے نکلنے یا جانے یا خارج ہونے کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ مفہوم اسم کے بعد :

سیں ۔ سوں، تھے، تے، سیتی، ستی، سینتی، سے کے آنے سے ادا ہوتا ہے۔ جیسے :۔

گھر سیں چلا۔ وہاں کے لوگاں نے لیا خبر (وجہی)

غیب سے کچ رمز پا کر (وجہی)

حالت ذریعہ یا آلی حالت :۔

Instrumental case جس میں اسم سے کسی کام کا ذریعہ یا آلہ بننے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے بھی وہی حروف استعمال ہوتے ہیں جو اخراجی کے لیے ہیں۔ جیسے :۔

ہوے سوں ماریا۔ قلم تے لکھیا۔ جادوٹونے سے دل کوں لیا۔

حالت ندائی:۔

"ا" یا "ہ" پر ختم ہونے والے اسموں میں عموماً "ا" کی تصریف "ے" میں ہوتی ہے۔مصمتہ پر ختم ہونے والے اسموں کی کوئی تصریف نہیں ہوتی۔جیسے:۔

اے لڑکے! من ہرن ہوت!

ضمیریں:۔

دکنی میں ضمیریں اوران کے روپ بہت ہیں۔اس کا سبب بھی اصل میں یہی ہے کہ یہ کئی بولیوں کا سنگم ہے،دکنی ادب میں ضمیروں کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں:۔

ضمیر شخصی:۔

واحد	جمع
متکلم:۔فاعلی،میں	ہم،ہمیں
مفعولی مج،منج،مجھ	ہمن،ہمنا
اضافی۔میرا(مج کا)	ہمارا
حاضر:۔فاعلی،توں	تم۔تمھیں
مفعولی،تجے(تجھ)تجے	تمن۔تمنا۔تمیں
اضافی تیرا(تج کا یا محض تج)	تمن۔تمنا
غائب:فاعلی۔وو(او۔وے)	وو(او۔وے)
مفعولی۔اس۔ان۔انو	انوں،ان،انوں،انن
اضافی۔انن۔اُنے	انن۔اُنے

شخصی احترامی ضمیروں کی صورتیں اور بھی کثیر ہیں:۔

واحد	جمع
فاعلی۔اپ۔آپ	اپی۔اپیں۔اپن
مفعولی۔اپے۔اپس	اپنگ
اضافی۔اپنا	اپناں۔اپنیاں

ضمیر موصول:۔

واحد	جمع
فاعلی۔جو۔جنے	جو،جن
مفعولی۔جس۔جن	جن،جنو

صلہ کے طور پر''جو'' کے ساتھ''دو'' اور''جس'' کے ساتھ''تس'' آتے ہیں۔

ضمیر استفہام:۔

واحد	جمع
کون (جاندار کے لیے)	کن۔کنے
کیا (بے جان کے لیے)	....

ضمیر تنکیر:۔

بے جان کے لیے کچ (کچھ)

کبھی ضمیر موصول اور تنکیر دونوں کو جوڑ کر بھی استعمال کرتے ہیں۔جیسے:

جوکوئی (جکئی)   جو کچھ (جکچھ)

ضمیر اشارہ:۔

قریب کے لیے، یہ، یے، اے، یو'ان، انے (انھیں) بعید کے لیے وہ۔او، وو، وے، (یعنی وہی ضمیریں جو واحد مذکر غائب کی ہیں) اُن۔اُنے (انھیں)

صفت:۔

وہ الفاظ جو اسم کی کیفیت اور خاصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔جیسے اچھا، بُرا، خوب وغیرہ۔

صفات ذاتی:۔

اچھا، بُرا، کالا، سفید وغیرہ:۔

صفات ذاتی جو''ا'' یا''ی'' پر ختم ہوتے ہیں۔اُن کی جمع بھی اسماء کی جمع کی طرح بنائی جاتی ہے۔اِس کا عام قاعدہ بھی وہی ہے۔جو اسماء کی جمع بنانے کا ہے۔اگر صفت کے آخر میں''ا'' آئے تو جمع''ا'' کو''ے'' سے بدل کر بناتے ہیں۔جیسے:۔اچھے، بُرے، کالے، گورے وغیرہ۔

لیکن ایسی صفات کی جمع بھی کبھی کبھی ''آں'' سے بنائی جاتی ہے۔ جیسے:۔

اچھیاں۔بُریاں (مذکر)

صفات ذاتی کی تانیث بھی آتی ہے۔اچھی۔بری۔کالی وغیرہ۔

مونث کی صورت میں بھی جمع ''آں'' سے ہی بنتی ہے۔جیسے راتاں، چوکیاں وغیرہ

منفی صفات ذاتی:۔

عموماً حسب ذیل سابقے آتے ہیں۔

نرا۔بن۔اَو۔اَن۔بے

نرادھار۔اُچل۔اَجانا۔بن۔اوکل۔انجان۔اودھرم۔بےسُرا

صفت نسبتی:۔

اسم کے آخر میں ''ی'' بڑھاتے ہیں۔جیسے پیازی۔ترکی۔

صفت عددی:۔

معین اور غیر معین۔عام یا معمولی ترتیبی اور اضافی کی صورتیں دکن میں مستعمل ہیں۔

اعداد ایک سے دس تک وہی ہیں جو ادبی اُردو میں ہیں۔ایک کے روپ ''یک'' اور غیر فاعلی میں ''ایکس'' بھی ہیں۔''ایکٹ'' بھی ''ایک'' ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

گیارہ سے سولہ تک کے اعداد میں آخری ہ مختفی ہوکر غیر ملفوظ ہو جاتی ہے اور ان کی صورت گیارا، بارا، تیرا، چودا، پندرا، سولا ہو جاتی ہے۔

بائیس اور تیئس، ستائیس، اٹھائیس، دکنی میں باویس اور تیویس، ستاویس، اٹھاویس ہیں۔ان صورتوں میں سنسکرت کی باقیات الصالحات ہے۔سنسکرت میں بیس، ونشتی، ہے۔ اکیس، ایک ونشتی (یا، ایک ونش) بائیس دواونشتی (یا دواونش) تیئیس، ترونشتی وغیرہ۔

تریالیس اور چوالیس، اکتالیس کی مماثلت میں ترتالیس، چونتالیس اور کبھی چھالیس ہیں۔اسی مماثلت میں گجراتی ''بیالیس'' بتالیس ہو جاتا ہے۔

اردو کی دوسری شمالی بولیوں میں ترتالیس تینتالیس بھی ہے۔انتالیس کے لیے دکن میں انچالیس ہے۔ پینتالیس کے ساتھ دکنی میں چھیالیس بھی ہے۔انتالیس دکنی میں انچالیس

(سنسکرت، اٹھو انشت) ہے۔

چھیاسٹھ، اکسٹھ، اور چوسٹھ کی مماثلت میں چھ سٹ ہے۔ اس کے لیے ایک مزید مماثلت چھ ہتر کی بھی ہے۔ چھ سٹ میں آخری ''ھ'' غیر ملفوظ ہو جاتی ہے۔ اور لکھی بھی نہیں جاتی۔

اکیاسی، بیاسی۔ اِک اسی اور بے اسی ہیں۔ ''بے'' بعض بولیوں اور گجراتی میں ''دو'' ہے۔ نوے اور نودھے۔ جو سنسکرت نوتو (آدھے 'ی، کے ساتھ) سے بہت قریب ہے۔ سنسکرت غیر مصیتی دنتی ''ت'' دکھنی میں مصیتی دنتی ''ذ'' سے بدل گئی ہے۔ نود کے بعد کے اعداد اکیانو، بیانو، ترآنو، چورانو، پچانو، چھآنو، ستانو، اٹھانو، ننانو، سو ہیں۔

اعداد ترتیبی:۔

دکنی میں اعداد ترتیبی حسب ذیل ہیں۔

پہلا یا پیل۔ دُسرا، دوجا (زیادہ تر گوجری میں) تسرا، آگے مثل ادبی اردو کے، ان کے متصرف روپ پہلے، پیلے، دُسرے، دوجے، تسرے، چوتھے بھی کرتے ہیں۔

شمولی اعداد:۔

وہ اعداد جن سے ایک سے زیادہ کے شمول کا مفہوم نکلتا ہے۔ دونو، تینو، لیکن آگے چاروں، پانچوں، ساتوں وغیرہ بھی آتے ہیں۔ اس طرح سب کا شمولی روپ ''سبوں'' بھی آتا ہے۔ ایک یا یک سے واحد کے لیے یکیلا۔

اضعافی اعداد:۔

دکنی میں دُگنی اور کبھی دُگنا۔ ترگن اور تگنا، چوگنا، پچ گنا، ہیں۔ آگے عدد کے ساتھ گُنا جوڑ دیتے ہیں۔ جیسے چھ گنا۔ سات گنا وغیرہ۔

دُہرا، تہرا کی صورتیں دُہیرا، تہیرا، چوہیرا، وغیرہ ہیں۔

عدد غیر معین:۔

کئی (دور کئی) یا یک رکئی ''کئی'' بھی آتا ہے۔

سب اور سکل، سگل، بہوت اور بھوت۔

صفت مقداری:۔

غیر معین، کم،کتی، بہوت، بھوت، کچ زیاست، زیاستی، مقدار، استہنام کی صورت ۔

کتا۔ کتا۔ کیتا۔

صفات ضمیری:۔

اِتا۔ اِتا۔ اتنا۔ اُتا۔ اُتا (اتنا) جتا۔ جتا۔ (جتنا)۔ ''جتا'' مقابل ''اُتا'' آتا ہے۔

فعل:۔

فعل میں زمانے فاعل کی جنس اور تعداد کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

فعل ماضی مطلق:۔ ''آ'' اور ''یا'' پرختم ہوتے ہیں۔ جیسے:۔

کرا، کریا (کیا) سُنا، سُنیا، ہوا، لیا، سویا وغیرہ۔

ماضی ناتمام:۔ جاتا تھا۔ یاجاتا تھا۔ کھاتا تھا۔ دستا تھا۔

ماضی تمام:۔ آیا تھا۔ کھایا تھا۔ دسیا تھا۔

حال مطلق:۔ پڑتا (پڑھتا) ہے۔ سوتا ہے گا۔ (فائز) جاتے ہیں۔

حال ناتمام:۔ گزریا ہے۔ (فائز) کھایا ہے۔

ایک اور روپ آوتا ہے۔ جاوتا ہے کا بھی ہے۔

امر:۔ کی عام صورتیں مثلاً واحد حاضر لکھ، غیر شخصی Impersonal لکھیں۔

جمع حاضر لکھو، احترامی لکھئے آتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض افعال جیسے۔ دینا لینا میں جمع کا روپ دیو بھی آتا ہے۔ اور احترامی روپ ''لی ے'' (بول چال) ہے۔

مضارع:۔

عام روپ کرے، کروں (فائز) آوے، کریں، دیکھیں وغیرہ کا ہے۔ اَوے۔ جاوے بھی ہے۔

ایک مخصوص روپ ''سی'' کے ساتھ بھی آتا ہے ۔ جیسے جاسی ، تاکرسی ، ہوسی وغیرہ۔ مثالیں:۔

اِس کتاب کوں سینے پرتے ہلاسی تا (وجہی) عشق میں آئے بغیر خاطر جمع نا ہوسی۔

مضارع میں حال اور استقبال دونوں کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس لیے بعض مصنفین نے اس فعل کے روپ کو مستقبل کا روپ بھی لکھا ہے۔ بعض اسے ''سکنا'' کے ہم مفہوم سمجھتے ہیں۔ لیکن ''سکنا'' ایک فعل دکنی میں موجود ہے۔

مستقبل کی عام صورت ''گا'' کی ہے۔ جیسے :۔ چھیگا ، ہیں گے ، چلے گی۔ سنے گی۔ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ''سی'' کا مذکورۂ بالا مخصوص روپ بھی مستعمل ہے۔

فعل کی مطابقت:۔

ادبی اردو میں فعل کی مطابقت عام طور پر فاعل سے ہوتی ہے۔ لیکن متعدی افعال میں ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی شکی، اور حال تمام میں فعل کی مطابقت کی صورت بدل جاتی ہے اور وہ مفعول سے مطابقت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں فاعل کے ساتھ ''نے'' آتا ہے اور اسے علامتِ فاعل سے موسوم کرتے ہیں۔

دکنی میں فعل ہمیشہ فاعل کے مطابق ہوتا ہے اور ان مخصوص صورتوں کا لحاظ نہیں ہوتا۔ جن میں ادبی اردو میں فعل مفعول سے مطابقت کرتا ہے۔ ''نے'' کا استعمال شاذ ہے۔ لیکن اس کے آنے نہ آنے سے فعل سے فاعل کی مطابقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ذیل میں کچھ افعال کی گردانیں دی جاتی ہیں:۔

ماضی مطلق، فعل متعدی، کھانا۔ لازم سونا

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
متکلم	میں روٹی کھایا	میں روٹی کھائی	ہم روٹی کھائے	ہم روٹی کھائے، کھائی، کھائیں، کھائیاں
متکلم	میں سویا	میں سوئی	ہم سوے	ہم سوئے۔ سوئیں۔ سوئیاں
حاضر	تو کھانا کھایا	تو کھانا کھائی	تم کھانا کھائے	تم کھانا کھائے

غائب	وہ آم کھایا	وہ روٹیاں کھائی	وہ روٹیاں کھائے	وہ روٹیاں کھائے۔ کھائیں۔ کھائیاں

ماضی قریب:۔ متعدی دیکھنا۔ لازم رونا

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
متکلم	میں دیکھا ہوں	میں دیکھی ہوں	ہم دیکھے ہیں	ہم دیکھے ہیں۔ دیکھی ہیں۔ دیکھیاں ہیں
	میں رویا ہوں	میں روئی ہوں	ہم روئے ہیں	ہم روئے ہیں۔ روئی یا روئیاں ہیں
حاضر	تو دیکھا ہے۔ اہے	تو دیکھی ہے۔ اہے	تم دیکھے ہیں	تم دیکھے، دیکھی، دیکھیاں ہیں
	تو رویا ہے	تو روئی ہے	تم روئے ہیں	تم روئی ہیں
غائب	وہ دیکھا ہے، اہے	وہ روئی ہے۔ اہے	وہ روئے ہیں	وہ روئی ہیں۔ روئیاں ہیں

حال ناتمام۔ آنا

	واحد مذکر	جمع مذکر	واحد مونث	جمع مونث
متکلم	میں آرہا ہوں	میں آرہی ہوں	ہم آرہے ہیں	ہم آرہے یا رہیاں ہیں
حاضر	توں آرہا ہے۔ اہے	توں آرہی ہے۔ اہے	تم آرہے ہو	تم آرہے یا رہیاں ہیں
غائب	وہ آرہا ہے اہے	وہ آرہی ہے	وہ آرہے ہیں	وہ آرہی ہیں۔ آرہیں ہیں

مضارع۔کرنا

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
متکلم	میں کروں	میں کروں	ہم کریں	ہم کریں
حاضر	تو کرے۔کری	تو کرے۔کری	تم کری	تم کری
غائب	وہ کرے۔کری	وو کری	وو کری	وو کری

مستقبل:۔

مستقبل کی علامت ''گا'' ہے۔اس کی صورتیں حسب ذیل ہیں:۔

دھویگا۔ہوونیگا۔کرینگیٗ۔دیونگی (دونگی) آویں گی۔

مرکب افعال:۔

افعال کے ساتھ امدادی افعال کے استعمال کی صورتیں دکنی میں بہت وسیع اور متنوع نہیں ہیں۔کچھ مرکب افعال سادہ مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔لیکن اسماء اور صفات کے ساتھ امدادی افعال جوڑ کر مرکب افعال بنانے کا طریقہ عام ہے۔

امدادی افعال کی صورتیں یہ ہیں:۔الگ جاتا (وجہی) تا جاسکے۔گر پڑیا۔وغیرہ

اسماء اور صفات کے ساتھ فعل جوڑ کر مرکب فعل بنانے کی صورتیں:

کیف کھاتا۔پرہیز کرنا۔چھپ اچھنا۔چھلے آنا (چھالے پڑتا) گھر کرتا وغیرہ۔

ماضی بعید۔متعدی، پکارنا۔لازم جانا

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
متکلم	میں پکاریا تھایا اتھا	میں پکاری تھی	ہم پکارے تھے	ہم پکارے تھے اتھے پکاریاں تھیں
	میں گیا تھا اتھا	میں گئی تھی	ہم گئے تھے، اتھے	ہم گئے تھے اتھے، گیاں تھیں

حاضر	توپکاریاتھا،اتھا	توپکاری تھی	تم پکارے تھے، اتھے	تم پکارے تھے اتھے۔تم پکاری تھی۔ تھیں
	تو گیاتھا،اتھا	تو گئی تھی	تم گئے تھے،اتھے	تم گئے تھے۔اتھے۔گیاں تھیں
غائب	وہ پکاریاتھا۔اتھا	وہ پکاری تھی	وہ پکارے تھے، اتھے	وہ پکارے تھے اتھے، پکاری پکاریاں تھیں۔
	وہ گیاتھا،اتھا	دو گئی تھی	دو گئے تھے،اتھے	دو گئی تھی۔دو گیاں تھیں

ماضی تمنائی (شرطیہ) متعدی۔منگنا (مانگنا)

	واحد مذکر	جمع مذکر	واحد مونث	جمع مونث
متکلم	میں منگتا میں منگا ہوں	ہم منگتے ہم منگے ہوتے	میں منگتی میں منگی ہوں	ہم منگتے ،منگتیاں،ہم منگے ،منگی ہوتی۔ہوئیں
حاضر	تو رہنگتا۔توں منگا ہوتا	تم منگتے تم منگتے ہوتے	توں منگتی توں منگتی ہوتی	تم سے منگتے، منگتیں منگتیاں،تم منگے ،منگی ہوتی
غائب	دومنگتادومنگاہوتا	دومنگتے ہوتے	دومنگتی ہوتی	دومنگتے ،منگتیاں دو منگے۔منگی ہوتی

حال مطلق۔متعدی سُننا

	واحد مذکر	جمع مذکر	واحد مونث	جمع مونث
متکلم	میں سنتا ہوں	ہم سنتے ہیں	میں سنتی ہوں	ہم سنتے، سنتی
حاضر	تو سنتا ہے۔اہے	تم سنتے ہو	تو سنتی ہے اہے	تم سنتے ، سنتی سنتیاں ہیں
غائب	وو سنتا ہے،اہے	وو سنتے ہیں ، اہے	وو سنتی ہے،اہے	وو سنتے، سنتی ، سنتیاں ہیں

افعال ناقص:۔

حسب ذیل آتے ہیں:۔

ہے،اہے، پیگا،تھا،اتھا، تھے، تے ،اتھے، ہیں گے،ہونا،اچھنا،

مصدر:۔مصدر کی عام صورت ''نا'' کی ہے۔جیسے بولنا، دیکھنا،سونا وغیرہ لیکن ''ن'' علامت والے مصدر بھی آتے ہیں۔ جیسے رولن (رولنا) بالوکوں رولن لگیا۔ (فائز) بولن (بولنا) رہن۔دیکھن، سنّن، رکھن۔مصدر کا ایک اور روپ ''ونا'' کا بھی ہے جیسے آونا۔ جاونا۔

<u>فعل معطوفہ</u>:۔دو افعال ملانے کے لیے درمیان میں ''کر'' ''کے'' یا ''کو'' آتا ہے جیسے:۔بڑا ہے کر جانیں گے (وجہی) سمجھ کر کرتا ہے۔ڈر کو کہی (فائز) جا کے بولیا۔

افعال کا تعدیہ یا تعلیل:۔

افعال کی تعلیلیہ (Causative) صورتیں دکنی میں استعمال ہوتی ہیں۔تعلیلی افعال امر کے بعد ''و'' بڑھانے سے بنتے ہیں۔جیسے: کہوانا، دکھوانا، بلوانا۔

کبھی ''لا'' کے جوڑنے سے۔جیسے کہلانا، دیکھلانا

تمیز یا متعلق فعل۔

ایسے افعال جو فعل سے تعلق رکھتے ہیں اور افعال کی کیفیت کو واضح کرتے ہیں۔ان کی حسب ذیل نوعیتیں ہوتی ہیں۔

1۔ مقام کے لیے:۔ یہاں۔ یاں، وہاں، واں، جہاں، جاں، کہاں، کاں، آگے، اگلے، پیچھے، پچھے، پچھیں، (خاص پر گوجری میں) نزک (نزدیک) پاس۔ نیچے، اُپر، اپرالی، تل، بھیتر، بھتر، باہر، بھار، اندر، بیچ، کنے، کیں (کہیں) پر، پہ۔ پو۔

2۔ سمت کے لیے:۔ ایدھر، ادھر، اودھر، جیدھر، کیدھر، کدھن

3۔ وقت کے لیے:۔ اب، جب، جد، جو (جب) جدھاں، کب، بیگی، جلدی، ترت یا ترنت، آج، کل، سن، دن، بعد، بزان، اتال (اب) تد اجھوں، اجنوں، کبھی دو لفظ بھی ملا کر استعمال کیے جاتے ہیں جیسے جلگ (جب لگ)

4۔ <u>وضع یا طور کے لیے</u>:۔ یوں، جیوں، جیوں کر، کیوں، کیسے، کیونکر، جھٹ، جھٹ پٹ، سوا، زیادہ، زیاست، ہلکوں (ہولے) ترت۔

5۔ <u>تعداد کے لیے</u>:۔ ایک بار۔ دو بار۔ بہورا۔

6۔ ایجاب وانکار کے لیے:۔ ہو (ہاں) نیں، نہیں، نکو، ضرور۔

7۔ <u>مرکب متعلق فعل</u>:۔ پیچھے، پیچھے، کہیں کہیں، جیوں تیوں، کیتک (کتنے تک)

عطف:۔

حروف عطف دکن میں حسب ذیل آتے ہیں۔

ہور۔ اور۔ و۔ پر۔ پن۔ لیکن۔ مگر۔ بلکہ

ربط:۔

حروف اضافت:۔ کا۔ کے۔ کی۔ کیاں، کیرا، کیرے،۔ کوں۔ کو۔ سوں۔ سیں۔ سیتی۔ میں۔ منیں۔ تک۔ تلک۔ لگن۔ پر۔ اپرال۔ بیچ۔ میاں۔ میانے میاں۔ میں تے۔ میں کا

تخصیص:۔

ہی۔ چ۔ ی۔ بی۔ تو ہیں۔

تمیچ۔ (تم ہی) کھاتیچ (کھاتے ہی) ابی (ابھی) کبھیں۔ تمیں (تم ہی) تجی۔ جیوں ہی۔ دوں ہی۔ یوں ہی۔

ندا:۔

حسب ذیل ندائیہ حروف آتے ہیں۔

ارے۔ارے۔ہوت۔اُف۔ارے۔ہائے۔حیف

اجزائے کلام کی ترتیب:۔

دکنی میں اجزائے کلام کی ترتیب عام طور پر وہی ہے جو اُردو کی ہے۔یعنی افعال لازم کی صورت میں جملے میں پہلے فاعل:اس کے متعلقات پھر فعل اور متعلقات جیسے:۔

خسرو،شیریں،فرہاد،یوسف،زلیخا،لیلیٰ مجنوں،انو کا عشق فاش ہوا تو یو حکایتاں چلیاں اجنوں(وجہی)

ناموس بادشاہ عالم پناہ جاسوس کو ملیا(وجہی)

متعدی افعال کی صورت میں پہلے فاعل اور متعلقات،پھر مفعول اور اس کے متعلقات اور آخر میں فعل اپنے متعلقات کے ساتھ،جیسے:۔

اے محمدؐ سب کوں تیرے نور سوں پیدا کیا ہوں(معراج العاشقین)

کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نہیں کیا۔(وجہی)

فعل ناقص کے موقع پر پہلے مبتدا اور پھر خبر مثلاً

یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج ہے۔(وجہی)

عقل کی دوڑ بہت دور ہے۔(وجہی)

لیکن نظم میں اور زور دینے کی ضرورت سے اجزا کی ترتیب بدل جاتی ہے۔

تکرار الفاظ:۔

اُردو،کی طرح دکن میں بھی مطالب پر زور دینے کی غرض سے الفاظ دہرائے جاتے ہیں اور ان کی بعینہ یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ تکرار عمل میں آتی ہے۔

تکرار کی دو صورتیں ہیں۔

1۔ الفاظ کو ہم محل Juxta position رکھ کر جیسے:۔

بازار بازار   تمام بازاروں میں

کوچے کوچے   سارے کوچے میں

صاحب صاحب ۔احترام کے لیے ۔جسے دیکھے دنیا دار، منگئے کھڑے رہے بات پیار۔صاحب صاحب کہتے پھرتے آس پاس (وجہی)

گھر گھر (گھر گھر لوگاں پریشان۔(وجہی)

جم جم گھر آباد اچھو (نصرتی)

2۔ لیکن دکنی میں عموماً ایسی تکرار کی صورت میں دولفظوں کے درمیان ''ے'' بڑھائی جاتی ہے جیسے: گھرے گھرے۔بازارے بازار۔ٹھارے ٹھار۔میانے میان۔

3۔ اگر کوئی اسم نون پر ختم ہوتو تکرار کی صورت میں پہلے لفظ کے ''ن'' کے قبل ''ے'' بڑھائی جاتی ہے ۔جیسے :۔گاویں گاؤں ۔ٹھاویں ٹھاؤں ۔تکرار اسماء بدصفات، افعال، متعلقاتِ فعل کی ہوتی ہے ۔اوپر کی مثالوں میں صرف اسماء کی تکرار ہے۔ذیل میں متعلقات فعل، صفات، اور افعال کی تکرار کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

تماشے دیکھے گا عجب عجب (وجہی)

زار زار روتا (وجہی)

ہزار ہزار تہمت کرے (وجہی)

ہاکاں مار مار روتاں، پکار پکار روتاں (وجہی)

پھرتے پھرتے، دیتے دیتے، منگتے منگتے

جھک جھک مرتے خاطر

دنیاں لگ لگ

جدھر جدھر دل جاتا۔وجہی

تابع الفاظ:۔

دکنی میں اردو، اور دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح الفاظ کے ساتھ عموماً کچھ توابع بھی

جوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ سہارے کے لفظ جنھیں انگریزی میں گونج کے لفظ echo words کہتے ہیں اور ہندی میں پرتی دھونی شبد کہلاتے ہیں، اردو کی طرح دکنی میں بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔

1۔ تابع موضوع، جو معنی دار ہوتے ہیں اور سہارے کے لیے لفظ کے ساتھ جوڑ دیے جاتے ہیں۔ جیسے: سکال دوکال جیوں تیوں، چھند بند۔

2۔ تابع مہمل: جو بے معنی ہوتے ہیں اور محض سہارے کے لیے لفظ کے ساتھ جوڑ لیے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اُردو کی طرح دکنی میں بھی ''و'' سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے:

کھانا وانا، گھر ور، لکڑی وکڑی، پیسہ ویسہ، یہ لفظ بول چال میں آتے ہیں۔ ''و'' سے شروع ہونے والے لفظوں کی مثال زیادہ تر حیدرآباد تک محدود ہے۔ مدراس، میسور، کیرالا اور حیدرآباد کے دیہات کی بولی میں یہ ''گ'' سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے:۔
کھانا گینا۔ روٹی گیٹی۔ پانی گینی وغیرہ۔

دکنی میں جہاں ''گ'' استعمال ہوتی ہے وہ دراوڑ اور خاص طور سے تلگو زبان کا اثر ہے۔ جس میں تابع موضوع اکثر ''گ'' سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے:۔
رالو، گیملو، الو، گلو وغیرہ۔

عورتوں کی زبان

کم وبیش ہر ملک میں عورتوں اور مردوں کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں یہ فرق بہت زیادہ تھا اور اب بھی باقی ہے۔

قدیم زمانے کے نیم متمدن جرگوں یا قبیلوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے الگ الگ حلقے تھے اور ان کے اشغال اور کام بھی جدا تھے۔ اس وجہ سے ان کی بولیوں میں بھی فرق پیدا ہو گیا تھا۔ مرد بہت سے ایسے الفاظ اور کلمے استعمال کرتے تھے جو عورتیں سمجھ تو لیتی تھیں لیکن کبھی زبان سے نہیں نکالتی تھیں۔ ایسے کلمے صرف مردوں سے مخصوص ہوتے تھے۔ اسی طرح عورتوں میں ایسے الفاظ اور کلمات کا رواج تھا جو مرد کبھی زبان پر نہیں لاتے تھے اور جو کبھی کوئی استعمال کر بیٹھتا تو اس کی خوب ہنسی اُڑائی جاتی تھی۔ مثلاً جسم کے بعض اعضاء یا رشتوں کے نام مردوں اور عورتوں میں الگ الگ ہوتے تھے۔ مرد عورتوں کے لفظ اور عورتیں مردوں کے لفظ نہیں بولتی تھیں۔ بعض قبائل میں عورت اپنے خسر یا بھائی کا نام نہیں لیتی۔ اِس میں یہاں تک احتیاط برتی جاتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا لفظ کسی لفظ کا کوئی جز ایسا ہے جو ان کے نام کے مماثل ہے یا اس کی آواز ان سے ملتی جلتی ہے تو ان ناموں کی جگہ اس معنی کا کوئی دوسرا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ ان میں بعض رسمیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کا ہمارے ملک میں

اب تک رواج ہے ۔مثلاً جب تک مرد کھانا نہیں کھا چکتے عورتیں نہیں کھاتیں یا عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتیں ۔بعض قبائل میں عورتیں شوہر کا نام نہیں لے سکتی تھیں ۔ ہمارے یہاں اب تک یہ رواج چلا آرہا ہے ۔ جب کبھی ایسی ضرورت آپڑتی ہے تو اسے اپنے بیٹے یا بیٹی کے نام سے منسوب کر کے ادا کرتی ہیں ۔جیسے اصغر یا رشیدہ کے ابا۔

ایک مشہور لطیفہ ہے کہ ایک بیوی کے میاں کا نام رحمت اللہ تھا ۔ وہ جب نماز پڑھ کر سلام پھیرتیں تو السلام علیکم ورحمتہ اللہ کے بجائے ''السلام علیکم تھمے کے ابا'' کہتیں ۔ کیونکہ میاں کا نام لینا خلاف تہذیب ہے ۔

ہندو مذہب میں عورت کا درجہ مرد سے بہت کم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت ڈراموں میں عورتیں اور نوکر چاکر اور شودر عام بول چال یا پراکرت میں باتیں کرتے ہیں ۔ اور راجہ اور برہمن اور بڑی ذات والے سنسکرت میں ۔

جرمنی اور یورپ کے بعض ممالک میں یہودیوں کی بول چال کی زبان اب تک یدش تھی (اسے بعد میں ادبی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی) یہ جرمن زبان کی ایک شاخ سے مخلوط ہو کر بنی ہے ۔اس کا دوسرا نام'' عورتوں کی جرمن،، تھا۔ ایک مدت تک مردوں کے لیے اس زبان کا استعمال یا اس زبان کی کتاب پڑھنا شرم کی بات خیال کیا جاتا تھا ۔ کیونکہ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی مقدس زبان عبرانی سے واقف ہوں ۔عورتوں کے لیے عبرانی کا جاننا لازم نہ تھا ۔اس لیے وہ اپنی نماز اور دعائیں وغیرہ اس عوامی زبان میں پڑھ سکتی تھیں ۔لیکن مردوں کے اس زبان میں دعائیں وظیفے وغیرہ پڑھنے کے یہ معنی تھے کہ وہ عبرانی سے ناواقف ہیں جو یہودی تہذیب میں سخت عیب بلکہ ایک قسم کی معصیت سمجھی جاتی تھی ۔

اب بھی تمام زبانوں میں کچھ نہ کچھ یہ فرق کیا جاتا ہے ۔لیکن ہماری زبان میں یہ فرق بہ نسبت دوسری متمدن زبانوں کے بہت زیادہ پایا جاتا ہے ۔اتنا زیادہ کہ عورتوں کی زبان ہی الگ ہوگئی تھی ۔اس کی بڑی وجہ پردہ ہے ۔ پردے میں رہ کر انھوں نے اپنی دنیا ہی الگ بنالی تھی ۔ان کے شغل بھی جداگانہ ہیں ۔ پکانا، ریندھنا سینا پرونا، گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور غور و پرداخت، منگنی، شادی بیاہ اور اس کی بیسیوں رسمیں، طرح طرح کی تقریبیں، تیوہار، رسوم، کچھ مذہبی

کچھ نیم مذہبی، کچھ توہمات پر مبنی ان سب کا اہتمام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تفریح اور تفنن، دل بہلائی اور مصروفیت کے لیے نئی نئی رسمیں ایجاد کیں اور ان کے لیے لفظ بھی نئے نئے تراشے مثلاً کونڈا یا کونڈے، یعنی کسی ولی کی نذر و نیاز کرنا اور کونڈوں میں کھلانا۔ یا بیوی کی صحنک (سہنک) یعنی حضرت فاطمہؓ کی فاتحہ یہ نیاز عورتیں کسی مراد کے برآنے پر دلواتی ہیں اور اسے سہاگن یا پارسا سیدانیوں کے سوا کسی اور کونہیں کھانے دیتیں۔ اسے بیوی کی نیاز بھی کہتے ہیں۔ یا بیڑی پہنانا، یعنی حضرت بوعلی قلندر کی منت کے نیلے سوت کے لچھے پہنانا، غنیمت ہے کہ ان موقعوں پر اللہ میاں کی یاد باقی رہتی ہے اور ان بے چاروں کے طفیل ان پر بھی نیاز ہوتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توہمات خاص طور سے عورتوں کے حصے میں آگئی ہیں۔ یہ کچھ ہمارے ہی ملک کی عورتوں کا خاصہ نہیں۔ یہ دبا سب ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ البتہ جن ملکوں میں تعلیم کم ہے وہاں اس کا زور زیادہ ہے۔ قبر پرستی ہمارے ہاں عام ہے۔ اس میں مرد عورت سب مبتلا ہیں۔ لیکن عورتیں زیادہ خوش عقیدہ ہوتی ہیں۔ اور درویشوں، فقیروں، ملّانوں، سیانوں کی خدمت زیادہ کرتی ہیں۔ اور وہ ان کو خوب جھانسے دیتے ہیں۔ تعویذ، گنڈے، جادو، منتر، ٹونے، ٹوٹکوں کی عورتیں زیادہ قائل ہیں۔ طرح طرح کے بے شمار ٹونے، ٹوٹکے ایجاد کر رکھے ہیں۔ بیماری سے چھٹکارا حاصل کرنے یا کسی کی محبت، پیار یا پھوٹ ڈالنے یا میاں کو اپنی طرف زیادہ مائل کرنے اور اسی قسم کی دوسری مرادوں کی خاطر عجیب عجیب قسم کے ٹوٹکے کرتی ہیں۔ اس کا رواج جاہل عورتوں میں زیادہ ہے۔

ان کے اپنے بزرگ اور ولی بھی عجیب طرح کی مخلوق ہیں۔ مثلاً شیخ سدّو، ننھے میاں، زین خان، چہل تن، شاہ دریا، سکندر شاہ اور پریاں وغیرہ ان کی منتیں مانتی اور نیاز دلواتی ہیں۔ رنگینؔ کا شعر ہے۔

کسی کو جی سے ہے اخلاص شیخ سدّو سے
گنے ہے آپ کو ننھے میاں کی کوئی حرم

صاف ستھرا فرش بچھاتی ہیں اور شیخ سدّو یا ننھے میاں یا دوسرے بزرگ یا پریاں ان کے سر پر آتی ہیں۔ یہ بیٹھک کہلاتی ہے اور پریوں کی نیاز کی چیز طبق مراد برآنے کے لیے مسجد یا کسی پیر

یا ولی کے مزار کے طاق میں چراغ جلا کر پھول بتاشے وغیرہ چڑھانے کو طاق بھرنا کہتے ہیں۔اس قسم کی اور بہت سی بدعتیں ہیں۔

بعض ایسے اسماء یا الفاظ کے لیے جو عام طور پر بولے جاتے ہیں، عورتوں نے اپنے خاص الفاظ ایجاد کیے ہیں۔اس جدت میں کچھ واقعیت بھی ہے۔مثلاً چاند کے لیے اوپر والا، چیلوں کے لیے اوپر والیاں، دھوبن کے لیے اُجلی، جھاڑو کے لیے ستھرائی، چھپکلی کے لیے مرداری۔ جی یا ضمیر کے لیے اندر والا۔رات کے وقت سانپ کا نام نہیں لیتیں۔اس کے بجائے رسی یا ماموں کہتی ہیں۔

بعض لفظ اور محاورے بہت خوبصورت بنائے ہیں۔ جیسے منہ بھرائی، رشوت کے معنوں میں۔ ناک چوٹی گرفتار (بڑی نخوت و پندار والی) منہ پھوڑ کر کہنا (بے شرم ہو کر کہنا) مانگ سے ٹھنڈی (سہاگن)۔کالے کوس۔دال میں کچھ کالا ہے۔خشکہ کھاؤ (جاؤ اور خوش رہو)۔دو بول ہنس لینا۔دو پار۔اب سے دور (خدا نہ کرے) ملیا میٹ۔ جلے پاؤں کی بلی (جو ایک جگہ قرار سے نہ بیٹھے گھر گھر پھرے)۔ناک نہ رہنا۔(کچھ شرم وغیرت نہ رہنا) گھر گھالنا۔ کوکھ کی ٹھنڈی (آل اولاد والی) اکل کھری۔بلّی۔نموہی (بے زبان کم ہونے والی) جاؤ۔ ناک چنے چبوانا۔آٹھ آٹھ آنسو رونا۔لتری (لگانے بجھانے والی) بڑبھس (بڑھاپے میں جوانی کی حرکتیں) اللّذی نہ اُللذی۔تو بے جوڑنا (جھوٹی تہمتیں باندھنا) ٹسوے بہانا۔ پیٹ کی ہلکی۔ رنگیلی (بدذات)۔صبر سمیٹنا (طوفان لینا) لگانا بجھانا۔ چھاتی پر مونگ دلنا۔ ہاتھ پتھر تلے ہونا (مجبور ہونا) دودوں سے ہونا۔کھٹائی میں ڈال رکھنا۔کن سوئیاں لینا (چھپ کر سننا)۔سنکو (چھپ کر سُننے والی) اللّے تللّے۔ات گت۔تلاملی۔انگلیٹ (بدن جسامت) دست و قلم (لائق لکھی پڑھی) دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔کوڑھ میں کھاج۔ چھاتی کا پھوڑنا۔ناک چنے چبوانا۔ پڑ رہنا۔ پلک دریاؤ۔ (سخی) دانہ زد (بخیل) بوڑھ سہاگن ہو (دعا)۔بڑما (چھوٹے سن میں بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرنے والی) ہوائی دیدہ (شوخ، بے شرم) ہزاری روزہ (ماہ رجب کی ستائیسویں تاریخ کا روزہ جس کا ثواب ہزار روزوں کے برابر خیال کیا جاتا ہے) بستار کرنا (بات کو بہت طول دینا) اپنی ایڑی دیکھ (جب کوئی کسی کے حسن یا کسی اور چیز کی تعریف کرتا ہے تو

کہتی ہیں ۔ اپنی ایڑی دیکھ تا کہ نظر نہ لگے) بیدید ۔ (بے مروّت) بڑمہی (سورنی) ۔ کلموہی (کالے منہ کی ۔ منحوس) للو (زبان) توبہ تلّا کرنا ۔ للّو پتو (خوشامد) چھل بنے (فریب) چھدّا اتارنا ۔ نین تتی (بہت رونے والی) ۔ نکتوڑا ۔ دماغ چوٹی (نخوت والی) اوڑا (کال توڑا) کا کلوتی (مامتا محبت) ایسے الفاظ اور محاوروں کو جن کے بولنے میں شرم وحیا مانع ہے یا جن میں وہم یا بدشگونی کا پہلو ہے یا جن سے وہم پیدا ہوتا ہے وہ بہت لطیف پیرائے میں یا رمز و کنایے یا استعارے وغیرہ کے ذریعے ادا کرتی ہیں ۔ مثلاً:

ناواں ۔ (جو نام لینے کے قابل نہیں) مراد حیفہ

ناویں ۔ سورۂ یٰسین ، کیونکہ وہ مرتے وقت پڑھی جاتی ہے

ان گنا مہینہ ۔ حمل کا آٹھواں مہینہ ۔ عورتیں آٹھویں مہینے کو اس لیے منحوس خیال کرتی ہیں کہ اٹھوانسا بچہ نہیں جیتا ۔ اس لیے اسے ''ان گنا'' (یعنی جو گننے میں نہیں) کہتی ہیں ۔

ان گنا برس ۔ آٹھواں برس ۔

میٹھا برس ۔ تیرھواں یا اٹھارھواں برس ۔

اڑا کرنا ۔ (چراغ کے ساتھ) گُل کرنا یا بُجھانا ۔

بڑھانا ۔ (پوشاک) دکان ۔ دسترخوان ۔ دودھ (بچوں کا) یا چراغ ۔ کے ساتھ) کیونکہ اُتارنا ، بند کرنا ، اُٹھانا ، چھڑانا ، گُل کرنا ، اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔ بدشگونی کی بات ہے ۔

پاؤں بھاری ہونا ۔ حاملہ ہونا

تخت کی رات ۔ شبِ عروسی

ٹھنڈیاں ۔ چیچک جیسے ، ٹھنڈیاں نکلی ہیں

جی بھاری کرنا ۔ رنج وغم کرنا ۔ رونا دھونا

دن (یا معمول کے دن) ٹل جانا ۔ ماہواری کے ایام گزر جانا

دو جی سے ہونا ۔ حاملہ ہونا

رسّی یا (ماموں) سانپ

زمین دیکھنا ۔ قے کرنا

سُناونی۔ کسی کے مرنے کی خبر

کرتوت۔ بُرا کام (جادو کے معنوں میں بھی آیا ہے)

منہ بھرائی۔ رشوت

پھول۔ 1۔حیض۔2۔ تیجا سوم

بے نماز ہونا۔ حیض آنا

روٹی یا بڑی اُٹھانا۔یا بڑی چیز اُٹھانا: قرآن شریف کی قسم کھانا۔ جسے نہانے کی حاجت ہوتی ہے وہ قرآن شریف کا نام نہیں لیتی ہے

پھر مانگ۔ فقیر کو صاف جواب دینے کے بدلے یہ کہتی ہیں

باگ موڑنا۔ چیچک کے دانوں کا مرجھانا۔

پگڑی والا۔ حکیم۔رات کو یا صبح کو بد شگونی کے خیال سے نام نہیں لیتیں۔

میلے سر سے ہونا۔ کپڑوں سے ہونا

امن چین۔ بھونچال۔

پھول پڑنا۔ آگ لگنا۔

پنڈا پھیکا ہونا۔ حرارت یا بخار ہونا۔

چوڑیاں ٹھنڈی کرنا ہونا۔ چوڑیاں توڑنا یا ٹوٹنا

ہونے کے دن آئے۔ کپڑوں سے ہونے کے دن آئے

تصدق ہونا۔ مرنا یا انتقال ہونا۔

عورتوں کی کہاوتیں بھی دل چسپ اور پُر معنی ہوتی ہیں۔ان کہاوتوں سے ان کی معاشرتی زندگی اوران کے خیالات و جذبات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان میں خیال کا اظہار سہل اور ٹھیٹ الفاظ میں حیرت انگیز اختصار سے کیا گیا ہے اور وہ ہماری زندگی پر پوری طرح چسپاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مقبول اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی نظر زندگی کی جُزئیات پر کس قدر گہری ہوتی ہے۔مثال کے طور پر چند کہاوتیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔

منہ لگائی ڈومنی گاوے تال بتال۔ کیا ننگی نہائے گی، کیا نچوڑے گی۔ من بھائے مُنڈ یا ہلائے۔ رانی کو رانا پیارا، کانی کو کانا پیارا۔ بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ بھس میں چنگی ڈال، جمالو الگ کھڑی۔ بڑھیا کا کاتا جوان کا کھاجا۔ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ اندھے کی جورو کا اللہ بیلی۔ گڑ کھاؤں، گلگلوں سے پرہیز۔ پھٹ پڑے وہ سونا، جس سے ٹوٹے کان۔ کچھ گیہوں گیلے، کچھ جندرے ڈھیلے۔ سچی بات سعد اللہ کہیں سب کے من سے اُترے۔ آنکھیں ہوئیں چار دل میں آیا پیار۔ آنکھیں ہوئیں اوٹ، دل میں آیا کھوٹ۔ جوڑ جوڑ مر جائیں گے، مال جنوائی کھائیں گے۔ سر سہلائے اور بھیجا کھائے۔ گدھے کا کھایا کھیت، جس کا پاپ نہ پُن۔ جس ہانڈی میں کھائیں اسی میں چھید کریں۔ کسو کے کیے گھی گھڑے، کسو کے کیے پتھر پڑے۔ کانڑا مجھے بھاوے نہیں اور کانڑے بن سہاوے نہیں۔ جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ نہ کر ساس بُرائیاں تیرے آگے بھی جائیاں۔ جوں جوں بھیگے کالی ووں ووں بوجھل ہو۔ پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کٹوانا۔ اپنے نین گنوا کے در در مانگے بھیک۔ تو ے کی تیری ہاتھ کی میری، بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔ گھی بناوے سالنا اور بڑی بہو کا نام۔ گھر کی مُرغی دال برابر۔ مرغی کا گوہ لیپنے کا نہ پوتنے کا۔ سونے کا نوالہ کھلاؤ، شیر کی آنکھ دیکھو۔ ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلاوے۔ کلّا چلے ستر بلا ٹلے۔ کام کا نہ کاج کا سیر بھر اناج کا۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ دبی بلّی چوہوں سے کان کترائے۔ آٹے کا چراغ باہر رکھو تو بُجھ جائے، اندر رکھو تو چوہا کھائے۔ باسی رہے نہ کُتا کھائے۔

ایسی بیسیوں مثلیں جو عورتیں بلا تکلف اپنی بول میں استعمال کرتی ہیں۔ مردوں کی گفتگو میں اتنی نہیں آتیں جتنی عورتوں کی بول چال میں۔ اس سے ان کی بات چیت میں خاص لطف، دلکشی اور چٹخارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے بنانے میں زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہے۔ عورتوں کے گیت بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی زبان بھی ویسی ہی سادہ اور پیاری ہے۔ جیسی ان کی کہاوتوں کی۔ ان سے ان کے جذبات کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ان میں زیادہ تر شادی، بیاہ، میکے کی یاد، فراق برسات وغیرہ کے جذبات ہوتے ہیں۔

عورتوں کی آواز، لہجے اور ادا میں نزاکت، لطافت، نرمی اور لوچ ہوتا ہے ان کی زبان ہلکی پُھلکی اور ان کے بول شیریں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ دُرشت اور کرخت الفاظ کو بھی سہل بنالیتی ہیں۔ جیسے نعوذ باللہ کو نوج یا نج۔ یا افراط تفریط کو افرا تفری بنالیا ہے، طعن وتشنیع کو طعنے تشنے یا قدر ومنزلت کی جگہ ''قدر منزل'' کہتی ہیں۔ بعض عربی الفاظ میں ذرا سے تغیر سے خاص معنے پیدا کیے ہیں۔ جیسے ظلمی، غضبی، فضیحتی (بولنے میں فضیتی) بھیانی۔ حلولا (حلال)۔ قدری (سعی تردد) بعض الفاظ کے معنی ان کی زبانوں میں کچھ اور ہی ہوگئے ہیں جو اصل معنی سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً دباغت، اغماص۔ کلفت کشش۔

تلفظ کے فرق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قدیم دور سے مرد کو زندگی کی کشاکش اور ہنگاموں سے سابقہ رہا ہے اور کاروبار محنت مشقت اور غل غپاڑے میں بسر کرنی پڑی ہے۔ اس لیے اس کے تلفظ اور آواز میں کرختگی اور درشتی پیدا ہوگئی ہے۔ عورتوں کی زندگی زیادہ تر گھروں کے اندر بسر ہوتی ہے اور زندگی کے سخت کاموں اور پُر شور ہنگاموں سے سابقہ نہیں پڑتا۔ اس لیے ان کے تلفظ اور آواز میں نرمی آجاتی ہے۔ علاوہ تلفظ کے ان کا طرز ادا بھی نرم اور لطیف ہوتا ہے۔

جولڑکے گھروں میں عورتوں میں پلتے اور گھروں میں گھسے رہتے ہیں۔ ان کی بول چال میں بھی لب ولہجہ کی نرمی آجاتی ہے۔ عورتوں کے لفظ اور محاورے ان کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ بہت دنوں کا ذکر ہے کہ میں دلی میں ایک دوست سے ملنے جارہا تھا۔ گلیوں میں راستہ بھول گیا۔ ادھر سے ایک صاحب زادے جارہے تھے۔ میں نے ان سے پتہ دریافت کیا۔ انھوں نے بہت تفصیل سے بتایا کہ پچھلی گلی سے ہوتے ہوئے بائیں طرف مُڑ جایے۔ اُس گلی کے ختم پر ایک سڑک ملے گی۔ اُس پر ہو لیجیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے پوچھا۔ کیا زیادہ دور ہے۔ کہنے لگے نہیں زیادہ دور نہیں دو پیسے ڈولی ہے۔ اُس وقت مجھے بے اختیار رنگین کا یہ شعر یاد آیا۔

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کرلو
کہ یاں سے کے پیسے ڈولی کہا رو

عورتیں زیادہ قدامت پسند ہوتی ہیں۔ زبان کے معاملے میں بھی ان کی یہی حالت ہے۔ ان کے تلفظ میں مرد کی نسبت زیادہ صحت اور صفائی ہوتی ہے۔ وہ زیادہ تر سادہ اور خالص

زبان استعمال کرتی ہیں اور غیر یا نئے الفاظ اور ترکیبیں ان کی زبان پر نہیں چڑھتیں۔ اس لیے مرد کے مقابلے میں عورتوں نے زبان کی زیادہ حفاظت کی ہے۔

نسبتاً عورتوں کے الفاظ کا ذخیرہ بھی کم ہوتا ہے۔ قدامت پسندی کی وجہ سے عورتیں عام شاہراہ سے بہت کم ہٹتی ہیں۔ ایسے الفاظ اور کلمے جو بہت پامال اور فرسودہ ہو گئے ہیں، مرد خاص کر ان کے استعمال سے بچتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لفظ اور کلمے ایجاد کرتے ہیں۔ اس سے اظہار خیال کی راہیں کھل جاتی ہیں جو زبان کی ترقی کا موجب ہوتی ہیں۔ عورتیں اپنی پرانی روش کو کم چھوڑتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعلیم اب تک بہت محدود رہی ہے۔

عورتوں میں زبان کا خاص ملکہ ہوتا ہے وہ مرد کی نسبت لفظوں سے جلد لگاؤ پیدا کر لیتی ہیں۔ وہ زیادہ سنتی جلد سیکھتی۔ زیادہ تیز پڑھتی اور جلد جواب دیتی ہیں۔ وہ بڑی باتونی ہوتی ہیں۔ بولنے پر آتی ہیں تو بولتی ہی چلی جاتی ہیں۔ رُکنے کا نام نہیں لیتیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے (یہ محاورہ بھی عورتوں کا ہے) ایک چینی مثل ہے کہ ''زبان عورت کی تلوار ہے جسے وہ کبھی زنگ نہیں لگنے دیتی'' مرد ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر بولتا ہے۔ لفظوں کو تولتا، جانچتا، اور پڑتالتا ہے۔ معنی اور صورت دونوں کا خیال رکھتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مردوں میں تتلانے اور ہکلانے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن علمی اعتبار سے لسانیات کی ترقی میں عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

ان کے زیادہ بولنے اور باتیں کرنے کی ایک وجہ بھی ہے کہ زمانۂ قدیم سے مردوں اور عورتوں کے کاموں کی تقسیم ایسی رہی ہے کہ اس میں مردوں کو عورتوں کی نسبت باتیں کرنے کا موقع بہت کم ملا ہے۔ مثلاً مرد شکار یا جنگ و جدل جیسے کاموں میں مصروف رہتے تھے جن میں باتیں کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ بلکہ بولنا چالنا مضر اور خطرناک ہوتا۔ عورتیں زیادہ تر خانہ داری کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ بچوں کی پرورش، کھانا، پکانا، سینا پرونا، دھونا دھلانا، چرخا کاتنا وغیرہ یہ کام مل کر یا ایک جگہ اکٹھی ہو کر کرتیں۔ کام بھی کرتی جاتیں اور ساتھ ہی ساتھ باتیں اور گپ شپ بھی کرتی جاتیں۔ قصبات اور دیہات میں یہ رواج اب تک باقی ہے۔

عورتیں تصغیر کے کلمے زیادہ استعمال کرتی ہیں۔ محبت اور پیار ان کے خمیر میں ہے۔ دوسروں کے خوش کرنے یا اپنی طرف مائل کرنے کا بھی ان میں زیادہ ملکہ ہے اس لیے باتوں میں دل لبھانے والے الفاظ اور کلمے استعمال کرتی ہیں۔ اپنے بچوں سے وہ انھیں کے توتلے اور چھوٹے چھوٹے لفظوں میں باتیں کرتی ہیں۔ وہ اس طرح باتیں کر کے نہ صرف ان کی ہم زبان ہونا بلکہ ان میں گھل مل جانا چاہتی ہیں۔ ان کا یہی شیوہ ''من تو شدم تو من شدی'' اپنے ہر محبوب کے ساتھ ہے۔ اس لیے بچوں کے ناموں کو پیار سے چھوٹا کر کے بولتی ہیں اور یہی نام ان کے زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شمس الدین کو شمو، زین الدین کو زینو، حبیب حسن کو حبو، شمس النساء کو شمسو، نجیب النساء کو نجو یا نجبین۔

عورتیں طبعاً غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ سے بچتی ہیں اور ان کو خوبصورت جملوں یا ہیر پھیر کر لطیف پیرائے میں ادا کرتی ہیں۔ ہمیں عورتوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے زبان میں نفاست اور لطافت پیدا کر دی ہے۔ گالی گفتار کے کلمات مردوں کی زبان پر ہوتے ہیں۔ عورتیں ایسے لفظ نہیں بولتیں اور بہت ناپسند کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ گالی گلوچ یا فحش کلمات جن مردوں کے تکیہ کلام ہو جاتے ہیں وہ بھی عورتوں کے سامنے ایسے الفاظ بولنے میں احتیاط کرتے ہیں لیکن طعن تشنیع اور کوسنوں کا ذخیرہ عورتوں کے پاس بھی کچھ کم نہیں۔ جب وہ اپنی والی پہ آ جاتی ہیں تو اس وقت کوئی دیکھے کہ ان کے منہ سے کیسے کیسے پھول جھڑتے ہیں اور نگوڑا، نگوڑی، اُڑ جائے، آگ لگے، لُو کا لگے، موا، موڑی کاٹا جیسے لفظ تو ان کا تکیہ کلام ہیں۔

عورتوں کی زبان کا ذکر آئے اور ریختی کا نام نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ اس جدت کا سہرا لکھنؤ کے سر ہے۔ وہاں کا ماحول اس کے مناسب تھا اور یہ وہیں جنم لے سکتی تھی۔ رنگین نے ابتدا کی اور پھر بہت سے ان کے پیرو پیدا ہو گئے۔ اِن ظالموں نے کمال کر دیا ہے۔ نقل کو اصل بنا دیا ہے۔ عورتوں کے الفاظ، ان کے محاورے اور کہاوتیں، ان کی بول چال اور طرزِ بیان کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ عورتیں بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ بعض من چلے تو ایک قدم اور آگے بڑھے اور اوڑھنی اور ڈوپٹا اوڑھ کر احباب کی صحبتوں یا مشاعروں میں عورتوں ہی کے لب و لہجہ میں اسی ناز و انداز سے ارشاد فرماتے تھے۔ اگر چہ ان حضرات نے اپنے کلام میں بہت کچھ

خرافات اور فحش بکا ہے لیکن اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس ذخیرہ میں بیگمات کے وہ تمام الفاظ اور محاورے وغیرہ محفوظ کر دیے جو اب ملتے جاتے ہیں اور جن کا آئندہ سمجھنا دشوار ہوتا۔

علاوہ ریختی کے جس کا ایک حصّہ بہت ناپاک ہے۔ ہمارے بعض ادیبوں نے اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ مولوی نذیر احمد، مولوی سید احمد، منشی فیض الدین، راشد الخیری اور بعض صاحبوں نے موقع محل کے لحاظ سے اس زبان کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ عورتوں کا ہماری زبان پر بڑا احسان ہے۔ انھوں نے اس میں بڑی بڑی جدتیں اور لطیف پیرایے نکالے ہیں اور اب اُن کی زبان کے بہت سے لفظ اور محاورے مردوں کی زبان میں بھی آ گئے ہیں اور ہمارے ادب کی رونق ہیں۔ مثلاً چُھڈا اُتارنا۔ چار چاند لگنا۔ کسی کے سر سہرا ہونا۔ اپلے گہلے پھرنا۔ پیٹ کا ہلکا۔ کالے کوس۔ دال میں کالا ہونا۔ بڑبھس وغیرہ۔ بیسیوں ایسے الفاظ اور محاورے ہیں جو اب عام طور پر مردوں کی زبان پر آ گئے ہیں اور وہ بلا تکلف بولتے ہیں۔

میسور کی دکنی اُردو

میسور میں اُردو دکنی کے روپ میں مسلمانوں کی مادری زبان کی حیثیت سے کئی صدیوں سے رائج ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے میسور میں دکنی اُردو کے آغاز و ارتقا کی مختصر تاریخ بیان کردی جائے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ دکنی اُردو کا ورثہ کتنا قدیم ہے اور میسور میں اس ورثے کی ترقی وتحفظ کے کیا کیا اسباب وعلل ہوئے۔

خلجیوں کی فتوحاتِ دکن کے زمانے سے جنوبی ہند کے اور علاقوں کے ساتھ ساتھ میسور میں بھی اردو کے خدوخال اُبھرنے لگے۔ گلبرگہ، گولکنڈہ، بیجاپور، وغیرہ مقامات میں بہمنی ،قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے قیام کے بعد شاہی سرپرستی اور ادیبوں اور شاعروں کا سہارا پاکر یہ زبان بول چال کی حدود سے نکل کر ادب کی منزل میں آگئی اور دکنی ادبیت کے روپ میں اپنے مزاج ومنہاج، رنگ وآہنگ اور انفرادیت کی تشکیل کرنے لگی۔ اس طرح کوئی چار سو برس کے طویل عرصے میں دکنی زبان وادب کے اثرات آہستہ آہستہ کم وبیش پورے جنوبی ہند میں پھیل گئے۔

میسور میں دکنی اُردو کو یہ مواقع نصیب نہ ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصۂ دراز تک اس کی ترقی نسبتاً سست رہی۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے دورِ حکومت میں دکنی اُردو کو اپنی

پوری آب وتاب سے چمکنے کا موقع ملا۔ اس عرصے میں یہاں دکنی کی جو کچھ بھی نشو ونما ہوئی اس کی تمام تر ذمے داری رشد وہدایت کی غرض سے آنے والے صوفیائے کرام اور فوجی ملازمت کے سلسلے میں وارد مقیم مسلم عوام کے سر رہی جو اطراف واکناف سے وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے۔ آنے والوں میں زیادہ تر تعداد، ان لوگوں کی تھی جن کا تعلق بیجاپور سے تھا۔ جو دکنی کا ایک اہم مرکز تھا۔ آج بھی میسور میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن کے اجداد بیجاپور سے یہاں چلے آئے تھے۔ اس طرح سرزمین میسور پر ملک کافور کے حملہ دکن سے لے کر اورنگ زیب کی فتح دکن تک دکنی بولنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے ہزاروں لاکھوں تک پہنچ گئی۔ (موجودہ زمانے میں یہ تعداد تقریباً 25 لاکھ ہے) اس دوران میں شمالی ہند کی اُردو کی لسانی لہریں کئی مرتبہ جنوبی ہند پہنچیں اور یہاں کی دکنی کو متاثر کرتی رہیں۔ ساتھ ساتھ جنوبی ہند کی دراویدی زبانوں نے بھی اپنا اثر دکنی پر ڈالا۔ ان لسانی تاثرات کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اُردو کا دھارا ایک خاص سمت میں بہنے لگا جو شمالی ہند کے اُردو کے دھارے سے مختلف تھا۔

میسور میں دکنی اُردو بولنے والوں کی تعداد زمانہ بہ زمانہ بڑھتی رہی۔ دکنی بولنے والے سارے کے سارے مسلمان تھے اور ان مسلمانوں نے میسور آکر اپنے حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق سے یہاں کے ہندوؤں میں اعتبار بھی پیدا کیا اور افتخار بھی۔ باہمی میل جول اور روزمرہ کے تعلقات کے اثر سے دونوں قوموں میں کچھ سماجی رشتے بھی قائم ہوئے اور ایک دوسرے کی تہذیب اور زبان پر اس کا خوشگوار اثر پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اُردو، کنڑی زبان کے دوش بدوش مسلمانوں کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے پھولنے پھلنے لگی۔

1761 میں سلطنت خداداد کی تاسیس عمل میں آئی تو اطراف واکناف سے عالم اور شاعر بھی میسور چلے آئے۔ پھر مقامی لوگوں نے بھی دکنی اُردو کو ادبیات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ سلطنت خداداد سے ذرا پہلے اور اس کے بعد سے لے کر آج تک میسور میں اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جن میں چند قابل ذکر یہ ہیں۔

محمد سعید مہکری، عاصیؔ، شاہ صدرالدین شہبازؔ، شیرازیؔ، زینتؔ، مہتاب رائے سبقتؔ، زین العابدین، مولوی محمد خان، صاحب طربؔ، عزتؔ، اسحاقؔ، عابدؔ، تسیمؔ، غمؔ، جادوؔ مقبلؔ،

راجی، عقیل، میکش، صابر، ہری لال خوش، نفیس، نذیر، ذاتق، گردش، برق، شاہد، ضمیر، تپش، محمود ایاز، سلیم تمنائی، نعیم اقبال، سلیم مینائی، رفعت، کلیم، مصور، اختر (مالک اختر پریس منگلور)، غوث محی الدین وغیرہ۔

انیسویں صدی تک میسور میں شعر و ادب اور بول چال کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد شمالی ہند کے اثرات جب حیدرآباد اور اس کے دیگر اضلاع کی دکنی پر اثر انداز ہونے لگے تو میسور کی دکنی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اورنگ آباد کی زبان خاص طور پر شمالی ہند کی اُردو سے اتنی قریب ہوئی کہ بہت ہی کم فرق رہ گیا۔ میسور میں بول چال کی زبان پر شمال کی زبان کا اثر بہت ہی کم ہوا جس کی وجہ سے اس کی انفرادیت آج بھی قائم ہے اور اس کا دکنی روپ اب دکنی ہی ہے۔ اُردو نہ ہوسکا۔ البتہ ادب کی زبان شمالی ہند کی زبان سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ آج میسور میں تحریر کی زبان وہی ہے جو شمالی ہند کی ہے اور درس و تدریس کی ساری کتابیں شمالی ہند کی اردو میں ہی ہوتی ہیں۔ جس کو نہ صرف میسور والوں نے بلکہ پورے جنوبی ہند والوں نے معیاری مانا ہے۔

دو اور باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ میسور کی دکنی اُردو اور کچھ الگ چیز نہیں۔ مقامی اختلافات جو بہت ہی کم ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اکثر باتیں مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے۔ ماخذ ایک ہے۔ مختلف صوبوں کے لسانی ماحول کے اختلاف سے کچھ کچھ صوتی اور کچھ کچھ دیگر لسانی تغیرات پائے جاتے ہیں۔ جن کی بنا پر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ یہ میسوری دکنی ہے۔ یہ مدراسی دکنی اور یہ حیدرآبادی دکنی۔

دوسری بات یہ کہ میسور کی دکنی چونکہ کنڑی زبان کے ماحول میں پروان چڑھتی رہی ہے۔ اس لیے اس میں کنڑی زبان کے اثرات بھی دخیل ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم کو میسور کی دکنی اُردو کا جائزہ لیتے وقت ان اثرات کو خاص طور پر دیکھنا چاہیے۔ میسور میں دکنی نے اپنے آپ کو جتنا کنڑی زبان سے متاثر پایا ہے اس سے کہیں زیادہ کنڑی زبان کو متاثر کیا ہے۔ کنڑی زبان میں عربی و فارسی کے سینکڑوں لفظ اُردو کے ذریعے صدیوں سے مستعمل ہوتے آرہے ہیں۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کے عہد حکومت میں عربی فارسی کے دخیل الفاظ کی تعداد ایک دم بڑھ گئی تھی اور

آج بھی کم وبیش یہ عمل جاری ہے۔ عدالت، فوج، امور سلطنت، زراعت، وغیرہ وغیرہ کی مختلف اصطلاحیں، کنڑی زبان میں اُردو کے اثر سے راہ پا گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کنڑی زبان میں جا کر وہ کچھ لسانی تراش خراش کا شکار ہو گئیں اور اپنی اصلی حیثیت میں نہیں رہیں۔ خود اہل اردو بعض اوقات ان کی اصل کو پہچاننے سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

آیئے! اب میسور کی دکنی کی چند لسانی خصوصیات ملاحظہ فرمایئے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے میسور میں آج کل کی مروجہ دکنی اردو کی خصوصیات پیش کی جائیں گی جو کم وبیش ذرا سے تغیر کے ساتھ قدیم یعنی دوسو سال پہلے کی میسوری دکنی میں تھیں۔

۱۔ جہاں تک صوتیات کا تعلق ہے۔ میسوری دکنی کی صوتیات میں ہمیں دو ایسی اصوات ملتی ہیں جو شمالی ہند کی اردو کے نظامِ اصوات میں نہیں ملتیں۔ وہ ر ن / راور ر ٹ / رکی آوازیں ہیں۔ جن کو بین الاقوامی صوتی رسمِ خط میں ذیل کی علامتوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(n) (L)

ان اصوات کی صوتی تفصیل یہ ہے:

ن= کوز، انفی صوت (لفظ کے درمیان اور آخر میں آتی ہے شروع میں نہیں)

ن= کوز، پہلوئی صوت (لفظ کے درمیان اور آخر میں آتی ہے شروع میں نہیں)

یہ دونوں اصوات (ن) اور (ل) اصوات سے تضاد رکھتی ہیں۔ مثالیں یہ ہیں:۔

چنّا (Conna) = چاندنی

چنّا (cronna) = چڑھنا (دکنی لفظ)

تل (tol) = تلنا کا صیغۂ امر

تل ط (tol) = ناریل کا اوپر کا خول یا بکری کا چمڑا

ان مثالوں کی بنیاد پر (ن) اور ل کو الگ الگ صوتیے (Phoneme) قرار دیا گیا ہے اور دکنی نظامِ صوت میں ان کی حیثیت ممیز آوازوں کی ہے۔ یہ دونوں اصوات میسور کی دکنی میں کنڑی زبان کی دین ہیں۔

(q) (ق) کی آواز جن لفظوں میں آتی ہے اہلِ میسور اس کو (خ) کی طرح ادا کرتے ہیں۔ پنجابیوں کے مقابلے میں دکنیوں کا (ق) کو (خ) میں برقرار رکھنا غنیمت ہے۔ یہاں پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ وہ یہ کہ پنجاب میں (ق) کی آواز ہمیشہ (ک) میں بدل جاتی ہے۔ قرآن شریف کی آیت ہے کہ نماز پڑھو تو حضورِ قلب کے ساتھ پڑھو۔ پنجابی قلب کو کلب پڑھتے ہیں اور کلب کے معنے کتے کے ہیں تو اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ نماز پڑھو تو کتے کے ساتھ پڑھو۔ اسی وجہ سے میں نے کہا کہ دکنی جن میں میسوری بھی شامل ہے قلب کو خلب کہہ لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ راقم الحروف نے سنا ہے کہ علامہ اقبالؔ بھی اپنے نام کا تلفظ پنجابی طریقے پر ''اکبال'' کیا کرتے تھے۔

میسور میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور ان کی زبان جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کنڑی میں بے شمار عربی اور فارسی کے لفظ ہیں۔ کنڑی بولنے والے جب کبھی کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں (ق) کی آواز ہوتی ہے اسے (ک) سے بدل دیتے ہیں۔ انھیں اس لیے قابلِ معافی قرار دیا جانا چاہیے کہ ان کی زبان کے صوتی نظام میں (ق) کی آواز ہے ہی نہیں۔ قاسم کنڑی میں کاسم ہے (ق) کی آواز کے سلسلے میں میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ میسور میں بعض اوقات (ق) کی آواز (غ) میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً نقد، نغد ہو جاتا ہے۔

3۔ اس کے بعد (چ) کی آواز ہے جو دکنی میں ایک خاص انداز اور ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ اگر کسی لفظ کے آخر میں (چ) کی آواز شامل کر دی جائے تو تخصیص کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ دکنی میں یہ خصوصیت مرہٹی زبان کے اثر سے آئی ہے۔ مرہٹی میں یہ آواز اپنی اصل شکل میں (ت، ش) سے مرکب ہے جس کو IP.A میں (ts) سے ظاہر کیا گیا ہے۔ قدیم دکنی میں بھی اس کا استعمال رہا ہے۔ وجہی کی ''سب رس'' سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

''زلف کبی غم نکو کر، ہمت کم نکو کر، ہر ایک بلا سے سو مرد انچ پر ہے۔ صاحب درد انچ پر ہے۔''

4۔ میسوری دکنی میں (مھ) اور (نھ) اصوات (م) اور (ن) کے مقابلے کی ہائیہ آوازیں (aspirated sounds) اور الگ الگ صوتیے (phonemes) ہونے کا درجہ رکھتی

ہیں۔ تضاد ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

مینا (maina)	=	مشہور پرندہ
مھینا (mhaina)	=	مہینہ کا دکنی روپ
نانا (nana)	=	نانا (رشتہ)
نھانا (nhana)	=	نہانا کا دکنی روپ

شمالی ہند کی اُردو میں (مھ) اور (نھ) کی اصوات اگرچہ کچھ لفظوں میں ملتی ہیں لیکن ان کی حیثیت وہاں الگ صوتیے (phoneme) کی نہیں ہے۔ کیونکہ (مھ) اور (نھ) شمالی ہند کی اُردو میں م+ھ اور ن+ھ بھی ہے اور (مھ) اور (نھ) بھی۔ کمہار، ننھا وغیرہ الفاظ کا تلفظ کم+ھا، نن+ھا بھی ہے اور کمھ +ار اور ننھ +ا بھی۔ چونکہ اس طریقہ تلفظ سے مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے مھ اور نھ شمالی ہند کی اردو میں (م) اور (ن) صوتیوں کی ہم صوت (Allophones) کا درجہ رکھتی ہیں۔ میسور کی دکنی میں چونکہ ان اصوات کے تغیر سے لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی حیثیت الگ صوتیوں کی ہے۔

(مھ) اور (نھ) رکھنے والے چند لفظ بھی اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں۔ مھاڑی (بالا خانہ) مھوری (موری، نالی) نھیالی (بستر، گدا)، نھیوں (بارش، نھوے (نہیں) نھایا (نہایا)۔

5۔ میسور کی دکنی میں ہر وہ لفظ جس کے آخر میں (ھ) کی آواز ہو ہمیشہ محذوف ہوتی ہے۔ ''ساتھ'' ہمیشہ ''سات'' بولا جاتا ہے۔ کبھی کبھی لفظ کے بیچ میں واقع ہونے والی (ھ) اپنی جگہ بدل کر آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔ جیسے:۔

گنٹھا= گھنٹہ پھتر =پتھر

6۔ اگر کسی لفظ میں (ٹ ڑ) وغیرہ آوازیں دوبارآئیں تو پہلا (ٹ) ہمیشہ (ت) ہو جاتا ہے۔ مثلاً ٹاٹ= تاٹ ٹکڑا= تکڑا

7۔ (ڑھ) اور (ڈھ) کی آوازیں لفظ کے درمیان کبھی بھی بولی جاتیں۔ ان کی جگہ صرف (ڑ) اور (ڈ) کی آوازیں مستعمل ہوتی ہیں۔ مثلاً ڈھونڈھ، ڈھونڈ، گڑھا، گڑا۔

8۔ بعض الفاظ میں صوتی تبدیلیاں کچھ عجیب وغریب ہیں۔ شمالی ہند والے اس کو الفاظ کی بگڑی ہوئی شکل کہتے ہیں۔ لیکن یہ اصل میں دکنی جامہ پہنے ہوئے الفاظ ہیں۔

کھ سے خ جیسے راکھ سے راخ
گ سے غ جیسے دیگ سے دیغ
ق سے خ جیسے عقل سے اخل
ٹ سے ٹھ جیسے لوٹا سے لوٹھا
خ سے غ جیسے اخبار سے اغبار
س سے ز جیسے تسبیح سے تزبی
ر سے ڑ جیسے کرتا سے کڑتا
ت سے ٹ جیسے ٹاٹ سے تاٹ
گھ سے گ جیسے باگھ سے باگ
ڈ سے د جیسے ڈھونڈ سے دھونڈ
ک سے خ جیسے تڑکنا سے تڑخنا
د سے ذ جیسے گنبد سے گمذ
د سے ن جیسے چاندنی سے چانی
ٹ سے ٹھ جیسے لٹو سے لٹھو
ٹھ سے تھ جیسے ٹھنڈا سے تھنڈا

9۔ میسور کی دکنی نے اپ بھرنش کی ایک خصوصیت کو آج بھی اپنے اندر برقرار رکھا ہے۔ وہ الفاظ کو مشدّد کرنے کی خصوصیت ہے۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

گلی سے گلّی ندی سے ندّی گلا سے گلّا
نمک سے نمّک صدی سے صدّی ڈلی سے ڈلّی
توا سے توّا سوکھا سے سکّا پھیکا سے پھکّا
ہاتھی سے ہتّی

10۔ اب چند خصوصیات دکنی کے حروف علّت کی پیش ہیں:۔

میسوری دکنی کے حروف علّت Vowels میں ایک حرف علّت ایسا ملتا ہے جو شمالی ہند کی اردو میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے حیدرآباد کی دکنی میں اس صوت کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ صوت (ڈوپہ) اور (پوٹا) الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ انگریزی زبان میں یہ آواز Low college وغیرہ الفاظ میں موجود ہے۔ بین الاقوامی، صوتی رسم خط میں اس صوت کے لیے جو علامت مقرر ہے وہ (ɔ) ہے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اِس صوت کی تفصیل یوں کی ہے۔

> ''اس حرف علت کا تلفظ نہ تو معمولی پیش کی ہے اور نہ واؤ معروف کی طرح اس کا مخرج ہے۔ اِن دونوں کے درمیان ہے۔ یہ آواز دار ویدی ہے اور اکثر انھیں لفظوں میں پائی جاتی ہے۔ جو اس خاندان کی زبانوں سے اردو میں داخل ہو گئے ہیں۔''
>
> (ہندوستانی لسانیات)

راقم الحروف نے اس حرف علت کی تاریخ سے زیادہ ترکیب و تجزیے اور تقسیم پر غور کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صوت دکنی میں الگ صوتیہ نہیں ہے بلکہ (و) کی صوت جیسے ''دو''، ''مور'' وغیرہ لفظوں میں اسی کا ایک شائبہ Allophones ہے اور اس کی تقسیم اس طرح ہے کہ یہ صوت مشدد حرف صحیح سے پہلے واقع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر مشدد حرف صحیح کے اثر سے (د) یعنی I.P.A کی علامت کی (o) اس ماحول میں (ɔ) ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ صوت دراویدی زبانوں کی دین ہو۔ لیکن دکنی میں یہ اس طرح اثر انداز ہے کہ دکنی الفاظ بھی اسی ترکیب سے بنائے گئے ہیں۔ جن کا دراویدی الفاظ سے کوئی تعلق نہیں مثلاً (Sebbi) جس کے معنی ہیں ''سبھی'' اسی طرح سے بولا جاتا ہے جو ٹھیٹ دکنی لفظ ہے۔ اِس حرف علّت سے بننے والے لفظ گنتی کے ہیں۔

11۔ صرفی و نحوی خصوصیات میں سب سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ میسور کی دکنی میں

علامت فاعل ''نے'' کا استعمال سرے سے مفقود ہے۔ ''اپے'' جو قدیم دکنی میں آپل کی صورت میں ''آپ خود'' کے معنوں میں متکلم مستعمل ہوتا تھا۔ میسوری دکنی میں مخاطب کی ضمیر ہے۔

12۔ ''نکو'' نہیں کے معنوں میں میسور کی دکنی کا ایک جزو لازم ہے جس سے کوئی میسوری بھی آج تک بے نیاز نہ ہو سکا۔

13۔ اسی طرح مختلف ضمیریں ہیں۔ منجے (مجھے)، ہمنا (ہمیں)، تمنا (تمھیں)، تجے (تجھے)، اُنے (وہ)، اُنو (وہ جمع)۔

14۔ جمع کا قاعدہ وہی پُرانا اور آسان ہے۔ یعنی ہر لفظ کے آخر میں ''ا+اں'' کے اضافے سے جمع بن جاتی ہے۔

15۔ مونث بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں ''اں'' بڑھایا جاتا ہے۔

16۔ گنتی تو بیس کے عدد پر ٹھیک ہے۔ راہ مستقیم پر چلتی ہے اور اس کے بعد بیس پر ایک اور بیس پر دو کی کج روی آخر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اس مختصر سے مضمون میں تمام لسانی خصوصیات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے انھیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیات کسی کی نظر میں خوبی ہیں اور کسی کی نظر میں خامی۔ لیکن مجھے لسانیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے صرف اتنا کہنا ہے کہ ''زبان وہ ہے جس کو لوگ بولتے ہیں۔ زبان وہ نہیں جس کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ لوگوں کو یوں بولنا چاہیے۔''

ہر شخص کو اپنی زبان عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی بھی میسوری سے اگر اپنی زبان کے بارے میں کوئی استفسار کرے تو اس کے عقیدے کی حد تک یہی جواب ہوگا۔

'' تو دکنی ہے دکھنی بول ''

زبان اور بولی

علم زبان کا موضوع زبان ہے۔ لیکن زبان سے کئی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً
ا۔ انسان کے لیے زبان خدا کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔
بے زبان جانوروں پر ظلم نہ کرو
ب۔ مصر کی زبان عربی ہے۔

پچھلے دو جملوں میں زبان سے مراد بنی نوع انسان کی صلاحیت نطق ہے اور آخری جملے میں زبان سے مراد صوتی علامات کا ایک مخصوص نظام ہے۔ فرانسیسی زبان میں ان دونوں کے لیے مختلف الفاظ ہیں۔ اوّل الذکر کو لان گاز (Language) اور موخر الذکر کو لانگ (Langue) کہتے ہیں۔ جب ہم زبان کے آغاز کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد لان گاز ہوتی ہے۔ جب کہ ''انگریزی''، ''اردو'' وغیرہ۔ زبانیں ''لانگ'' ہیں۔

اکثر اردو، ہندی، انگریزی، فرنچ وغیرہ مختلف زبانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک لسانی جماعت یعنی ایک زبان کے بولنے والوں کی حد بندی بڑی مشکل ہے۔ ہم برعظیم ہندو پاک میں پشاور سے مشرق یا جنوب کی طرف سفر کریں تو ہمیں کہیں پر یکایک زبان کے بدلنے کا احساس نہ ہوگا۔ یعنی ہر گاؤں یا شہر والے اگلے گاؤں یا شہر کی زبان کو بآسانی سمجھ سکیں گے۔ فرانس

سے اٹلی کی طرف سفر کرتے جایئے زبان میں یوں نامحسوس تبدیلی ہوگی کہ فرنچ اور اطالوی ایک ہی سلسلۂ زبان معلوم ہوگا۔ جرمن یا ڈچ یا ناروے اور سوئیڈن کی زبانوں میں بھی اس طرح کوئی حد فاصل نہیں۔ لیکن ایک سرے والے دوسرے سرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک زبان کے علاقے سے گزر کر دوسری زبان کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ کیونکر طے ہو کہ فرنچ اور اطالوی یا پنجابی اور مغربی ہندی کے درمیان خطِ تقسیم کہاں ہے۔ یہ الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک ہی زبان کی بولیاں ہیں۔

ایک عام اصول یہ بنالیا گیا ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں وہ ایک زبان کے بولنے والے ہیں۔ اب سمجھنا ایک اضافی امر ہے۔ گاؤں والوں کی نسبت شہر والے، بے پڑھوں کی نسبت پڑھے لکھے اور ایک خطے میں عمر گزار دینے والوں کی نسبت سیاح اور جہاندیدہ قسم کے لوگ دور دور تک کی زبانیں سمجھ لیتے ہیں۔

ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

اک روز جہاں نوں جانا ہے
جا قبرے وچ سمانا ہے

(بلھے شاہ پنجابی)

بشیر نئی خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور
خود آرائی سے آئینہ طلسم موم جادو تھا

(غالب)

ان میں پہلا شعر جو پنجابی کا ہے غالب کے اردو شعر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہم دسیوں سال انگریزی پڑھنے کے باوجود انگریزی فلموں کے مکالمے نہیں سمجھ پاتے۔ میسور کے مسلمان جب آپس میں روانی سے اردو، میں بات چیت کرتے ہیں تو ایسا گماں ہوتا ہے جیسے کنڑی بول رہے ہیں۔ ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اس طرح دو شخصوں کے درمیان باہم سمجھنے کی مقدار صفر سے لے کر سو فی صدی تک بھی ہو سکتی ہے۔ کس حد تک قابل فہم ہونا ایک زبان کی علامت ہے؟ اور کس نقطے کے آگے دو تقریریں یا عبارتیں دو زبانیں ہو جاتی ہیں؟

لسانیات کا طالب علم کھڑی بولی کا مطالعہ کرنا چاہے تو کہاں کی اور کس کی بولی کو لے! جس کے بعد وہ دعوی کر سکے کہ کھڑی بولی میں فلاں آوازیں پائی جاتی ہیں اور اس کے فلاں قواعد ہیں۔لسانیات نے اس وادی سنگلاخ میں اپنی بے دست و پائی کا اعتراف کر کے یہ اصول بنایا ہے کہ صحت اور قطعیت کے ساتھ صرف ایک فرد واحد کی زبان کا ہی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

انفرادی بولی کو انگریزی میں (Dialect) کہتے ہیں ۔ ہر شخص کے بولنے کا انداز مختلف ہوتا ہے ۔ یہ اس سے ظاہر ہے کہ ہم کسی کو دیکھے بغیر محض اس کی آواز سے پہچان لیتے ہیں۔ٹیلیفون تک کی آواز سے شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی زبان میں تلفظ، لہجے، اور ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔آلات تو یہاں تک ثابت کرتے ہیں کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک بار جس طرح بولتا ہے۔ آئندہ کبھی اس طرح نہیں بول سکتا۔اس انتہائی صورت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم ایک شخص کی عمر کی ایک منزل کی زبان کو انفرادی بولی مان کر آگے بڑھ سکتے ہیں ۔اب جغرافیائی اعتبار سے ذیل کا سلسلہ ملاحظہ ہو۔

ا-----ب-----ج------د

•　　　•　　　•　　　•

مندرجہ بالا شکل میں چار نقطے انفرادی بولیوں کے مجموعے ہیں جو مختلف مقامات میں واقع ہیں۔ب کے افراد ا اور ج دونوں کی بولیاں سمجھتے ہیں۔ج والے ب اور د دونوں کو سمجھ سکتے ہیں۔لیکن ا اور د والے ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ا اور د دو مختلف زبانیں ہیں۔مسئلہ یہ ہے کہ ان کے درمیاں حدّ فاصل کہاں قائم کی جائے؟

ہم ا اور د کی ایسی خصوصیات لیں گے جو ایک کو دوسرے سے مختلف روپ دیتی ہیں۔مثلاً قواعد کے بعض اصول، بعض آوازیں اور بعض بنیادی الفاظ ان کے استعمال کے علاقے کا تعین ہو جائے تو ہم موٹے طور پر ایک لسانی سرحد قائم کر سکیں گے۔لسانی سرحد پر دراصل ایسی زبان بولی جاتی ہے جو دو زبانوں کے بین بین ہوتی ہے جس میں کچھ خصوصیات اس زبان کی اور

کچھ دوسری زبان کی ہوتی ہیں ۔ یہ سرحد جامیٹری کا سیدھا باریک خط نہیں ہوتا بلکہ ایک چوڑی سی پیچ وخم والی پٹی ہوتی ہے ۔ اس سرحد کے آس پاس ایک دوسری زبان کے جزیرے ہوتے ہیں ۔

ایک دوسرے کی زبان کی فہم کی مقدار معلوم کرنے کے کئی طریقے ہیں ۔ مختلف علاقوں کی دو انفرادی بولیوں کو لو ۔ ان کے مشترک ذخیرۂ الفاظ کا شمار کرو ۔ بعض اوقات دور دور کی بے تعلق زبانوں میں بھی بعض الفاظ ہیئت ومعنی دونوں کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ محض اتفاق ہوتا ہے ۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ میں اتفاقی مماثلت 4 فی صدی سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ بقیہ الفاظ اگر بہت بڑی تعداد میں مشترک ہوں تو ہم ایسی دو انفرادی بولیوں کو ایک زبان کا حصہ قرار دیں گے ۔ اس اصول کا اطلاق بھی اتنا سہل نہیں ۔ اشتراک کسے کہا جائے ۔

گھوڑا ۔ گھوڑو ۔ اور گھڑوا یا سانڈ اور سانڑ یا مارتا ہے اور ماروا ہے یا آٹھ اور اٹھ کو یکساں قرار دیا جائے یا مختلف ۔ بڑی مشکل ہے ۔

اس اُلجھن سے بچنے کا راستہ یوں نکالا گیا ہے کہ کسی کی بات چیت کو ریکارڈ کر لیجئے ۔ اس میں مفہوم کے حامل جتنے نکات ہیں ۔ ان کو شمار کر لیجیے ۔ دوسرے شخص کو یہ ریکارڈ سنا کر معلوم کیجیے کہ وہ کتنے کا مطلب اور نکات سمجھ سکا ۔ اگر وہ بیشتر مطالب کو سمجھ سکا ہے تو یہ دونوں افراد ایک زبان کے بولنے والے ہیں ۔ ورنہ نہیں ۔

دو شخصوں کا ایک دوسرے کی بات سمجھ لینا مشترک الفاظ کی تعداد پر منحصر ہے ۔ دو بولیوں میں مشترک یا مماثل الفاظ پائے جائیں تو اس کی دو تاویلیں کی جاسکتی ہیں ۔ 1 ۔ یا تو یہ دخیل (Loan) الفاظ ہیں ۔ 2 ۔ یا یہ دونوں کا آبائی ورثہ ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ملیالم میں کوئی اسی فی صدی سنسکرت الفاظ اور انگریزی میں تقریباً 60 فی صدی فرنچ الفاظ ہیں جو باہر سے داخل ہو گئے ہیں ۔ دوسری طرف ہندی اور بنگالی میں الفاظ کا اشتراک ان کے ہم جدی ہونے کی وجہ سے ہے ۔ تاریخی لسانیات کی مدد سے زبانوں کا خاندانی رشتہ متعین ہو جائے تو زبانوں کے وصل وفصل اور ان کی لسانی حدود طے کرنا سہل ہو جاتا ہے ۔

ہم نے اب تک قابلِ فہم ہونے کو زبان کی حد بندی کا معیار قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کسی قدر پیچیدگیاں ہیں۔ سمجھا جانا منحصر ہے ذخیرۂ الفاظ کے ایک بڑے حصے کے اشتراک یا مشابہت پر۔ ہریانی اور پنجابی میں اردو فارسی میں، انگریزی اور فرنچ میں بہت سے الفاظ مشترک یا مماثل ہیں۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر کو ایک ایرانی سمجھ سکتا ہے۔

تو کیا ہریانی اور پنجابی یا انگریزی اور فرنچ کو ایک زبان کی دو بولیاں قرار دیا جائے؟ نہیں، یہاں ہمیں اپنے اصول میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ زبانوں کے رشتے میں صرف بنیادی الفاظ رہنمائی کرتے ہیں۔ بقیہ ذخیرۂ الفاظ کی اہمیت نہیں۔ وہ بنیادی الفاظ کیا ہیں۔

اہم اعضائے جسم کے نام	آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں
خاص رشتے:۔	ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن
گنتی کے الفاظ:۔	ایک، دو، تین، چار، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، بیس، اکیس، وغیرہ۔
بنیادی افعال:۔	آنا، جانا، کھانا، پینا، چلنا، کرنا، مارنا،
ضمائر:۔	میں، ہم، تم، وہ

ایک ماخذ سے کچھ ہی پہلے جدا ہونے والی دو زبانوں یعنی سگی یا چچیری بہنوں میں یہ الفاظ بھی بڑی حد تک مماثل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

ہندی	مراٹھی	گجراتی	تامل	کنڑا	ملیالم
ناک	ناہ	ناہ	موکو	موگو	موک
کان	کان	کان	چیوی	کیوی	چیوی
کھا	کھا	کھا	تن	تنو	تنو
پی	پی	پی	کدی	کدی	کدی

یہ بھی باوثوق پیمانہ نہ ہوا۔ ایک خاندان کی مختلف زبانوں میں بنیادی الفاظ مشترک ہو سکتے ہیں ۔ الفاظ کی مماثلت سے زیادہ قابل وثوق اصول یہ ہے کہ قواعد کی مماثلت پر تکیہ کیا جائے ۔ تصریف و اشتقاق کے قواعد اور کلام کی نحوی ساخت زبانوں کے حصار کی حد بندی کا بہترین ذریعہ ہیں ۔ یہ ایک زبان کی مختلف بولیوں میں مماثل ہوتے ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف فعل کی گردان ، اسم وضمیر ، کی تعریف ۔ حروفِ جار کا استعمال ، زبان کی امتیازی خصوصیات ہیں ۔

ایک زبان کے بولنے والوں میں جس قدر ملنا جلنا ہوگا۔ اُسی قدر ان کی بولی یکساں ہوگی ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک بڑے علاقے میں بسنے والے لسانی گروہ میں امتداد زمانہ کے ساتھ مقامی خصوصیات پیدا ہوتی جائیں گی ۔ یہ اختلافات ایک زبان کو بولیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں ۔ ایک بولی کے بولنے والوں کی بولیوں میں کم وبیش یکسانیت ہوتی ہے ۔ کیا قواعد ، کیا روزانہ ضرورت کے ذخیرۂ الفاظ دونوں میں مکمل مطابقت ہوتی ہے چنانچہ بولی کی تعریف 1

یوں کی جاسکتی ہے ۔ ''بولی کسی زبان کی وہ ذیلی شاخ ہے جس کے بولنے والوں کو کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔''

زبان کا علاقہ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس میں بولیاں زیادہ ہوں گی ۔ یہ علاقہ اگر دشوار گزار ہوگا یعنی اگر اس کے باشندے ایک دوسرے سے کم مل جل پاتے ہوں گے تو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بولیوں کا فرق ہوتا جائے گا ۔ غیر متمدن قبائل میں چونکہ نقل مکانی کم ہوتی ہے اس لیے ان کی زبانوں میں بولیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ۔ انڈونیشیا کے جزیرہ (Cebbes) میں سینکڑوں بولیاں ہیں ۔ نیوگنی میں اس سے بھی زیادہ ہیں ۔ 1

صفحہ زمین سے محو ہونے سے قبل چھوٹے سے جزیرے تسمانیہ کے جنگلیوں کی تعداد محض پچاس رہ گئی تھی اور وہ چار بولیاں بولتے تھے جن میں آنکھ ناک سر کے لیے الگ الگ الفاظ تھے ۔ 2

1- Linguistics change sturtuant P-146, Chicago, 1961

1- Linguistics change sturtuant P-146, Chicago, 1961

زبان بولیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن جب ہم کسی کتاب میں ہندی، اردو یا انگریزی زبان کے نمونے پڑھتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ الفاظ اس زبان کی ہر بولی کا مشترک حصہ ہیں۔ بلکہ یہ کتابی زبان بھی ایک بولی کی منزہ صورت ہے جو بعض غیر لسانی وجوہ سے زیادہ موقر ہوگئی ہے۔ کسی زبان کی سب سے اہم بولی کو معیاری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ بولنے والوں کی یا مقام کی اہمیت سے کوئی بولی اہم ہو کر معیاری ہو جاتی ہے۔ معیاری زبان کے تعین میں اور دوسری بولیوں کی تقابلی اہمیت میں ذیل کے اسباب میں سے کوئی ایک یا کئی کارفرما ہوتے ہیں۔

1۔ سیاسی اقتدار والے علاقے مثلاً راجدھانی کی بولی معیاری زبان بن جاتی ہے۔ دلّی کی اردو، لندن کی انگریزی اور روم کی لاطینی بولیاں اپنی زبان کی معیاری شکل قرار پائیں۔ پونا کی مراٹھی بھی اسی وجہ سے معیاری مانی گئی۔

2۔ کسی مقام کی دینی برتری بھی وہاں کی بولی کو اہم کر دیتی ہے۔ متھرا کی برج بھاشا اور ایودھیا کی اودھی معیاری تسلیم کی جاتی تھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک زمانے میں برج اور اودھی کو زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ امرتسر کی بولی کی پنجابی معیاری زبان قرار دینے کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سکھوں کا مقدس مقام ہے۔

3۔ جس بولی میں جتنا ادب ہوگا۔ اسی مناسبت سے اس کی اہمیت ہوگی۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں ماضی میں برج اور آج کھڑی بولی سب سے اہم ہے۔ مشرقی ہندی میں اودھی بقیہ دو بولیوں یعنی باگھیلی اور چھتیس گڑھی سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور اس کی وجہ ان کے ادب کی کیفیت و کمیت ہے۔

اگر کسی وجہ سے معیاری زبان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو وہ محض بولی ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی دوسری بولی معیاری زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ شاہجہاں کے عہد تک جب آگرہ ہندوستان کا دارالخلافہ تھا۔ برج ہندی کا معیاری روپ تھا اور کھڑی بولی محض ایک بولی تھی۔ شاہ جہاں نے جب دارالسلطنت دلی کو منتقل کر دیا تو کھڑی بولی معیاری زبان ہوگئی اور برج محض ایک بولی ہو کر رہ گئی۔

معیاری زبان تعلیم وادب، نظم ونسق، تہذیب ومجلس کی زبان ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور وقعت روز افزوں ہو جاتی ہے۔ یہ مختلف بولیوں کے درمیان مشترک زبان کا کام دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان میں بات چیت کرنا تہذیب اور مرتبت کی نشانی سمجھا تا ہے۔ اور بولی کا استعمال تہذیب وتعلیم وامارات سے بے بہرہ ہونے کی علامت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان شہروں سے بولیوں کو نکال کر ان کی جگہ پر قابض ہو جاتی ہے۔ بولی میں ادب کی تخلیق رُک جاتی ہے۔ اور معیاری زبان ہی ادب کی زبان بن جاتی ہے۔

معیاری زبان اور بولی کے کئی روپ ہوتے ہیں۔

ادبی زبان سب سے زیادہ فصیح اور قواعد وضوابط میں جکڑ بند ہوتی ہے۔ اس سے نیچے دوسرے موضوعات کی تحریری زبان ہوتی ہے۔ مثلاً اخبار یا تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کی زبان معیاری زبان کی تقریری شکل اس سے زیادہ وارستہ ہوتی ہے۔ کتابوں میں زبان جس طرح لکھی جاتی ہے۔ اس طرح کوئی بولتا نہیں ورنہ گفتگو کو مصنوعی اور کتابی کہا جائے گا۔ اسی طرح تقریر کا روز مرّہ تحریر میں پیش نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ بولنے میں جلدی کی خاطر لفظوں کے تلفظ کو کچھ نہ کچھ مختصر اور مسلسل کیے بغیر چارہ نہیں۔

معیاری زبان ہی کی قدرے مختلف شکل بعض پیشوں کی طبقاتی زبان ہے۔ مثلاً انجینئر ڈاکٹر، وکیل، مذہبی قائدین، کھلاڑی، کرخندار، آڑھتی کی زبان، ہندوستانی طلبہ کی زبان میں انگریزی الفاظ، مولویوں کی زبان میں عربی، فارسی الفاظ اور پنڈتوں کی بھاشا میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔

معیاری زبان میں بولنے والوں کی تعلیمی اور معاشی حالت کے اعتبار سے کئی درجے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے یا مرفہ الحال طبقے زبان کا جتنا پاکیزہ ادب استعمال کرتے ہیں تعلیم سے محروم یا معاشی اعتبار سے فروتر افراد اس کو کسی قدر مسخ کر کے بولتے ہیں۔ ان کی زبان کو ہم پست معیاری زبان (Sub-Standard language) کہیں گے۔ اسے شہروں کے کم پڑھے لکھے لوگ، طبقۂ متوسط کی نچلی سطح کے افراد Lower middle class[1]

1- Bloomfield language 1955 p 50-1

(Lovenmiddle) کاریگر، مستری، خوانچے والے، چھوٹے دوکاندار استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ معیاری زبان کی غیر فصیح شکل ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک کی مشترک زبان کے طور پر یہی رائج ہوتی ہے۔ ہندوستان کی عوامی قومی زبان کوئی ہے تو وہ ہے بمبئی کی اُردو۔

معیاری زبان کسی زبان کی سب سے اہم بولی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ زبان میں دوسری مقامی بولیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اور لسانیات کے طالب علم کو ان میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ بڑی زبانوں کی بولیاں بھی خاصے بڑے علاقے پر پھیلی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ اور ذیلی بولیوں (Sub-dialect) میں بٹ جاتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ہر بارہ کوس کے بعد پانی اور بانی (آواز یا زبان) بدل جاتے ہیں۔ اتنا بھی نہ سہی تو تقریباً ستر، اسی میل یعنی ایک ضلع کے ساتھ ساتھ بولی بدل جاتی ہے۔ مغربی ہندی کی ایک بولی ہے کھڑی بولی۔ کھڑی بولی کی ذیلی بولیاں، سہارنپور کی بولی، رامپور کی بولی وغیرہ ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے ان کے نازک اختلافات کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ مثلاً سہارن پور کی زبان میں نون غنہ کے اعلان کا رجحان ہے۔ بجنور میں طویل مصوتے (Vowel) کے بعد آنے والے مصمتے (consonant) کو کسی قدر مشدد کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً آگّے بوتّی۔ مرادآباد میں بعض ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جن سے آس پاس کے اضلاع والے ناواقف ہیں۔ مثلاً بہاری کرنا یعنی اڑا لینا پار کر دینا، صفری بمعنی امرود۔

بولی کی سب سے زیادہ مسخ شدہ شکل کو گنوارو بولی (چیٹوا۔patois) کہتے ہیں۔ اس کا علاقہ تو مختصر ہوتا ہی ہے۔ یہ غیر مہذب اور جاہلانہ سمجھی جاتی ہے۔ جس طرح معیاری بولی کی غیر فصیح شکل کو پست معیاری بولی کہا تھا۔ اسی طرح علاقائی بولی کے پست تر روپ کو گنوارو بولی کہہ سکتے ہیں۔

ایک بحث یہ بھی ہے کہ زبان اور بولیوں کا تاریخی رشتہ کیا ہے۔ کیا امتداد زمانہ کے ساتھ ایک زبان بٹ کر بولیوں میں تقسیم ہوگئی یا مختلف بولیاں مل جل کر زبانیں بن گئیں۔ یعنی بولیاں پہلے آئیں یا زبان۔

رینان[1]

(Renan) اور میکس ملر کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا انتشار سے اتحاد کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ساتھ ان کے اختلافات کم ہوتے گئے اور وہ ایک زبان کی شکل میں گھُل گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ابتدا میں خاندان، گوتر، ذات، پات اور قبیلے تھے جو بعد میں قوم کی شکل میں منظم ہو گئے۔

امریکی ماہرین لسانیات وھٹنے[2]

اس نظریے کے خلاف ہے۔ اس کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی وہ آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہوگئی۔ کچھ اور عرصے کے بعد یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے پھر بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ زبانوں کی تاریخ اس کی سب سے بڑی شاہد ہے۔ ہند یورپی یا ہند آریائی کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھیے زبانیں کس طرح بولیوں کو جنم دیتی گئیں۔

لسانی تاریخ میں یہ واقعہ عام ہے کہ بولیاں ایک دوسرے سے جدا ہو کر مختلف زبانیں بن جاتی ہیں۔ اطالوی اور فرنچ یا جرمن اور ڈچ کسی زمانے میں ایک زبان کی دو بولیاں تھیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سو دو سو سال میں برطانیہ اور امریکہ کی انگریزی یا ہندوستان و پاکستان کی اردو دو مختلف زبانیں ہو جائیں۔ اس کے برعکس شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان زوال پذیر ہو کر محض بولی رہ جاتی ہے۔ برج اور اودھی کو عہد وسطیٰ میں زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اب وہ ہندی کی بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ میتھلی اور راجستھانی کو بھی ہندی والے بولی قرار دینا چاہتے ہیں۔ کون جانے کہ لسانی جبر کے زیر اثر کچھ زمانے کے بعد پنجابی بھی ہندی کی بولی بن کر رہ جائے۔

معیاری زبان میں پھیلنے کا رجحان ہوتا ہے۔ وہ پاس پڑوس کی بولیوں کو ختم کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ روم کی لاطینی بولی آس پاس کی کئی بولیوں کو کھا گئی۔ معیاری زبان اور بولیاں ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ انبالے کی ہندی پر ہریانی کا اثر اور

1- Language and the study of language whitney london p 179

2- Do p. 186

بنارس کی ہندی پر بھوجپوری کے اثرات ہیں۔ اُردو کی دکنی بولی پر مراٹھی کے اثرات ہیں اور جہاں تک لہجے کا تعلق ہے آندھرا کی اُردو تیلگو لہجہ میں اور میسور کی اردو، کنڑ لہجے میں بولی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی بولیاں معیاری بولی سے ذخیرۂ الفاظ اور بعض اوقات قواعدی روپ بھی لیتی جاتی ہیں۔

بولیوں میں زندگی کا حرکی خون رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ ارتقا پذیر ہوتی ہیں معیاری زبان ادب اور قواعد کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہر قدم پر سند کی تلاش کرتی ہے۔ روزمرہ سے بے گانہ ہو کر یہ روایت پسند اور ماضی پرست ہو جاتی ہے۔ بولیاں مستقبل کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آخر کار معیاری زبان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریر سے بچھڑ کر پیچھے رہ گئی ہے۔ ہار کر اور جھنجھلا کر اسے بولی کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں وہ جن لسانی تبدیلیوں پر ناک بھوں چڑھا کر انھیں تحقیر کے ساتھ ٹکسال باہر قرار دیتی ہے۔ ایک عرصے کے بعد اُسے وہی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ معیاری بولی کی زندگی کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ بولیوں کی طرف سے مغائرت نہ برتے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرتی رہے ورنہ سنسکرت کی طرح قواعد بند ہو کر ٹھٹھر جائے گی۔ معیاری زبان اس ندی کی طرح ہے جس کی سطح کے اوپر برف کی جامد تہہ جمی ہو۔ لیکن اس کے نیچے موج تہہ نشین مچل رہی ہو۔ یہ امواج تہہ نشین بولیاں ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گفتگو عموماً بولی ہی میں کی جاتی ہے۔ معیاری زبان صرف پُرتکلف موقعوں کے لیے ہوتی ہے۔ کلاس روم، عدالت، اسمبلی، لکچر ہال وغیرہ میں بھلے ہی باقاعدہ ٹکسالی معیاری زبان بولی جائے۔ گھر میں آکر ہر شخص کا رجحان بولی کی طرف ہو جاتا ہے۔

تقریری روپ سے زیادہ کنارہ کشی اور لغت و قواعد کے زیادہ احترام کے باعث بعض اوقات زبانیں مر بھی جاتی ہیں۔ یعنی اُن کا بولنے والا کوئی نہیں رہتا۔ سنسکرت اور عبرانی اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن اس کی خاکستر پر دوسری نسل پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے کئی وجوہ سے بھی زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی کبھی تو ان کے بولنے والے تنازع للبقا میں پسپا ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح تسمانیہ والے گئے گزرے ہوئے یا جنوبی ہند میں ٹوڈا تقریباً ختم ہو گئے ہیں یا ریڈ انڈین روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایک زبان کے بولنے والے سیاسی

یا تہذیبی حیثیت سے دوسری زبانوں کے زیر اقتدار آ کر آہستہ آہستہ اپنی زبان کو ہاتھ سے گنوا دیتے ہیں۔ امریکہ کے حبشیوں نے اپنی زبانیں چھوڑ کر انگریزی اختیار کر لی ہے۔ آئرلینڈ میں جہاں کی زبان انگریزی سے مختلف خاندان کی تھی، اب عام طور سے انگریزی بولی جاتی ہے۔ ماضی کے طویل دھند لکے میں متعدد چھوٹی زبانیں اس طرح کالعدم ہو گئی ہیں کہ ان کا نام لیوا بھی صفحۂ ارض پر موجود نہیں۔ چنانچہ یہ یقینی ہے کہ گرد تاریخ میں دفن ہو جانے والی زبانوں کی تعداد زندہ زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض اوقات احیائیت یا علاقائیت کا جذبہ بولی کو ایک وقعت عطا کر دیتا ہے۔ میتھلی اور راجستھانی کو زبان کا مرتبہ دلانے کی ایک نحیف سی تحریک ہے جس کے زیر اثر ان بولیوں میں ادب کی کچھ نہ کچھ تخلیق کی جا رہی ہے۔ بھوجپوری میں فلمیں بن رہی ہیں۔ پرشوتم داس ٹنڈن اودھی میں بات چیت کرنے پر زیادہ آسودگی محسوس کرتے تھے۔ بلوم فیلڈ کے مطابق جرمنوں میں پچھلی ایک صدی میں بولیوں کے لیے ایک رومانی لگاؤ کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ طبقۂ بالا کے بعض جرمن گھر میں بولی ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ سوئزرلینڈ کے جرمن اپنے گھر والوں اور پڑوسیوں سے مقامی بولی میں بات چیت کرنا پسند کرتے ہیں۔

بولی انسان کی بنیادی ضرورتوں، ہوا، پانی، سادہ خوراک کی طرح ہے۔ معیاری زبان ہماری ان ضروریات کی طرح ہے جو تہذیب نے پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً ریل، بجلی، ابتدا میں یہ آسائش رہی ہوگی۔ لیکن اب ان کے بغیر زندگی مشکل ہے۔ ادبی زبان ان آسائشوں کی طرح ہے جو خواص کے لیے ہوتی ہیں۔ مثلاً موٹر، ٹیلیفون، قصر و ایوان، تہذیب کے فروغ کے لیے ان سبھی کی ضرورت ہے۔

تیسرا باب: لفظ و معنیٰ

ابتدائیہ

لسانی اصطلاح میں فونیم بے معنی صوتی اکائی ہے۔ لفظیہ (Morpheme) فونیم کے برعکس کم سے کم بامعنی اکائی Meaningful unit ہے۔ اول الذکر لسانی اصطلاح کی طرح جو صوتیات سے تعلق رکھتی ہے لفظیہ کا تعلق صرف سے ہے۔ لفظوں کی تشکیل اور بناوٹ میں لفظیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سابقے، لاحقے اور تصریف کے مختلف اعمال کا دارومدار لفظیوں کی کمی بیشی پر ہوتا ہے۔ ایسے لسانی پیکر (Linguistic foms) جو جزوا صوتی و معنوی اعتبار سے دوسرے لسانی پیکروں سے الگ ہوتے ہیں۔ سادہ پیکر (Simple forms) یا لفظیے ہیں۔ فونیم صوتی اعتبار سے کسی دوسرے فونیم سے شکل وصورت میں (صوتی اعتبار سے) قریب ہو سکتا ہے۔ لیکن لفظیہ (morpheme) کم سے کم بامعنی اکائی ہے۔ دو لفظیوں میں معنوی اعتبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، گو صوتی یکسانیت کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔

لفظیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1- Free form، 2- bound form 3- complex form' bound form وہ کم سے کم بامعنی اکائیاں ہیں جو کسی زبان میں آزادانہ طور سے استعمال نہیں ہوتے complex form بھی دراصل bound form ہی ہیں۔ لیکن اس صورت میں لفظ متعدد بامعنی اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لیے سہولت کے اعتبار سے

زبان کے طالب علم free form اور bound form انھیں دو پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ کلام جو دو یا دو سے زائد آزادانہ مستعمل ہونے والی بامعنی اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اسے phrase یا فقرہ کہتے ہیں۔ کلام کی آزادانہ مستعمل شدہ شکل یا فقرہ (phrase) نہ ہو تو وہ لفظ کہلاتی ہے (A free form which is not a phrase in word) اسے مشہور امریکی ماہر زبان بلوم فیلڈ نے کم سے آزاد پیکر (minimum free form) سے تعبیر کیا ہے۔ لفظ زبان میں کم سے کم آزادانہ مستعمل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لغت نویس لغت کی ترتیب میں بجائے لفظوں کے الفاظ کی بنیاد پر لغت مرتب کرتے ہیں۔

اس حصہ میں پنڈت کیفی کا مقالہ ''لفظ و معنی'' جو کیفیہ سے ماخوذ ہے لفظ و معنی کے روپ اور ان کے معنی سے بحث کرتا ہے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا ''اردو صرف ونحو کا خاکہ'' اردو قواعد کو اختصار سے پیش کرنے کی سب سے کامیاب کوشش ہے اگرچہ مقالہ روایتی قواعد سے تعلق رکھتا ہے اور جدید لسانی اصولوں سے مختلف ہے تاہم موضوع اور اس کی افادیت کے پیش نظر، سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا مقالہ اردو لفظوں کی تشکیل اور تاریخ Etymology پر گراں قدر اضافہ ہے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضامین ''اردو کے مرکب افعال'' اور ''نے'' کی سرگزشت بالترتیب جدید توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات پر غور و فکر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اردو صرف ونحو کا خاکہ

صرف کے جاننے سے لفظ کی صورت بدل کر کے طرح طرح کے معنی حاصل کرنے کا قاعدہ معلوم ہوتا ہے۔اس سے غرض یہ ہے کہ آدمی کو بات کرنا آجائے۔

جو لفظ ہمارے منہ سے نکلتا ہے۔معنی دار ہوتا ہے تو اسے موضوع کہتے ہیں۔ موضوع لفظ اکیلا ہو جیسے کریم تو اس کو لفظ اور کلمہ کہتے ہیں۔اور اگر دو لفظ ایک معنی رکھتے ہوں جیسے کریم بخش جو ایک آدمی کا نام ہے تو وہ بھی ایک کلمہ کہا جائے گا۔

کلمے کی تین قسمیں ہیں۔ایک اسم۔اسم وہ کلمہ ہے۔جو تنہا اپنے معنی بتائے۔نہ کسی اور لفظ کے ملانے کی ضرورت ہو نہ کوئی زمانہ اس میں پایا جائے۔جیسے تسبیح، کنٹھا مالا، آدمی، جانور، پوتھی، زمین، آسمان، اُٹھنا، بیٹھنا۔

دوسرا فعل ہے جو اپنے معنی اکیلا بتائے اور اس میں گزشتہ یا موجودہ یا آنے والا زمانہ پایا جائے۔جیسے آیا تھا۔آتے ہیں۔آئیں گے۔

تیسرا کلمہ صرف ہے جو اپنے معنی اکیلا نہیں بتا سکتا۔اس کو حرف جار بھی کہتے ہیں جیسے کا۔کی، تک۔پر، کو، میں

تقسیم صرفی کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔

اسم جامد، جن سے کوئی دوسرا لفظ نہ بن سکے۔ نہ کسی لفظ سے نکالا گیا ہو۔ جیسے۔ شیر، چیتا، اولتی، نوٹ، گنّی۔

اسم مشتق وہ ہے جو کسی دوسرے کلمے سے بنایا گیا ہو۔ جیسے کہنے والا، سننے والا، کہ دونوں فاعل ہیں اور کہنا، سننا مصدر سے بنائے گئے ہیں۔ لیکن تمام مشتقات کو اسم کہتے ہیں۔ اسم مشتق کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ فعل ہیں، کچھ اسم ہیں۔

اسم مصدر وہ اسم ہے جو آپ کسی سے نہ بنا ہو، لیکن اور صیغے اس سے بنائے جائیں۔ صیغوں میں کوئی نہ کوئی زمانہ پایا جاتا ہے۔ لیکن مصدر میں کوئی زمانہ نہیں پایا جاتا جیسے کھانا، اُٹھنا، بیٹھنا، اس کی علامت حرف نا ہے۔ دوسری علامت مصدر کی یہ ہے کہ جب اس کی علامت حذف کردی جائے تو امر کا صیغہ باقی رہے جیسے جانا سے جا، کرنا سے کر، یہی امر مصدر میں افعال کی جڑ ہے جو کسی صیغے میں نہیں بدلتی، مگر جانا اور کرنا اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مصدر بدل جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور مصادر کسی حال میں نہیں بدلتے۔

قاعدہ:۔ صرف کے لحاظ سے مصادر چار قسم کے ہوتے ہیں۔

اصلی، جعلی، فرعی، ترکیبی۔

اصلی مصدر کو وضعی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ سب ہندی مصادر سے لیے گئے ہیں۔ جیسے آنا، جانا، اُٹھنا، بیٹھنا۔

جعلی وہ ہیں جن کو اردو کے اہل زبان نے کسی دوسرے ہندی اسم میں علامت مصدر لگا کر بنالیا ہے۔ جیسے برمانا، چمکانا، کھنکھنانا، ان کو غیر وضعی بھی کہتے ہیں۔

فرعی مصدر وہ ہیں جو غیر زبان کے فعل و اسم پر علامت مصدر زیادہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ جیسے شرمانا، فرمانا، خریدنا، قبولنا۔

ترکیبی مصدر وہ ہیں جو دو مصدروں کو ملا کر ایک مصدر اس طرح بنا لیتے ہیں کہ ایک مصدر کی ماضی یا امر یا حاصل مصدر پر ایک دوسرا مصدر لگا کر بنا لیتے ہیں جیسے کھالینا، رکھ دینا، اُٹھ سکنا، مصدر کی یہ قسمیں اسم کے لحاظ سے ہیں۔ فعل کے لحاظ سے مصدر کی تین قسمیں ہیں۔ لازم،

متعدی، مشترک، لازم وہ ہے جس میں فاعل ہو مفعول نہ ہو۔ جیسے آنا، جانا، اُٹھنا، بیٹھنا، متعدی وہ ہیں جو فاعل سے تجاوز کر کے معنوں پر ختم ہو جیسے مارنا، پیٹنا، دھکانا، دبانا۔ مشترک وہ ہے جو لازم، متعدی دونوں پر بولا جائے جیسے شرمانا، للچانا۔

تمام فعل مصدر سے نکلتے ہیں۔ فعل وہ ہے جس میں زمانے کی قید کے ساتھ کسی کام کا ہونا یا کرنا پایا جائے۔ اس کی چھ قسمیں ہیں۔ ماضی، مضارع، حال، مستقبل، امر، نہی۔

فعل کی اپنے فاعل کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں۔ معروف اور مجہول۔ معروف وہ ہے جس کا فاعل معلوم ہو۔ مجہول وہ ہے جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ جیسے میں لایا۔ اس کا فاعل معلوم ہے۔ اس لیے معروف ہے۔ وہ لایا گیا۔ وہ مارا گیا۔ اس کا فاعل نہیں معلوم ہوا۔ اس لیے مجہول ہے۔

فعل مجہول ہمیشہ متعدی ہوتا ہے اور فعل معروف لازم اور متعدی دونوں بن سکتا ہے۔ فعل مجہول میں مفعول بجائے فاعل ہوتا ہے۔

اثبات و نفی فعل کے دو جز ہیں جس میں کسی کام کا ہونا پایا جائے۔ اس کو فعل ثابت کہتے ہیں۔ جیسے میں نے دیکھا۔ جس میں کسی کام کے نہ کرنے یا نہ ہونے کی خبر ہو اسے نفی کہتے ہیں۔ جیسے موہن نہیں آیا۔ تم نے نہیں کھایا۔

ہر فعل کے گیارہ صیغے ہوتے ہیں۔ واحد غائب مذکر اور مونث کے لیے دو صیغے، جمع غائب مذکر اور مونث کے لیے دو صیغے۔ واحد حاضر مذکر اور مونث کے لیے دو صیغے جمع حاضر مذکر اور مونث کے لیے دو صیغے۔ واحد متکلم مذکر اور مونث کے لیے دو صیغے۔ جمع متکلم مذکر اور مونث کے لیے ایک صیغہ۔ اس لیے کہ جمع متکلم میں مذکر اور مونث کے لیے دونوں صیغے ایک ہی طرح بولے جاتے ہیں۔ جیسے عورتیں کہتی ہیں۔ ہم آئے اور مرد کہتے ہیں ہم آئے۔ عورتیں کہتی ہیں، ہم آتے ہیں اور مرد کہتے ہیں۔ ہم آتے ہیں۔ عورتیں کہتی ہیں ہم آئیں گے۔ اور مرد کہتے ہیں ہم آئیں گے۔

ماضی مطلق وہ ہے جس میں زمانہ گزشتہ بغیر شرط قریب و بعید کے پایا جائے۔ بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ علامت مصدر گرا کر اصلی حرفوں پر (یا) زیادہ کیا جائے۔ جیسے سونا سے سویا۔ بونا سے بویا۔ کھونا سے کھویا۔ لانا سے لایا۔ بنانا سے بنایا۔

اور بعض میں حرف ا لگا دیتے ہیں۔ جیسے چلنا سے چلا۔ اٹھنا سے اٹھا۔ متعدی اور لازم کے مصدر اسی قاعدے سے بنتے ہیں۔ جانا اور کرنا مستثنیٰ ہیں۔ کہ ان کی ماضی گیا اور کیا آتی ہے۔

قاعدہ:۔ اردو میں تمام افعال لازم اور متعدی فاعل ذی روح اور غیر ذی روح دونوں کے لیے آتے ہیں۔ جیسے بخار آیا۔ آدمی آیا۔ غم نے پکڑ لیا۔ فکر نے کھالیا۔ بکری آئی۔ انڈے آئے۔

ماضی مطلق واحد غائب مذکر کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ جیسے وہ آیا۔ جمع غائب کے آخر میں یائے مجہول ہوتی ہے۔ جیسے وہ آئے۔ واحد حاضر کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ تو آیا۔ جمع کے آخر میں یائے مجہول ہوتی ہے۔ جیسے وہ آئے۔ واحد حاضر کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ تو آیا۔ جمع متکلم کے آخر میں یائے مجہول ہوتی ہے۔ ہم آئے۔ مونث میں واحد غائب کے آخر میں معروف آتی ہے جیسے وہ آئی۔ جمع غائب میں ین معروف آتی ہے جیسے وہ آئیں۔ واحد حاضر مونث میں یائے معروف آتی ہے۔ میں آئی۔ جمع حاضر میں ین معروف آتی ہے جیسے تم آئیں۔ واحد متکلم میں یائے معروف آتی ہے۔ میں آئی۔ جمع متکلم بطریق مذکور بولتے ہیں۔ ہم آئے۔ ماضی قریب وہ ہے جسے گزرے ہوئے تھوڑا زمانہ گزرا ہو۔ میں آیا ہوں۔ ماضی بعید وہ ہے جسے گزرے ہوئے بہت زمانہ ہوا ہو۔ اسے بھی ماضی بعید سے بناتے ہیں۔ اس کی علامتیں یہ ہیں۔ تھا، تھے، تھی، تھیں۔ جیسے میں آیا تھا۔ وہ آئی تھی۔ تم آئے تھے۔ وہ آئی تھیں۔

ماضی تمنائی یا ماضی شرطی وہ ہے جس میں کوئی شرط یا آرزو پائی جائے۔ امر پر تا زیادہ کر کے بناتے ہیں۔ جیسے میں آتا، میں جاتا۔ اس کی علامتیں یہ ہیں (تا۔ تی۔ تے) جیسے میں آتا، تو آتی، تم آتے۔ ماضی استمراری یا ماضی ناتمام وہ ہے جس سے گزشتہ کام کا نامکمل رہنا پایا جائے یا کسی کام کا لگاتار ہونا ثابت ہو۔ ماضی تمنائی پر تھا بڑھانے سے ماضی استمراری بنتی ہے جیسے آتا تھا۔ اس کی علامتیں یہ ہیں۔ تھا، تھے، تھی، تھیں۔

قاعدہ:۔ تھا کو جو لوگ فعل ناقص کہتے ہیں۔ غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ علامت فعل ہے۔ اس کو حرف کہہ سکتے ہیں۔

مضارع وہ ہے جس میں حال و استقبال دونوں زمانے پائے جائیں۔ بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ علامت مصدر گرانے کے بعد مگر حرف آخر واؤ یا الف ہو تو (یے) اور کوئی دوسرا حرف ہو تو صرف ے بڑھا دو۔ جیسے سونا سے سوئے۔ بونا سے بوئے۔ کہنا سے کہے۔ پانا سے پائے۔ دیکھنا سے دیکھے۔ اس کی علامتیں ے، یئے، ئیں، وں، وجیسے وہ چلے۔ وہ آئے۔ وہ آئیں۔ میں آؤں، تم آؤ۔

حال وہ ہے جس میں زمانہ موجود پایا جائے۔ مصدر کی علامتیں گرانے کے بعد 'تا ہے' بڑھانے سے بنتا ہے۔ جیسے آتا ہے۔ کہتا ہے۔ اس کی علامتیں یہ ہیں۔ ہے، ہیں، ہوں۔

مستقبل وہ ہے جس میں زمانہ آئندہ پایا جائے۔ مضارع پر (گا) بڑھانے سے بنتا ہے۔ جیسے آئے گا۔ اس کی علامتیں یہ ہیں۔ گا۔ گی۔ گے۔

قاعدہ:۔ مستقبل میں حرف جمع فعل پر آتے ہیں۔ علامت پر نہیں آتے۔ جیسے۔ آئیں گے۔ آؤں گی۔

امر وہ ہے جس میں کسی کام کا حکم ہو۔ مصدر کی علامت گرانے سے امر حاضر بن جاتا ہے۔ جیسے دیکھنا سے دیکھ۔ چلنا سے چل۔ اس کی علامتیں یہ ہیں۔ وہ ئے، ئیں، وں جیسے وہ آئے۔ وہ آئیں۔ میں آؤں۔ ہم آئیں۔ تم آؤ۔ نہی اس کو کہتے ہیں جس میں کسی کام کی ممانعت پائی جائے۔ امر پر نہ لگانے سے بنتی ہے۔ جیسے نہ آئے۔ نہ آئیں۔ نہ آ۔ نہ آؤ۔ نہ آؤں۔ نہ آئیں۔

قدما امر پر مت لگاتے تھے۔ حال کے فصحا نے اس کو ترک کر دیا ہے۔ بعض موقع پر (نہیں) جو حرف نفی ہے۔ فعل امر کے آخر میں آ کر نہی کے معنی دیتا ہے۔ جیسے ہم سے لڑو نہیں۔ ہم سے پوچھو نہیں۔ کچھ کہو نہیں۔ لیکن یہ سب صورتیں فصیح نہیں ہیں ایک قسم کی تعقید ہے۔ اصل میں نہ پوچھو۔ نہ کہو، نہ سنو، نہ بولو کہنا چاہیے۔ قدما نہ آئیو۔ نہ جائیو بھی بولتے تھے۔ یہ صورت بھی متروک ہے۔ اب نہ آنا، نہ جانا بولتے ہیں۔

نفی وہ فعل ہے جس سے کسی کام کے نہ ہونے اور نہ کرنے کی خبر پائی جائے۔ وہ سوا امر کے باقی تمام افعال پر (نہیں) لگانے سے بنتی ہے۔ اور کبھی نہ لگاتے ہیں۔ جیسے نمرود کا ایک پشے سے بھی بس نہ چلا۔ حال کے صیغے پر جب نفی کے حرف آتے ہیں تو اس کی علامت گر جاتی

ہے۔ جیسے ہم نہیں آتے۔ یعنی ہم نہیں آتے ہیں۔ ماضی پر نفی ہے تو نہ اور نہیں دونوں بولتے ہیں جیسے نہ آیا اور نہیں آیا۔ مستقبل پر نفی آتی ہے تو نہیں لگاتے ہیں۔ جیسے نہیں آئے گا۔ بعض نفی بولتے ہیں اور اثبات کے معنی لیتے ہیں جیسے آؤ نہ، کھاؤ نہ، جاؤ نہ، بیٹھو نہ، یہ غیر فصیح اور خلاف فصحا ہے۔ یوں کہنا چاہیے۔ آؤ، بیٹھو، جاؤ، کھاؤ۔

اسمائے مشتقات وہ ہیں جو کسی کلمے سے بنائے گئے ہوں۔ ان کی بہت قسمیں ہیں۔ اسم فاعل، کام کرنے والے کا نام۔ اردو میں اس کے بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ مصدر کے حرف آخر کو یائے مجہول سے بدل کر والا بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے پکانے والا۔ اور مونث میں پکانے والی۔ جمع مذکر و مونث میں پکانے والے، پکانے والیاں۔

حاصل مصدر پر لو بڑھانے سے جیسے جھگڑا سے جھگڑالو۔

امر پر واؤ زیادہ کرنے سے جیسے کماؤ، خرچو، بہاؤ، لٹاؤ۔

امر پر (یت) لگانے سے پھکیت۔

اسم فاعل ترکیبی۔ کسی فعل یا مصدر سے مشتق نہیں ہیں۔ اسمائے نکرہ سے بنائے جاتے ہیں۔

اسم پر (ی) بڑھانے سے جیسے فسادی، ضمانتی، تکراری، حجتی، نوعتی، بدعتی۔

اسم پر (یا) زیادہ کرنے سے جیسے جالیا، ٹھگیا، جعلیا، فیلیا، سنگتیا۔

اس کے علاوہ اور اسما ہیں جو اسم فاعل کے معنی دیتے ہیں۔ جیسے لٹیرا، چرواہا۔ اس کو اسم فاعل سماعی کہتے ہیں۔

اسم مفعول: ماضی مطلق پر ہوا بڑھانے سے بنتا ہے۔ جیسے پٹا ہوا۔ گھٹا ہوا۔ سنا ہوا۔ دیکھا ہوا۔

اسم مفعول سماعی و ترکیبی، اسم پر (ی) بڑھانے سے بنتا ہے۔ جیسے بیاہی۔ نکاحی یعنی بیاہ کی ہوئی۔ نکاح کی ہوئی۔

عربی کے اسم مفعول اردو میں مستعمل ہیں۔ جیسے مظلوم، مرحوم، مغفور، مخمور، مذکور، فارسی اسم مفعول بھی بولے جاتے ہیں۔ آشفتہ، آزردہ۔

اسم مفعول ترکیبی اور سماعی فارسی کے اردو میں بہت مروج ہیں۔ جیسے خدا ساز، پروردہ، گرفتار شدہ۔

اسم معاوضہ مصدر متعدی سے علامت مصدر گرا کر (ئی) زیادہ کر کے اسم معاوضہ بن جاتا ہے۔ رنگائی، دھلائی، سلائی، پکوائی، چھپوائی۔

اسم حاصل مصدر وہ اسم ہے جس سے کیفیت مصدر کی معلوم ہو۔ اس کے بنانے کے کئی قاعدے ہیں۔

کبھی علامت مصدر گرانے کے بعد امر باقی رہتا ہے وہی حاصل مصدر بن جاتا ہے جیسے جانچنا سے جانچ' مارنا سے مار، آنکنا سے آنک، پرکھنا سے پرکھ۔

امر پر (آئی) بڑھانے سے چنائی، دکھائی۔

امر پر (ن) لگانے سے جیسے جلنا سے جلن۔ چلنا سے چلن

امر پر واؤ مجہول بڑھانے سے جیسے بہاؤ، دکھاؤ، بناؤ۔

امر پر الف زیادہ کرنے سے جیسے جھگڑنا سے جھگڑا۔

امر پر (وٹ) زیادہ کرنے سے جیسے بناوٹ، سجاوٹ۔

امر پر (تی) زیادہ کرنے سے جیسے گننا سے گنتی۔

امر پر (ان) زیادہ کرنے سے جیسے اٹھان، نہان۔

فارسی کے حاصل مصدر گزارش، دانش، رسائی، گفتگو اردو میں مروج ہیں۔ اسم حالیہ وہ ہے جو اسم فاعل یا اسم مفعول کی حالت کو بیان کرے۔ مصدر کی علامت گرا کر فعل مذکر ہو تو (تا ہوا) مونث ہو تو (تی ہوئی) لگانے سے اسم حالیہ بن جاتا ہے۔ جیسے لڑکا روتا ہوا چلا جاتا ہے۔ فوج بھاگتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہنستا ہوا جانے والا آدمی۔ ہنستا چہرہ۔ روتی صورت۔

اسم مصدر اور اسم مشتق کے بعد اسم جامد کا بیان ضروری ہے۔

اسم جامد کی دو قسمیں ہیں۔ اسم نکرہ اور معرفہ۔ اسم نکرہ کو اسم عام اور اسم کلی بھی کہتے ہیں۔ اسم نکرہ وہ ہے جو دلالت کرے اسم غیر معین پر۔ جیسے اونٹ، چنا، پانی، لوٹا، کٹورا، آدمی، حیوان، میز، کرسی، قلم دوات، کاغذ، کتاب، اس کی کئی قسمیں ہیں۔

اسم جنس وہ ہے جو ایک نام کل اور خبر پر بولا جائے۔ جیسے غلہ، اناج، چاول، چنا۔
اسم ذات وہ اسم ہے جو محض جوہر ذات کے لیے ہو۔ جیسے درخت، پتھر، نیکی، بدی، دریا۔
اسم آلہ۔ اوزاروں کے نام۔ اردو میں اسم آلہ بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ مصدر کا الف گرا کر (ی) لگا دیتے ہیں۔ جیسے بیلنا سے بیلنی، دھونکنا سے دھونکنی، کترنا سے کترنی۔

کبھی امر پر واؤ زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے جھاڑنا سے جھاڑو

عربی اسم آلہ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ جیسے مقراض، میزان، مسواک، عربی اسم آلہ میں حرف اوّل کو ہمیشہ زیر ہوتی ہے۔

اسم ظرف کی دو قسمیں ہیں۔ جو اسم زمانے پر دلالت کرے اسم زماں ہے اور جو مکان پر دلالت کرے اسم مکاں ہے۔ گھر، گلی، ٹکسال، پھلواری، عطروان، پاندان، اسم ظرف مکان ہیں۔

دن رات، صبح شام دوپہر، سہ پہر، پچھلی رات، دن چڑھے، رات رہے۔ سویرے دیر، ابھی ابھی، اب کل، آج، گھڑی بھر، دو چار منٹ اسم زیادہ ہیں۔

اسم مصغر، اسم کو چھوٹا کرنا، اردو میں اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اسم کے آخر میں الف ہو تو (ی) سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے کھٹولا سے کھٹولی۔ کنڈا سے کنڈی۔ پہاڑ سے پہاڑی، مٹکا سے مٹکی۔

اگر آخر میں (ی) ہو تو الف زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے بیٹی سے بیٹا، گھوڑی سے گھوڑا۔

کسی اسم کے آخر میں الف ہوتا ہے تو وہ ماقبل الف ایک (ی) زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے گڑھا سے گڑھیا، کنکوا سے کنکیا۔ ڈبا سے ڈبیا۔

کبھی ڑا اسم کے آخر میں لگا دیتے ہیں۔ جیسے مکھ سے مکھڑا۔

کبھی امر کے آخر میں کاف لگا دیتے ہیں جیسے لے پالنا سے لے پالک۔ کبھی اسم کے آخر میں کاف لگا دیتے ہیں۔ ڈھول سے ڈھولک۔

اسم مکبر۔ جس کے معنوں میں اصل لفظ سے بڑائی پائی جائے۔ اردو میں اس کو بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اسم کے آخر میں الف زیادہ کر دیتے ہیں۔ جیسے کیل سے کیلا۔ قندیل سے قندیلا۔

اسم صوت ۔ ذی روح اور غیر ذی روح کی آواز کا نام ہے۔ جیسے جھما جھم، چھم چھم گھٹا گھٹ، سراسر، سن سن ۔ فن فن، دھر دھر، زن زن، پانی جھما جھم برستا ہے۔ گھنگھرو چھم چھم بولتے ہیں ۔ اولے دھڑا دھڑ گرتے ہیں۔ کوڑے سڑا سڑ مارے جاتے ہیں۔ ہوا سن سن چلتی ہے۔ جھنجھنا جھن جھن بولتا ہے۔ دریا سائیں سائیں کر رہا ہے۔ ریل زن زن جارہی ہے۔

ذی روح کی آواز ۔ چڑیاں چوں چوں بولتی ہیں ۔ کوا کائیں کائیں کرتا ہے۔

اسم تفصیل جو اسم بمقابلہ دوسری کے اپنی صفت ظاہر کرے۔ اس کو اسم تفصیل کہتے ہیں ۔ عربی میں افضل، اشرف، اعظم، اسم تفصیل ہیں ۔ فاری میں برتر، بہتر، خوشتر اردو میں اچھے سے اچھا، عمدہ سے عمدہ، اس سے کہیں اچھا، اس سے کہیں عمدہ اسم تفصیل ہیں ۔ مگر اردو میں اسم تفصیل بنانے کا کوئی معین قاعدہ نہیں ہے۔ اس لیے اس کو بھی اسم صفت سمجھنا چاہیے۔

اسم مبالغہ وہ اسم ہے مع صفت جو اپنے موصوف کے اوصاف کی زیادتی ظاہر کرے عربی میں جبّار، قہّار، اسم مبالغہ ہیں ۔ فارسی میں بے شمار،، بے انتہا اسم مبالغہ ہیں ۔ اردو میں بڑا، سوا، بہت ۔ اسم مبالغہ ہیں ۔ جیسے بڑا گنی ہے۔ مہابلی یعنی بہادر، مہانفیس یعنی بہت عمدہ، اڑیل مہاجن ۔ یہ بھی اسم صفت میں داخل ہے۔ لہٰذا اردو میں اسم مبالغہ اسم تفضیل نہیں ہیں ۔ یہ سب اسم صفت ہیں ۔ بعض مصنفوں نے صرف ونحو میں ان کا بیان کیا تھا۔ اس لیے تفصیل بیان کر دی گئی۔

اسم صفت وہ ہے جو اپنے موسوم کی اچھائی یا بُرائی ظاہر کرے۔ جیسے کالا گورا، جھوٹا سچا، اچھا بُرا اور یہ تذکیر و تانیث میں اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے۔ جیسے لال دیو آیا۔ لال پری آئی ۔ حاصل صفت وہ ہے جو کسی کے اثر یا کیفیت کو بتائے ۔ حاصل صفت بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ صفت کے آخر میں (ی) بڑھا دیں ۔ جیسے کنجوسی، سستی، صفت کے آخر میں (پن) لگانے سے بھولا پن، کڑوا پن، صفت کے آخر میں (س) بڑھانے سے جیسے پھیکا سے پھیکاس، میٹھا سے مٹھاس، حاصل مصدر اور حاصل صفت میں یہ فرق ہے کہ حاصل مصدر فعل سے بنتا ہے۔ جیسے چلنا سے چلن حاصل مصدر ہے ۔ حاصل صفت اسم سے بنتا ہے جیسے کھٹائی سے کھٹاس۔

معرفہ کو اسم خاص بھی کہتے ہیں ۔ یہ ایک ایسا اسم ہے جس سے ایک معین شے یا خاص شخص مراد ہے۔ جیسے لکھنؤ، دہلی، غلام محمد، شمس الدین، محمد ایوب، اس کی سات قسمیں ہیں۔

علم، ضمیر، اشارہ، موصول، معہود، مضاف، منادیٰ۔

علم وہ ہے۔ جو کسی خاص آدمی یا چیز کا نام ہو۔ اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

خطاب، کنیت، عرف، تخلص، لقب۔

خطاب اس اعزازی صفت کو کہتے ہیں۔ جو کسی اعلیٰ سے ملی ہو۔ جیسے شمس العلماء حاذق الملک، شفاالدّولہ، ستارہ ہند، خان بہادر، رائے بہادر، راجہ اقبال، دولھا۔

کنیت وہ ہے جو محض فیض حاصل کرنے کی غرض سے کسی خوش نصیب یا نیک افعال شخص یا ماں باپ بھائی بہن کے نام سے یا کسی مبارک لفظ سے ملا کر ایک نیا نام مقرر کیا جائے۔ جیسے ابو یوسف، ام سلمہ، ذوالنورین، ابوالحسنات، ابوالبرکات، ابوالحیا، ابوالطاہر۔

لقب وہ ہے جو کسی صفت کے لحاظ سے مقرر کیا جائے۔ جیسے آصف الدّ ولہ، سلیمان جاہ، شاہ زمن۔

عرف وہ ہے جو اصلی نام کے بدلے مشہور ہو جائے۔ جیسے احسن علی عرف اچھو، انوار حسین عرف مجھو، احمد علی عرف لڈن۔

تخلص جو شاعر اپنا ایک مختصر نام نظم کے لیے رکھ لے۔ جیسے ریاض احمد ریاضؔ۔ خواجہ عزیزالدین عزیزؔ، سید افضل علی خاں، افضلؔ، مولوی عبدالحلیم شررؔ۔

اسم ضمیر وہ ہے جو اعلام یعنی اسم خاص کی جگہ مستعمل ہو۔ عبارت میں بار بار نام لینے کی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے چند مختصر کلمے بنائے گئے ہیں۔ جو بجائے نام آتے ہیں۔ جیسے یہ وہ ،ہم، تم، اس، ان، تجھ، تو، انھیں، تمھیں، تیرے، میرے، آپ، خود، اپنا۔

ان میں بعض وہ ہیں جو فاعل لازم کے لیے آتی ہیں یا ان فاعل متعدی کے لیے جن میں علامت تعدیہ یعنی نے نہیں ہوتی اور بعض وہ ہیں جو فاعل متعدی کے لیے آتی ہیں۔ جن میں علامت تعدیہ ہوتی ہے۔ ان دونوں قسموں کو ضمیر فاعلی کہتے ہیں۔

فاعل لازم واحد غائب، جمع غائب کے لیے، ضمیر وہ آتی ہے۔ جیسے وہ آئے۔

واحد حاضر میں تو جیسے تو آیا۔ جمع حاضر کے لیے تم آپ۔ جیسے تم آئے۔ آپ آئے۔

واحد متکلم کے لیے میں آتی ہے۔ جیسے میں آیا۔ جمع متکلم کے لیے ہم جیسے ہم آئے۔

اگر فعل متعدی ہے تو واحد غائب کے لیے اس آئے گی۔ جیسے اس نے کہا۔ جمع غائب کے لیے انھوں نے آئے گی۔ جیسے انھوں نے کہا۔

قاعدہ:۔ ضمیر ہمیشہ فاعل یا مفعول یا مضاف الیہ ہوتی ہے۔ جیسے میں آیا۔ میں ضمیر فاعل لازم ہے۔ میں لایا۔ میں فاعل متعدی ہے۔ بے علامت ہے۔ میں نے کہا۔ میں فاعل متعدی مع علامت ہے۔ اسے دیا یا اس کو دیا ضمیر مفعول ہے۔ میرا بھائی میں ضمیر مضاف الیہ ہے۔ اپنا بھی ضمیر مضاف الیہ ہے۔ جیسے اپنا بیٹا بُرا ہے۔ ضمیر مفعول وہ ہے جو فعل کا مفعول ہو جیسے اس کو مارا، ان کو دیکھا۔ تجھ کو دیا۔ تجھے دیکھا، مجھ کو دکھایا۔ مجھے سنایا۔ ہم کو بھیجا۔ ہمیں دیا۔

ضمیر اضافی وہ ہے جو بجائے مضاف الیہ آئی ہو۔ جیسے میرا بھائی۔ اس کا لڑکا۔ میری لونڈی تیرا گھوڑا، ہمارا نوکر، میرا دوست، اپنا غلام۔

ضمیر تشبیہہ وہ ہے جس میں ضمیر مشبہ بہ ہو۔ جیسے ایسی لالٹین، ویسی ٹوپی۔ اس طرح کی بیل۔

اضمار قبل الذکر اس کو کہتے ہیں۔ جس میں ضمیر نام سے پہلے آجائے۔ جیسے وہی تمھارا دوست آتش لکھنوی، اس میں وہی ضمیر ہے آتش کی جو نام سے پہلے آئی ہے۔

قاعدہ:۔ اردو میں اکثر ضمیر پہلے آتی ہیں۔ اس لیے ایسی ضمیریں اضمار قبل الذکر ہیں۔

اسم اشارہ وہ ہے جس سے کسی مخصوص چیز یا شخص کی طرف اشارہ کیا جائے۔ جس کی طرف اشارہ کریں وہ مشارٌ الیہ ہے۔ اردو میں یہ اشارہ قریب کے لیے ہے۔ اور وہ اشارہ بعید کے لیے۔ جیسے یہ رکھا ہے۔ یہ دیکھو۔ وہ جاتا ہے۔ اور ان اشارہ جمع قریب کے لیے جیسے ان آموں کو رکھ دو۔ اُن شارہ جمع بعید کے لیے جیسے اُن بکریوں کو باندھ دو۔ اِس اور اُس بھی اشارہ قریب اور بعید کے لیے آتا ہے اور کبھی تخصیص کے مقام پر وہی بھی کہتے ہیں۔ جیسے وہی بات تم نے پھر کی جس پر کل جھگڑا ہوا تھا۔ یہی باتیں تو تمھاری اچھی نہیں ہیں۔

اضافت کی حالت میں اسم اشارہ اِس اور اُس ہے۔ جیسے اِس آدمی کی آواز اچھی ہے۔ اُس آدمی کی آواز خراب ہے۔

جمع کی حالت میں اشارہ اِن اور اُن ہے۔ جیسے اِن کو کہہ دو چلے جائیں۔ اُن کو یہاں بلا لو۔

اسم موصول وہ ہے جس کے بعد ایک جملہ بطور بیان آئے۔ اُس جملہ کو صلہ کہتے ہیں۔
اسم موصول اکیلا نہ فاعل ہوسکتا ہے۔ نہ مفعول نہ مبتدا۔ اردو میں جو، جوں، سا، جن، ہم، موصول ہیں جیسے جس آدمی سے اچھی بات کہو وہ بُرا مانتا ہے۔ جون سا تھان ملے خرید لینا ان جملوں میں جو اور جون سا اسم موصول ہیں۔

اسم معہود:۔

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ذہنی اور خارجی۔ ذہنی وہ ہے جو کہنے والے کے ذہن میں معین ہو۔ سننے والے کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ جیسے میرے دوست کو بلا لو۔ اور دوست سے مراد کوئی خاص شخص ہو۔

معہود خارجی وہ ہے جو کسی خاص وجہ سے کسی معرفہ اسم پر دلالت کرے۔ جیسے نظام بہت مخیّر ہیں۔ یہاں نظام سے مراد والی دکن ہیں۔

اسم مضاف وہ ہے جو ان پانچوں اسم مذکورۂ بالا کی طرف مضاف ہو۔ جیسے میرے بھائی کا غلام، چچا کی لونڈی، احمد کا اونٹ، میرا آدمی، شمس العلماء کا نوکر، نظام کا باغ۔

قاعدہ:۔ مضاف الیہ کی تخصیص سے مضاف بھی معرفہ یا نکرہ مخصصہ بن جاتے ہیں۔

اسم منادی وہ ہیں جس کو متکلم پکارے۔ او جانے والے، اے لونڈے، جمع کا 'ن' گرانے سے واوٴ حرف منادی کا کام دیتا ہے۔ جیسے ستمگارو۔ یارو۔ یعنی اے یار۔ اے ستمگار۔

تذکیر و تانیث۔ ہر اسم مذکر ہے یا مونث سوا اسم صفت کے۔ مذکر اور مونث۔ اسم کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور غیر حقیقی۔ تمام ذی روح حقیقی ہیں۔ حقیقی کی دو قسمیں ہیں۔ نر اور مادہ۔ نر کو مذکر، مادہ کو مونث کہتے ہیں۔

غیر حقیقی وہ ہیں جو ذی روح نہیں ہیں۔ جیسے صفحہ مذکر، کتاب مونث، غیر حقیقی کی دو قسمیں ہیں۔ قیاسی اور سماعی۔

قیاسی وہ ہیں جو کسی قاعدے اور قانون کے مطابق مذکر یا مونث ہوں۔ جیسے قاعدہ ہے کہ جس مصدر عربی کے آخر میں (ت) ہوگی یا ہمت، دولت، منافرت، قباحت کے قافیے پر جو اردو فارسی کے الفاظ آئیں۔ وہ سب مونث ہیں بہ خلاف شربت، خلوت، ست وغیرہ

کے جو سماعی مذکر ہیں۔

اب ہم اسی قاعدے اور قیاس سے چھت، گت، قیمت، صورت کو مونث کہتے ہیں۔

سماعی وہ ہیں جن میں قاعدہ اور قیاس نہ چل سکے بلکہ صرف اہل زبان سے سُن کر ان کی تذکیرو تانیث قائم کی ہو، جیسے موتی، دہی، پانی، گھی، جی، تعویذ مذکر ہیں۔ اور آس یا خبر مونث۔

اردو، عربی فارسی کے وہ الفاظ جس کی جمع یائے مجہول سے آتی ہے۔ یا جن کے آخر میں یائے مجہول ہے۔ سب مذکر ہیں۔ جیسے کیلے۔ حقے، شعلے، وغیرہ۔ اردو کے تمام مصدر مذکر ہیں۔

اردو کے حاصل مصدر جن کے آخر میں (ک) ہو مونث ہیں۔ جیسے دمک، چمک، جھلک وغیرہ۔

وہ الفاظ جن کی جمع یں سے آتی ہے سب مونث ہیں۔ جیسے بیلیں، کتابیں، کیلیں، مُہریں، لہریں، موجیں۔

درد اگر چہ مذکر لفظ ہے مگر اس کو ین سے جمع کرتے ہیں اور دردیں، درد زہ کے معنی پر مونث ہیں۔ اور یہ محاورہ خلاف قاعدہ ہے۔ بعض الفاظ کی تذکیرو تانیث میں اختلاف ہے۔ جیسے طرز مذکر اور مونث دونوں بدلتے ہیں۔ نقاب، قامت مذکر مونث دونوں طرح جائز ہے۔ آبدست مذکر بھی ہے مونث بھی۔ فکر کو اہل دہلی مذکر بولتے ہیں اہل لکھنؤ مونث۔ ذی روح کو اہل دہلی مذکر کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ مونث۔

واحد اور جمع کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو واحد کہتے ہیں اور پونے دو سے جمع شروع ہوتی ہے۔ پونے دو روپے۔ پونے دو آنے۔

اردو میں جمع کی علامتیں آٹھ ہیں:۔ یائے مجہول، واؤ، ین، ون، ان، اون، نون، ین۔ جیسے لڑکے، دوستو، کتابیں، آدمیوں، روٹیاں، جفاؤں، بلائیں، لٹیاں۔

ندا کی حالت میں واؤ مجہول بولیں گے۔ جیسے دوستو، محبو۔

اردو فارسی کے تمام الفاظ مذکر ہوں یا مونث اُن پر جب حرف عامل آئیں گے تو جمع ون یا وَں سے آئے گی۔ جیسے مسلمانوں نے کہا۔ ہندوؤں سے کہو۔ لڑکیوں کو بلالو۔ بلاؤں کو رد

کرو۔ جفاؤں سے بے زار ہوں۔اسی طرح چراغوں، باغوں، داغوں۔

ہندی اسم کے آخر میں الف، یا فارسی اسم کے آخر میں ہ ہوگی تو اسے حذف کریں گے۔ کتا سے کتوں۔اچھا سے اچھوں،گلدستہ سے گلدستوں۔

وہ ہندی مذکر الفاظ جن کے آخر میں الف ہو یاہ ہواور فارسی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں (ہ) ہو عربی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں الف منادی ہو یائے مجہول بڑھانے سے جمع ہوں گے۔ لیکن بعض الفاظ جیسے راجہ اور بعض رشتے جیسے چچا، پھوپھا، دادا، نانا اور اعلام جیسے شہر گیا اس سے مستثنیٰ ہیں۔

وہ اسم جو الف یا ہ آخر میں رکھتے ہیں اور جمع کی حالت میں یائے مجہول سے نہیں بدلتے اُن پر حرف فاعل نہ ہو تو واحد جمع ہو جاتا ہے۔ جیسے راجہ آئے تھے۔

جس اسم کے آخر میں علامت فاعل مفعول اضافت ظرفی نہ ہو اور اس کا آخری حرف الف یا ہ نہ ہو اس کا واحد جمع ہے۔ جیسے مرد آئے۔ قالین بکے۔ برتن مول لیے۔

ہندی کا ہر مونث لفظ جس کے آخر میں (ی) معروف ہو اس کی جمع ان سے آئے گی جیسے روٹیاں، بوٹیاں۔

کنواں، دھواں اور اس طرح کے بعض ہندی الفاظ الف گرا کے (ے) زیادہ کرنے سے جمع ہو جاتے ہیں جیسے کنواں، دھواں، کنویں کھدوائے، دھویں اڑا دیے۔

بعض الفاظ کوئی علامت جمع کی نہیں رکھتے اور جمع بولے جاتے ہیں۔ جیسے لوگ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو مونث ہیں۔اور ان میں جمع کی علامت نہیں لگائی جاتی ہے جیسے یاد۔

قاعدہ:۔ عربی جمع کے الفاظ اردو میں واحد بولے جاتے ہیں۔ جیسے اولاد جمع ہے ولد کی۔ مگر واحد بولا جاتا ہے۔ جیسے میری اولاد نیک ہے۔ اس کو بہ قاعدۂ ہندی جمع کر سکتے ہیں۔ جیسے آپ کی کتنی اولادیں ہیں۔ لیکن بعض جمع عربی کو اردو میں جمع کرنا ناجائز ہے۔ جیسے خیال کی جمع خیالات۔ اس کو خیالاتوں کہنا ناجائز ہے۔ اسی طرح شائقین کو شائقینوں، حکام کو حکاموں، عورت کو عوراتوں بولنا ناجائز ہے۔

نحو کا بیان

نحو وہ علم ہے۔ جس سے کلموں کی ترکیب اور جدا کرنے کا قاعدہ معلوم ہو۔ جب دو یا زیادہ کلمے ملائے جائیں تو ان کو کلام کہتے ہیں۔ کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ناقص اور تام۔

ناقص کلام وہ ہے جس سے سننے والے کو پورا مطلب معلوم نہ ہو۔ جیسے کالا بوٹ سفید دری، باسی ہار، اس سے سننے والے کو خبر نہ ملی اور کہنے والے کا مطلب معلوم نہ ہوا۔

کلام تام وہ ہے جس سے سننے والے کو پوری تشفی ہو جائے۔ مطلب معلوم ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ جیسے تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کہنے والا تندرستی کی صفت بیان کرتا ہے۔

مرکب ناقص کی بہت قسمیں ہیں۔ مرکب اضافی۔ مرکب توصیفی، مرکب عددی۔ مرکب امتزاجی۔ مرکب غیر امتزاجی، مرکب عطفی، مرکب اشاری، مرکب موصولی، تابع موضوع، تاکید، موکد، مرکب، استثنا، ممیز وتمیز وغیرہ۔

مرکب اضافی۔ جب دو اسم ایک دوسرے سے متعلق کیے جائیں تو اس تعلق کا نام اضافت ہے۔ جس اسم کا تعلق دوسرے اسم سے کیا جائے اُسے مضاف اور دوسرے کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ عربی اور فارسی میں پہلے مضاف آتا ہے اور پھر مضاف الیہ اردو میں پہلے مضاف الیہ پھر مضاف آتا ہے۔ فارسی اضافت کی علامت زیر ہوتی ہے اور مضاف کے ساتھ آتی ہے۔ اردو میں علامت اضافت کی ہمیشہ مضاف الیہ کے آخر میں ہوتی ہے اور حرفوں میں آتی ہے۔ یہ علامتیں نو ہیں۔ کا، کی، کے، را، ری، رے، نا، نی، نے۔ جیسے بکری کا گردہ، دل کی حسرت۔ لکیر کے فقیر، تمھارا بیٹا۔ ہمارے غلام تیری لڑکی۔ اپنا دل، اپنی بات۔ اپنے نوکر۔

قاعدہ :۔ مضاف الیہ اور مضاف دونوں اسم ہوتے ہیں۔ کوئی فعل نہیں ہوتا۔

اضافت کی دس قسمیں ہیں۔ تملیکی، تخصیصی، توضیحی، بیانی، تشبیہی، مجاز مرسل، استعارہ ظرفی، ادنیٰ، توصیفی۔

تملیکی، مالک کی اضافت مملوک کی طرف ہو تو اس کو اضافت تملیکی کہتے ہیں۔ جیسے قاسم کی بلی۔

اضافت ظرفی ۔ جس میں مضاف الیہ ظرف اور مضاف مظروف ہو۔ جیسے حوض کا پانی جنگل کا شیر، یہ اضافت ظرف مکانی ہے۔ ظرف زماں۔ جیسے شام کا سہانا وقت۔ دوپہر کی دھوپ ،کبھی مضاف الیہ مظروف اور مضاف ظرف ہوتا ہے۔ جیسے پانی کا لوٹا۔ چائے کی پیالی۔

تخصیصی۔ جس میں مضاف الیہ سے مضاف کو خصوصیت ہو۔ انار کی چھال۔ گلاب کی پتّی۔

توضیحی:۔ جس میں مضاف الیہ مضاف کی وضاحت کرے۔ اس اضافت میں مضاف عام ہوتا ہے۔ اور مضاف الیہ خاص۔ جیسے جنوری کا مہینہ۔ چوک کا محلّہ۔

بیانی:۔ جس میں مضاف الیہ حقیقت اور مادہ مضاف کا ہو۔ جیسے مٹّی کی دیوار۔ چاندی کا کٹورا۔

تشبیہی :۔ جس میں ایک چیز سے دوسری چیز کو مثال دی جائے۔ جیسے ہرن کی آنکھ یعنی ہرن کی جیسی آنکھ۔

اضافت مجاز مرسل:۔ جس میں ایک مجاز کی طرف بہ اعتبار مفروضہ اضافت کی جائے جیسے دل کی آنکھ، خیال کے پاؤں۔

اضافت استعارا:۔ جس میں ایک مجازی شے کی طرف بہ اعتبار تشبیہ اضافت کی جائے جو حقیقت میں نہ ہو۔ جیسے ابرو کی تلوار۔

اضافت ادنیٰ:۔ تھوڑے تعلق سے ایک شے کو دوسرے سے منسوب کریں جیسے ہمارا ہندوستان۔ حقیت میں ہندوستان ہمارا نہیں۔ لیکن ہندوستان میں رہنے سے ہم ہندوستان کو اپنا کہتے ہیں۔

اضافتِ توصیفی :۔ جس سے کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی معلوم ہو۔ جیسے شدّت کی دھوپ دل کا کنجوس۔

فارسی میں مضاف کا حرف آخر مکسور ہوتا ہے۔ جیسے دامنِ صبا۔ روزِ عید۔ اسپ زیداور اگر حرف آخر الف یا واوٗ ماقبل مضموم ہو تو ہمزہ مکسور زیادہ کیا جاتا ہے۔ جیسے وفائے دوست، روئے دشمن۔

مرکّب توصیفی :۔ جب دو اسم مل کر پہلا موصوف ہو، دوسرا صفت ہو تو اُس جملے کو توصیفی کہتے ہیں۔ جیسے اچھا آدمی، عقلمند لڑکا، فارسی مرکب توصیفی میں موصوف کو کسرہ دیتے ہیں۔ جیسے قلبِ سیاہ، دلِ روشن۔

مرکّب عددی جو دو عددوں سے مل کر بنا ہو۔ جیسے اکیس، بائیس، تیئیس، چوبیس،

مرکب ظرفی جو مظروف اور ظرف سے بنا ہو۔ جیسے قلمدان۔ پاندان۔

مرکّب امتزاجی وہ ہے جس میں دو جُز مل کر ایک کلمہ بنا ہو۔ جدا جدا معلوم نہ ہوں۔ پنکٹی پنڈبہ، جو اصل میں پان کوٹنے کی چیز اور پان کا ڈبہ تھا۔

مرکّب غیر امتزاجی۔ جس کے دو اسم مل کر ایک نہ ہوئے ہوں۔ لیکن معنی ایک ہوں۔ جیسے شکر قند، بارہ دری۔

مرکّب اشاری :۔ جو اسم اور اشارہ سے مل کر بنا ہو۔ جیسے وہ آدمی۔

مرکّب موصولی :۔ میں دو جز ہوتے ہیں۔ ایک کو صلہ دوسرے کو موصول کہتے ہیں۔

جب کسی اسم کی پہچان کا کوئی کلمہ بیان کیا جائے تو اسم کو موصول اور پہچان کے کلمہ کو صلہ کہتے ہیں۔ جیسے وہ روپیہ جو کھوٹا تھا۔ اس میں روپیہ موصول ہے اور کھوٹا صلہ جو حرف صلہ ہے۔

بدل اور مبدل منہ :۔ جب دو اسم اس طرح بیان کیے جائیں کہ ایک مقصود اصلی ہو اور دوسرے سے چنداں غرض نہ ہو تو مقصود اصلی کو بدل اور دوسرے کو مبدل منہ کہتے ہیں۔ جیسے احمد علی کا نام محمد علی۔ اس میں احمد علی مبدل منہ ہے اور محمد علی بدل۔ کُرتا چھٹی لڑکی کرتا مبدل منہ ہے اور لڑکی بدل ہے۔

مرکّب عطفی اس کو کہتے ہیں جس میں ایک کلمے کے بعد دوسرا کلمہ بعد حرف عطف کے آئے جیسے نواب علی اور محمد علی۔ اس میں نواب علی معطوف الیہ اور محمد علی معطوف ہے۔

مرکب استثنا :۔ مستثنیٰ جس کو علاحدہ کریں، استثنا، جس سے علاحدہ کریں۔ جیسے محمود کو چھوڑ کے اور سب لوگ، احمد علی کے علاوہ جو کوئی ملے۔

عطفِ بیان :۔ جب دو نام ایک ہی اسم کے بیان ہوں۔ دونوں میں جو زیادہ مشہور ہو اس کو عطفِ بیان کہتے ہیں۔ جیسے شمس العلماء مولانا شبلی۔ عطف بیان ہی شمس العلماء کا مرکب

تابع مہمل ۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ جو محض زینت کلام کے لیے آتا ہے جیسے سچ مچ ۔ تابع موزوں ۔ با معنی اور زائد الفاظ جیسے رونا دھونا۔

مرکب تاکیدی، جو تاکیداً آئے ۔ جیسے میں آپ، اس میں آپ تاکید اور میں موکد ہے۔ یا تاکید لفظی جیسے آؤ آؤ۔

مرکب تمیزی وہ ہے جو دو اسموں سے مرکب ہو اور ایک اسم دوسرے اسم کی شرح کرے۔ جیسے ایک چلو پانی، اس میں ایک چلو مبہم ہے اس لیے ممیز ہے۔ پانی تمیز ہے۔

اس کے علاوہ اسم فاعلی ترکیبی، اسم صفت ترکیبی، اسم مکبر، اسم مبالغہ، اسم تفضیل یہ سب مرکب ناقص ہیں اور یہی مرکبات ناقص مبتدا، خبر کے ساتھ مل کر جملہ خبریہ اور امر اور استفہام کے ساتھ مل کر جملہ انشائیہ یعنی مرکب مفید بن جاتے ہیں۔

مرکب مفید یا کلام تام وہ ہے جس سے سننے والے کو پوری بات معلوم ہو۔ مرکب مفید کم سے کم ہمیشہ دو جملوں سے مرکب ہوتا ہے۔ جہاں صرف ایک جملے میں مرکب مفید ہو وہاں دوسرا جملہ محذوف ہوگا۔

کم سے کم جملہ دو اسم یا ایک اسم ایک فعل سے بنتا ہے جملے کی دو قسمیں ہیں۔ اسمیہ اور فعلیہ ہر جملے کے دو اسم ہوتے ہیں۔ ایک مسند اور دوسرا مسند الیہ۔ وہ لفظ جو کسی کی طرف منسوب ہو اسے مسند الیہ کہتے ہیں یا محکوم الیہ اور جو منسوب کیا جائے اُسے مسند کہتے ہیں جس لفظ سے نسبت ہو اُسے حکمیہ یا اسناد کہتے ہیں۔

اسم مسند اور مسند الیہ دونوں ہو سکتا ہے۔ جیسے کتا کالا ہے۔ کتا مسند الیہ کالا سنہ اور فعل ہمیشہ مسند ہوتا ہے۔ جیسے احمد بڑا مسند الیہ اسم یا ضمیر ہوتا ہے۔ جیسے میں نے مارا آؤ اور جاؤ، ظاہر میں مفرد الفاظ ہیں۔ لیکن دونوں جملے ہیں۔ اس میں ضمیر مخاطب پوشیدہ ہے۔ یعنی تم آؤ، تم جاؤ، اردو میں ہمیشہ مسند الیہ پہلے آتا ہے۔ آؤ جملہ فعلیہ ہے۔ جملہ فعلیہ وہ ہے جو فعل اور فاعل سے مل کر بنا ہو۔ اگر فعل لازم ہے تو فاعل پر تمام ہوگا۔ جیسے سکندر آیا۔ سکندر فاعل ۔ آیا فعل، فعل اور فاعل مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ اردو میں ہمیشہ فاعل پہلے آتا ہے۔ اگر فعل متعدی ہے تو مفعول کا ہونا ضرور ہے ۔ جیسے مادھو رام نے کتاب کھولی ۔ مادھو رام فاعل ۔ نے علامت فاعل ۔ کتاب مفعول، کھولی

فعل، فاعل اپنے مفعول اور فعل سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔

قاعدہ:۔ متعدی فعل میں پہلے فاعل، پھر مفعول، پھر فعل آتا ہے۔ جیسے حاتم نے فقیر کو کھانا دیا۔ حاتم فاعل ۔ نے علامت فاعل فقیر مفعول کو علامت مفعول، کھانا دیا فعل مرکب، فاعل اپنے مفعول اور فعل مرکب سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ اور اگر فاعل نہ ہو تو پہلے مفعول، پھر فعل ۔ جیسے رستم پکڑا گیا۔

جملہ اسمیہ:۔ جس جملے میں مسند اور مسند الیہ دونوں اسم ہوں وہ جملہ اسمیہ ہے۔ جملہ اسمیہ ہمیشہ دو اسموں سے مل کر بنتا ہے۔ جیسے خدا واحد ہے۔ خدا ابتدا، واحد خبر ہے حرف ربط ۔

مفعول بجائے فاعل، فعل مجہول میں مفعول کو بجائے فاعل سمجھنا چاہیے ۔ جیسے کوڑا پھینکا گیا کوڑا مفعول بجائے فاعل پھینکا گیا۔ فعل مجہول فعل اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔

فعل متعدی مجہول میں جب ایک مفعول ہوتا ہے تو اس میں علامت مفعول نہیں آتی ۔ جیسے موہن مارا گیا۔ شوکت باندھا گیا۔ لیکن ضمیر مفعول میں اکثر علامت آتی ہے۔ جیسے جب ان کو سمجھایا گیا تو سمجھے۔

اور جن افعال متعدی مجہول میں دو مفعول ہوتے ہیں اُن میں علامت مفعول ضرور آتی ہے جیسے موہن کو ٹوپی دلوائی گئی۔

مفعول متعدی۔ فعل متعدی میں جو مفعول آتا ہے اس کو مفعول بہ کہتے ہیں۔

مفعول بہ وہی ہے جس کی ذات پر فاعل کا فعل تمام ہو جیسے میں نے کتاب پڑھی۔ میں نے فعل، کتاب مفعول بہ پڑھی فعل ۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جب مفعول غیر ذی روح ہو تو علامت کا لانا ضروری نہیں ہے۔ جیسے میں نے کھانا کھایا۔ میں نے پانی پیا۔ میں نے روٹی کھائی۔ اور اگر مفعول ذی روح ہے تو علامت ضرور آئے گی۔ جیسے احمد کو بلایا۔ حامد کو پکارا۔

مفعول منہ اس کو کہتے ہیں جو وقوع فعل کا آلہ ہو۔ اردو میں اس مفعول کی علامت (سے) آتی ہے۔ جیسے زید تلوار سے مارا گیا۔ شوکت لاٹھی سے ہلاک کیا گیا۔ اس میں تلوار اور لاٹھی مفعول منہ ہیں۔

مفعول لہ، جو سبب کام کرنے کا ہو جیسے شرم سے آنکھ نیچی رکھتا ہے۔ آنکھ نیچے رکھنے کا

سبب شرم واقع ہوئی۔اس لیے شرم مفعول لہ ہے۔

مفعول معہ وہ ہے جو مفعول بہ کا تابع یا شریک ہو۔ جیسے محمود نے گھوڑا زین سمیت خریدا۔اس جملے میں زین مفعول معہ ہے جو تابع ہے مفعول بہ کی۔

مفعول مطلق اردو میں اس حاصل مصدر کو کہتے ہیں جو فعل کا مرادف ہو یا ایسے فعل کا معمول ہو جو اسی سے بنا ہو جیسے زید کو مار ماری گئی۔غلام علی بیٹھک میں بیٹھا۔

مفعول فیہ فعل کے صادر ہونے کی جگہ یا فعل کے صادر ہونے کا وقت کبھی ظرف زمان اور کبھی ظرف مکان واقع ہوتا ہے۔جیسے کوٹھے پر گیا۔گھر میں آیا۔دوپہر کو آیا۔دریا میں کودا۔اس کی علامتیں پر کو میں ہیں جو کبھی محذوف ہوتی ہیں۔وہ گھر آیا تھا۔یعنی گھر میں آیا تھا۔اور کبھی علامت لانا ضرور ہوتا ہے جیسے صبح کو تم باغ نہیں گئے۔

مجرور جار۔اردو میں پہلے مجرور آتا ہے اس کے بعد جار۔جار اردو میں کچھ حرف ہیں جو فعل کے معنوں کو مجرور سے ملاتے ہیں۔مجرور اور جار مل کر ہمیشہ متعلق فعل ہوتے ہیں۔جیسے فرہاد نے شیریں کو محبت سے دیکھا، فرہاد اسم فاعل نے علامتِ فاعل شیریں مفعول کو علامت مفعول محبت مجرور سے حروف جار مجرور جار سے مل کر متعلق فعل ہوا۔فعل اپنے فاعل اور مفعول اور متعلق سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔

جملہ عاطفہ۔جس میں ایک حرف علّت مذکور ہو یا محذوف۔عطف سے پہلے جملے کو معطوف علیہ اور آخر کو معطوف کہتے ہیں۔جیسے بشیر آیا اور وزیر گیا۔بلکہ بھی حرف علت ہے۔ بشیر فاعل، آیا فعل، فعل فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ ہو کر معطوف ہوا۔معطوف علیہ اور معطوف مل کر جملہ عاطفہ ہوا۔

اگر اسم کا عطف اسم پر فاعل کا عطف فاعل پر ہو تو خبر اور فعل جمع ہوں گے۔جگناتھ اور رام پرشاد ذہین ہیں۔کلکتہ اور بمبئی اچھے شہر ہیں۔دریا اور سمندر بہتے ہیں۔

اور اگر معطوف (معطوف الیہ دونوں مونث یا معطوف مونث ہے تو جمع نہیں کریں گے جیسے چاندنی اور دری رکھی ہے۔قلم اور دوات کہاں گئی۔فعل اور خبر کی تذکیر و تانیث بہ اعتبار معطوف ہوگی۔تلوار اور نیزہ کیا ہوا۔روٹی اور کپڑا دینا ہوگا۔

معطوف اور معطوف علیہ میں جمع اور واحد کا اختلاف ہو جب بھی معطوف کا لحاظ ہوگا۔
جیسے کٹورا اور پیالیاں رکھی ہیں۔ کچھوے اور مچھلیاں بہہ گئیں۔

جملہ شرطیہ وہ ہے جس میں جملے کا حکم کسی بات پر موقوف ہو۔ حکم والے جملے کو خبر اور جس پر حکم موقوف ہو اسے شرط کہتے ہیں۔

اردو میں پہلا جملہ شرط اور دوسرا جزا ہوتا ہے۔ جیسے اگر مولچند آئے گا تو میں جاؤں گا۔
کبھی حرف شرط محذوف ہوتا ہے۔ تم اٹھو، میں بیٹھوں، کبھی حرف جز محذوف ہوتا ہے۔ اگر میں آؤں تم چلے جانا۔

جملہ معلّلہ جس میں پہلا جملہ دوسرے کی علّت ہو۔ پہلے کو معلول، دوسرے کو علّت کہتے ہیں۔ جیسے وہاں سے چلا آیا۔ اس لیے کہ چوروں کا خوف تھا۔ وہاں سے چلا آیا معلول اس لیے حرف علت۔ چوروں کا خوف تھا علت۔

جملہ ندائیہ وہ ہے جس میں ندا اور منادی کے علاوہ جواب ندا بھی ہوتا ہے یعنی وہ جملہ جس کے لیے پکاریں۔ جواب ندا کبھی فعلیہ ہوتا ہے کبھی اسمیہ۔ جیسے اے خدا بچا۔ اے حرف ندا خدا منادی بچا فعل جواب ندا مل کر جملہ فعلیہ ندائیہ ہوا۔

جملہ تفسیر یہ وہ جملہ جس میں دوسرا جملہ تفسیر بیان سابق ہو۔ پہلے کو مفسر دوسرے کو تفسیر کہتے ہیں۔ جیسے آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ تمھیں صندوقچہ منگوا دیں گے۔ اس میں پہلا جملہ مفسر دوسرا تفسیر ہے۔

جملہ تشبیہہ :۔ واسطے تشبیہہ بیان کے آتا ہے۔ جیسے امیرؔ و داغؔ مثلِ آفتاب و مہتاب تھے۔ امیرؔ کو آفتاب داغؔ کو مہتاب سے باعتبار کمال فن تشبیہہ دی ہے اور حرف تشبیہہ مثل ہے اگر حرف تشبیہہ بیان نہ کیا جائے تو استعارہ ہے۔ کبھی حرف تشبیہہ (آنہ) بھی آتی ہے۔ جیسے امیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ عاقلانہ کارروائی کی۔

جملہ بیانیہ وہ ہے جو فاعل یا مفعول یا مبتدا خبر کا بیان واقع ہوا ہو۔ جس اسم کا بیان ہو اسے مبین کہتے ہیں۔ مبین اکثر اسم اشارہ ہوتا ہے۔ جو کبھی محذوف اور کبھی مقدر ہوتا ہے۔ جیسے یہ میں جانتا ہوں کہ تو میرا دوست ہے۔ یہ اسم اشارہ، میں فاعل، جانتا ہوں فعل، کہ کاف بیانیہ تو مبتدا

، میرا ضمیر۔ مضاف الیہ دوست مضاف ہے۔ حرف ربط مضاف الیہ مضاف مل کر خبر ہوئے۔ مبتدا کی۔ حرف ربط مل کر جملہ اسمیہ ہو کر بیان ہوا مبین کا مبین بیان مل کر فعل ہوا۔ فاعل کا فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ بیانیہ ہوا۔

جملہ معترضہ۔ جب ایک جملے کے بیان میں دوسرا جملہ غیر ضروری آئے تو وہ جملہ معترضہ ہے۔ جیسے شوکت (قرآن درمیان) اپنے بھائی سے اچھا ہے۔ اس میں قرآن درمیان جملہ معترضہ ہے۔

جملہ دعائیہ وہ ہے جس میں دعا پائی جائے۔ جیسے خدا حیدر حسین کو نیک نصیب کرے خدا فاعل، حیدر حسین مفعول کو علامت مفعول، نیک نصیب مفعول ثانی، فعل، فاعل اور مفعول سے مل کر جملۂ فعلیہ دعائیہ ہوا۔

جملہ خبریہ وہ ہے جس کے سننے والے کو معلوم ہو کہ متکلم کسی چیز کی خبر دیتا ہے اور اسے سچا یا جھوٹا کہہ سکیں۔ جیسے سلامت روی اچھی چیز ہے۔ سلامت روی مبتدا۔ اچھی چیز خبر ہے حرف ربط مبتدا اپنی خبر اور حرف ربط سے مل کر جملہ خبریہ ہوا۔ جملہ کبھی مفرد بھی آتا ہے جیسے نیکی بہتر ہے۔

حال ذوالحال وہ اسم ہے جو فاعل یا مفعول کی صورت موجودہ کو ظاہر کرے۔ اردو میں اسم حالیہ اسم صفت حال اور ذوالحال ہوتے ہیں۔ جیسے زید ہنستا جاتا تھا۔ یہاں ہنستا جاتا تھا اسم حالیہ ہے۔ یعنی ہنستا ہوا جاتا تھا۔ زید ذوالحال ہے۔ یا جیسے میں نے زید کو غمگین دیکھا۔ یہاں مفعول سے حال واقع ہوا ہے۔ جس اسم کی حالت یا ہیئت کا بیان ہو اسے ذوالحال کہتے ہیں۔

جملہ انشائیہ وہ ہے جس میں کسی چیز کی خبر نہ دی جائے۔ صرف اظہار مطلب ہو اس کی بارہ قسمیں ہیں۔ ایک وہ جملہ ہے جس میں امر ہو۔ 1 اے بی آپا اٹھو منہ کھولو۔ دوسرا نہی 2۔ ہم کو دق نہ کرو۔ تیسرے استفہام 3 جیسے کیا سر دکھتا ہے۔ پیٹ میں درد ہے۔ تو کیا تم آپ سے آپ بیٹھ رہے۔ تعجب 4۔ اللہ رے غرور، اللہ رے بے غیرتی۔ تحسین 5 ماشاء اللہ کیا کہنا۔ انبساط 6۔ جیسے اہا کیا ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔ قسم 7 جیسے تمھارے سر کی قسم، ندا 8، جیسے یارو یہاں

آنا۔ ندبہ 9، جیسے اُف کیا درد ہے۔ عرض 10، جیسے میں نے آپ کی خدمت میں پہلے گزارش کیا۔ ہم کہے دیتے ہیں مانو یا نہ مانو۔ تمنا 11، جیسے کاش وہ اب بھی چلا جائے۔ تنبیہ 12، جیسے خبردار آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ بس بس۔ اب نہ ستانا۔

حرفوں کا بیان

اسم اور فعل کے ملانے کے لیے جو الفاظ آتے ہیں ان کو حرف کہتے ہیں۔ حرف تذکیر اور تانیث کی قید سے بری ہیں۔ کوئی حرف نہ مذکر ہے نہ مونث۔ حرف بے اسم اور فعل کے اپنے معنی نہیں بتا سکتا۔ اردو میں یہ بات سب سے جداگانہ ہے کہ اس میں اضافت کے بھی حرف آتے ہیں اور یہ مضاف الیہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور مفرد حرف یا معنی نہیں ہوتے۔ مرکب حرف ہوتے ہیں۔ اور لفظ سے الگ آتے ہیں۔ یہ تمام مرکب حرف چوبیس قسم کے ہوتے ہیں۔ حرف جار، حرف استثنا، استفہام، تمنا، اثبات ونفی، تائید، تحسین، تشبیہ، تعجب، تنبیہ، شرط، جزا، شک، عطف، علت، ندا، ندبہ، انبساط، فاعل، مفعول، حصر و تخصیص، بیان، حرف جار وحرف ہیں جو اسم کو فعل سے ملاتے ہیں۔ سے۔ میں۔ پر۔ جب۔ تک۔ لیے۔ جیسے ایک تھپڑ بھولے سے ماردیا۔

فہمیدہ نے خط لے کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

قاعدہ:۔ میں اور میں میں فرق ہے۔ میں حرف جار ہے اور میں ضمیر حاضر ہے۔ اس کے علاوہ تلک بن وغیرہ خلاف فصاحت ہیں۔ ان کا استعمال جائز نہیں۔ سے ابتدا کے معنی پر آتا ہے جیسے شروع سے ساتھ کے معنی پر۔ جیسے سالن سے روٹی کھالی۔ جیسے کے معنی پر، تم سے بزدل کیا ہوگا۔ تک کا استعمال انتہا کے معنی پر آتا ہے۔ جیسے جھوٹے کو حد تک پہنچادو۔ پاس کے معنی پر جیسے مجھ تک آؤ۔ پر کے معنی اوپر کے آتے ہیں۔ جیسے کوٹھے پر نہ جانا۔ بعد کے معنی پر، جیسے زید کے مرنے پر آئے۔ یعنی مرنے کے بعد آئے۔ لیکن کے معنی پر جیسے اس نے بہت کیا۔ پر میں نے نہیں مانا۔ میں کا استعمال اندر کے معنی پر ہوتا ہے جیسے گھر میں بیٹھے ہیں۔ یعنی گھر کے اندر بیٹھے ہیں۔ لیے واسطے کے معنی پر۔ جیسے ہمارے لیے کیا لائے ہو۔

اضافت کے حرف نو ہیں۔ کا، کی، کے، را، ری، رے، نا، نے، نی۔ اضافت کے حرف

ہمیشہ تعلق کا فائدہ دیتے ہیں۔ جیسے پادری صاحب کی بات، نصیبوں کی شامت، اپنا نفع، اپنی بات، میرا نوکر، تیری لونڈی۔

قاعدہ:۔ ایک کی اور بھی آتی ہے۔ جو فعل ماضی مطلق کے معنی دیتی ہے۔ جیسے میں نے بات کی تو خفا ہوئے۔

حرف استثنا:۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرتے ہیں۔ جیسے الاّ، مگر، لیکن، علاوہ حرف استثنا ہیں۔ جیسے تمھارے سوا میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ تمام عزیز جمع تھے۔ مگر یوسف نہ تھا۔

حرف استفہام:۔ سوال کے لیے آتے ہیں۔ کیا، آیا، کیوں، کس لیے، کس واسطے، کیا ابتدائے کلام میں آتا ہے۔ جیسے کیا تم کسی کے نوکر ہو۔ کیا یہ بات سچ ہے۔ تم کیوں نہیں کھانا کھاتے۔

حرف تمنا:۔ کاش، کاش کے، کاش ایسا ہوتا۔ کاش خدا نے مجھے دولت دی ہوتی۔ اکثر یہ حرف ماضی تمنائی کے ساتھ آتا ہے۔

اثبات کے حرف۔ ہاں، جی، ہاں میں ضرور آؤں گا۔ اور جی ایسے موقع پر بولتے ہیں۔ کہ کوئی پکارے موہن۔ جواب میں کہا جائے۔ جی۔ یعنی ہاں۔

نفی کے حرف:۔ نہیں، نہ، مت، جیسے میں نہیں لاؤں گا۔ تم نہ آئے تو کیا ہوا۔ مت غیر فصیح ہے۔

تاکید کے حروف:۔ ضرور، ہرگز، زنہار، جیسے کل ضرور آنا، تم ہرگز کھانا نہ کھانا، زنہار کوئی بات نہ کہنا، خبردار ایسی بات نہ کرنا۔

تحسین کے حرف وہ ہیں جو تعریف کے لیے آتے ہیں۔ آفریں، شاباش، سبحان اللہ، واہ واہ، شاباش بیٹا شاباش، سبحان اللہ کیا غزل کہی ہے۔ واہ واہ کیا کہنا۔

تشبیہ کے حروف، مانند، ایسا، بعینہ، موافق، جیسے ایسا آدمی کہیں نہیں دیکھا۔ میرے مانند محنت کرو تو معلوم ہو۔ اس نمبر کے موافق ایک اور بنوا دو۔

تعجب کے حروف:۔ افوہ، اللہ اللہ، اوہو، اللہ اللہ آج مزاج نہیں ملتے، افوہ کس غضب کا درد ہے۔

تنبیہ کے حروف، جو دھمکانے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ بس بس۔ جیسے بس اب شرارت نہ کرنا۔

شرط و جزا کے حرف: اگر، تو، جیسے اگر تم آؤ گے تو میں کچھ دوں گا۔ حرف شک، شاید، شاید وہ آیا۔

علّت کے حرف وہ ہیں جو کسی امر کا سبب ظاہر کریں۔ اس لیے، اس واسطے، خوب محنت کرو، اس لیے کہ امتحان قریب ہے۔ وہ پرہیز نہیں کرتا اس واسطے ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔

عطف کے حرف: بلکہ اور پھر، جیسے زید اور عمر آئے، پہلے موہن آیا، پھر کلو، احمد آیا بلکہ محمود۔

ندا کے حروف:۔ اے، او، ارے، اے بھائی، اولڑکے، ارے لڑکے۔

ندبہ کے حرف:۔ جو افسوس کے مقام پر بولے جاتے ہیں۔ جیسے ہائے ہائے، وائے وائے، حیف، ہیہات، افسوس۔

انبساط کے حرف:۔ جو خوشی میں زبان سے نکلتے ہیں۔ اہاہا، اُہو ہو، اہاہا کیا خوش ہوا ہے، اہو ہو کیا آراستہ محفل ہے۔

لفظ و معنیٰ

جس طرح حرف صوت کی نمائندگی کرتا ہے۔لفظ جذبات،احساسات،تصورات،کی نمائندگی کرتا ہے۔لفظ کے اجزائے ترکیبی حرف ہیں اور زبان کے اجزائے ترکیبی لفظ ہیں۔

لفظ کی اہمیت:

کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ ''کن'' سے یہ دنیا، یہ کائنات پیدا ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ لفظ ''اوم'' کی عظمت اور برکت بیان سے باہر ہے۔ یہ ذکر اس غرض سے کیا گیا کہ لفظ محض لفظ کی اہمیت پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جائے۔لفظوں سے عبارت اور عبارتوں سے ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔لفظ ہی زبان کا سرمایہ اور مول ہوتے ہیں۔لفظوں سے ایک زبان اور ادب کا درجہ قائم ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح لفظوں پر بھی جوانی اور بڑھاپا اور موت کا عمل ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظ پیدا ہوتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں۔ٹھیاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔زبان میں رائج ہونا لفظ کی جوانی ہے کم استعمال ہونا اس کا بڑھاپا اور متروک ہو جانا اس کی موت ہے۔

علم و ادب کی بارہ قسموں میں اگرچہ اول نمبر علم لغات کو دیا گیا ہے۔لیکن متقدمین کے نزدیک علم لغات کی ہستی لغت یعنی لفظ اور اس کے معنی تک محدود تھی۔ اس کی صرفی اور صوتیاتی

حیثیت کی طرف برائے نام توجہ تھی ۔ ایسے لفظ بہت سے ہیں جو اپنی تاریخ میں اپنا شجرۂ نسب پوشیدہ رکھتے ہیں ۔ بہت سے زمانے کے انقلابوں اور قوم کے سانحوں کی تواریخ کے امانت دار ہیں ۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں جو ایک قوم کی سیاسی ، اخلاقی ، یا معاشرتی ترقی یا زوال کی روائداد اپنے میں لیے ہوئے ہیں ۔ ان سب امور کے دفتر کو فلسفہ لغات کہنا درست ہوگا ۔ آگے چل کر ان امور کے زیرنظر لفظ کی حیثیت سے بحث کی جائے گی ۔ اس باب میں اردو کے الفاظ کو ادبی اور تواریخی روشنی میں دیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے ۔

لغات کی قدر :۔

دنیا کوددں اور ہیچ اور پنجر وزہ ، کوئی کچھ بھی کہے لغات کی ایک مکمل کتاب کو اس کی سوانح عمری سمجھنا چاہیے ۔ کیونکہ کوئی چیز ، کوئی سانحہ اور واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت ظہور میں آچکا ہو اور اس کتاب میں درج نہ ہو ۔ اگر ایک قوم کی تاریخ کے دفتر فنا ہو جائیں مگر اس کی زبان کا لغات موجود ہو تو اس کی مدد سے اس قوم کی تاریخ پھر مرتب ہو سکتی ہے ۔ مثال کے لیے ایک لفظ ناؤ کو لیجیے ۔

ناؤ پانی میں چلنے والی سواری کو ہماری زبان میں کہتے ہیں ۔ آج کل ہندوستانی سمندری قوم نہیں مانے جاتے اور نہ وہ مغربی نفس معنی میں سمندری قوم ہیں ہی ۔ لیکن یہی ہندوستانی ناؤ ہند کے سمندروں سے چل کر مغرب میں پہنچی اور وہاں اس نے (Navy navigatior) اور (Nautical) پیدا کیے ۔ ہومر جہاز کو Naus کہتا تھا ۔ ناؤ جیسی ایک اور آبی سواری کو ہمارے یہاں بجرا کہتے ہیں ۔ اس لفظ سے اٹلی کا Brig اور لاطینی Barge بنا اور (Bargain) کی اصل بھی یہی لفظ بجرا بتایا جاتا ہے ۔ پس ناؤ اور بجرا یہ دو لفظ اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اہل ہند جہاز رانی اور سمندر کے سفر سے بے گانہ نہیں تھے ۔ اگر چہ اس وقت وہ بحری قوم نہیں ہیں ۔ آپ نے دیکھا کیونکر لفظ نے مردہ تاریخ کو پھر زندہ کر دیا ۔ لانچ (Launch) کا لفظ بھی پرتگیزی مشرق سے یورپ کو لے گئے ۔ اور میرا خیال ہے کہ بیچ (Beach) کا لفظ ہندوستان سے یورپ گیا ۔ بیچ اس ریتیلے میدان کو کہتے ہیں جو ساحل اور سمندر کے پانی کے بیچ میں واقع ہو ۔

الفاظ کون بناتا ہے:۔

عالم اصطلاحیں گھڑتا ہے اور ادیب محاورے بناتا ہے۔ شاعر صنائع اور بدائع کی پیدائش کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن عام الفاظ لوگ بناتے ہیں۔ ان میں بڑا حصہ اہل حرفت کا ہے۔ ان کا تصرف کا سلیقہ اور تخلیق لفظ کی قابلیت حیرت انگیز ہے۔ دریسی، دوفنا، کھڑکی نلائی، گڑائی، آری، رندہ، کُھرپا، کرنی، بسولی، درانتی، یہ سب لفظ ثقات یا ادیبوں، شاعروں نے نہیں پیدا کیے۔ بلکہ ان لوگوں نے پیدا کیے جن کے پیشے میں ان کی ضرورت تھی۔ سپاہی کے ایک اوزار تلوار کو لیجیے۔ اصل میں تر دار تھا۔ تر درخت کو کہتے ہیں۔ پہلے درخت کاٹنے کو ایک اوزار بنایا گیا اور تر ور کی نسبت سے اسے تلوار کہنے لگے۔ پھر اس سے جانور بھی مارنے لگے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ اوزار جو درخت کاٹنے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ سپاہی کا نہایت کارآمد ہتھیار بن گیا۔ اسی طرح بہت سے لفظوں کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ لفظیت اور معنویت کا مطالعہ اور تحقیق نہایت دلچسپی کے علاوہ لسانیات کی جان ہے۔

بھادوں کی سہانی پُھوار دیکھ کر انسان نے اپنی تفریح کے لیے فطرت کی وارفتگی اور غیر مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا۔ خزانہ اور مال سے کام لیا۔ جس کے نتیجے کو پھوار کہتے ہیں۔ اب وہ جب چاہتا ہے پھوار کے مزے لوٹتا ہے۔ فارسی زبان میں پھر نہ تھی۔ فوارہ کہنے لگے۔

جاپانی میں بندہ:۔

لفظ اپنے ماخذ کی تحقیق سے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ کیا کیا لائے۔ جاپان کی زبان میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کا وجود اس امر کی خبر دیتا ہے کہ جاپان کی کلچر ہندوستان کے کلچر سے کہاں تک متاثر و مستفید ہوئی۔ بہت سے لفظ ہمارے وطن کے لہجے کے خفیف تغیر کے ساتھ جاپانی میں موجود اور اپنائے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ بندہ ہے جو جاپانی خط کے آخر میں اپنے نام کے پہلے لکھتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں بڑوں کے نام خطوط کے بارے میں اب تک کم و بیش دستور ہے۔

لفظوں پر ذی رسوخ ناموں کا تاریخی اثر یا ان کا ارتقا:۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مہتمم بالشان ہستی سے منسوب ہو کر ایک لفظ کے معنی متاثر اور

ممتاز ہوتے ہیں۔(1) جدھشٹری راست بازی ہندی (2) نوشیروانی انصاف (3) سارنگی (4) سلیم شاہی (5) جہانگیری (6) نادری، نادری حکم، نادر گردی (7) مرہٹی گھس گھس (8) سکھا شاہی وغیرہ۔

تشریح:۔

1۔ پانڈوؤں کا بڑا بھائی جدھشٹر راست بازی اور سچ بولنے کے لیے مشہور تھا۔ جب یہ صفت نسبتی سچائی کے ساتھ منسوب ہوئی تو اس لفظ کے معنی میں بہت ترقی ہوگئی۔

2۔ عدل یا انصاف ہمیشہ اعلیٰ صفات سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کے ناموں میں ''نیا ئکاری'' کا لفظ داخل ہے۔ نوشیرواں عدلِ گستری میں تاریخی شہرت رکھتا ہے! اس نام سے نسبت پا کر عدلی کی صفت اور بیّن ہوگئی۔

3۔ سارنگی خود بول رہی ہے کہ میں سارنگ دیو کی پروردہ ہوں۔

4۔ ایک خاص وضع کی جوتی جو شاہزادہ سلیم سے منسوب اور دوسری وضع کی جوتیوں سے متمیز ہے۔

5۔ جہانگیری پونچے کا زیور جو ملکہ نور جہاں نے اختراع کیا اور جہانگیر بادشاہ کے نام سے منسوب کیا

6۔ نادر شاہ کی کڑی سیاست، استبداد اور جلال مشہور ہیں۔ اس شخصیت سے منسوب ہوکر گنجفہ میں نادری اور سیاست میں نادری حکم یعنی اٹل حکم اور نادر گردی یعنی استبداد یہ مرکب لفظ وضع ہوئے۔

7۔ مرہٹوں کی حکومت میں دفتر کے پیچیدہ دستور العمل کی وجہ سے جسے آج کل کے زمانے میں کالا فیتا سمجھئے۔ معاملات کے فیصل ہونے میں بہت دیر لگتی تھی اور محکمے کی رپورٹوں میں قلم بہت گھسایا جاتا تھا۔ اس لیے مرہٹی گھس گھس کا وجود ہوا۔ یعنی معاملات کے طے ہونے میں غیر معمولی دیر لگنا۔

8۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف الملو کی، بے ضابطگی اور بدانتظامی کا غلبہ رہا۔ اس سے سکھا شاہی کا مرکب پیدا ہوا۔

عام لفظ پارس کا اثر قبول کرتے ہیں:۔

عربی میں مدینہ محض شہر کے معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی مدینہ سے مدنیت اور تمدن مشتق ہیں۔ لیکن جب سے پیغمبر اسلام مکّہ سے ہجرت کر کے اس شہر میں پناہ گزیں ہوئے۔ اور آخر تک وہیں رہے۔ لفظ مدینہ کو علم کا امتیاز حاصل ہو گیا۔ اور اب مدینہ کہیں یا مدینہ منوّرہ مراد وہ خاص شہر ہوتا ہے۔ یہ شرف اس لفظ کو پیغمبر اسلام کی قیام گاہ ہونے سے نصیب ہوا۔ اسی کو پارس کا اثر کہا گیا ہے۔ لوہا پارس پتھر سے چھو کر سونا بن جاتا ہے۔ یہ تو محض افسانوی گپ ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ کسی ممتاز شخصیت کی قربت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

یہی حال گنگا لفظ کا ہے۔ ویدک عہد میں گنگا صرف دریا کا مرادف تھا۔ آریہ جب ہندوستان میں پھیلے اور ان کو عروج ہر قسم کا حاصل ہوا اور انھوں نے ایک خاص دریا کے پانی کی جانچ کی جو ہردوار کے مقام پر میدان میں داخل ہوتا ہے تو گنگا صرف اسی دریا کا نام رہ گیا اور مدینہ کی طرح علم کی حیثیت اس کے حصے میں آ گئی۔

یہی حال حج اور یاترا کا ہے۔ دونوں کے معنی تھے جانا اور سفر کرنا۔ مگر اب یہ لفظ ایک خاص معنی کے حامل ہیں۔ جس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہی کیفیت شہید، عید، دسہرہ اور پیغامبر جیسے لفظوں کی ہے۔ ابھی جو بیان ختم ہوا ہے۔ اسے لفظوں کا ارتقا سمجھنا چاہیے۔ انسانوں اور قدموں کی طرح لفظوں کو بھی تنزل کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

لفظوں کا تنزل:۔

بعض لفظ عظیم الشان بلکہ مقدس مقام سے گر کر بالکل مختلف بلکہ ذلیل معنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

لن ترانی:۔ یہ کلمہ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کی جانب خطاب ہوا تھا۔ مگر اب بے جا شیخی اور ڈینگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

صلوٰۃ:۔ اس لفظ کے معنی ہیں رحمت، درود، اور یہ لفظ پیغمبر اسلامؐ کے نام سے خاص تعلق رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔ لیکن اردو میں اس کے معنی ہوئے بُرا بھلا کہنا۔ گالی گلوج۔

رام کہانی:۔ نام تھا سری رام چندر جی کی زندگی کے حالات کا۔ اب فضول، طول، کے

معنی میں یہ مرکب لفظ استعمال ہوتا ہے۔

دیو:۔ پہلے دیوتا یعنی غیر معمولی قوائے روحانی اور فوق البشر اور صاف رکھنے والے کو کہتے تھے۔ اب اندر سبھا کا لال دیو آپ جانتے ہیں۔

یہی حال یار غار اور قُل آعوذی، گرو گھنٹال، بگلا بھگت، چالاک، شیخی، اور مشیخیت وغیرہ کا ہے۔ لفظوں کے معنوی تنزل کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں اسی قدر کافی سمجھی جاتی ہیں۔

بعض الفاظ اہل زبان کی اعلیٰ کلچر کا ثبوت ہیں:۔

بھنگی کی افادیت اور نفس کشی ظاہر ہے۔ اس نے مہذب اور شائستہ جماعت میں مہتر، حلال خور، جمعدار اور پہلوان نام پائے۔ نہایت نا کامیاب شخص کو بخت ور اور کند ذہن اور نا سمجھ کو خوش فہم اور نحوست لانے والے کو سبز قدم، اندھے کو حافظ اور سورداس کہا گیا۔ ایسے شخص کو جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ہر شخص کے تمسخر اور پھبتی کا شکار ہو نقلِ محفل کہا گیا۔ بحث یا معاملے میں فریق کے مقابل کے نامعقول عذر کو عذر لنگ نام دیا گیا۔ دیہات کے رہنے والے کو اس کی حیثیت کی تمیز کے بغیر چودھری کہتے ہیں اور کہار کو بھگت جی۔ اسی نوع میں آتا ہے۔ سنگترے کو رنگ ترہ اور شراب کو رام رنگی کہنا۔

لفظ رسوم کا آئینہ دار:۔

راجپوتوں میں رسم تھی جب کوئی نہایت دشوار کام یا مہم پیش آتی تو سب سرداروں کو جمع کیا جاتا۔ وہ ایک حلقہ باندھ کر بیٹھتے۔ بیچ میں ایک پان کا بیڑہ رکھ دیا جاتا۔ اس کام یا اس مہم کی دقتیں وغیرہ جتائی جاتیں اور دعوت دی جاتی کہ جو ذمہ داری کے طور پر اس کام کا ذمہ لے وہ سامنے آئے۔ جو شخص اس کا ذمہ لیتا وہ اس بیڑے کو اُٹھا لیتا۔ اب بیڑا اُٹھانے کے معنی قرار پائے کسی مشکل کام کے سرانجام کی ذمہ داری لینا۔ مردے کے پھول، جوہر (جیوہر) اور ساکھا وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔

لفظ کا اپنی اصل چھپانا:۔

بعض لفظوں کی اصل دریافت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس خاندان کے وہ ظاہرا معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اس سے نہایت مختلف الاصل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مقیش کو

لے لیجیے۔ لغات میں اس کے معنی یہ دیے گئے ہیں:۔

''مقیش۔ ع، وہ شے جس پر چاندی یا سونے کے چپٹے اور باریک تار لپٹے ہوں۔
چاندی کی چوڑی، چاندی کے تار۔

ہماری زبان میں محض چاندی سونے کے تاروں کو مقیش کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیٹ عربی نہیں۔ معرب تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کی شکل اور صورت عربی الفاظ کی سی ہے۔ اردو لغت میں مقیش کو اردو لکھا ہے۔ وہ اردو ہو یا عربی یا معرب۔ اس کی اصل چھپی ہوئی ہے۔ اس کا ماخذ اس کے وجود سے ظاہر نہیں۔ اسی کو میں اصل چھپانا کہتا ہوں۔

سنسکرت میں میکش آفتاب کا نام ہے اور کیش بالوں کو کہتے ہیں۔ دونوں لفظوں سے مرکب کے معنی ہوئے سورج کی کرن۔ جب مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ایک طرف سے ڈورے میں گتھ دیتے ہیں اور پوشاک کے حاشیے پر باہر کو نکلا ہوا ٹانک دیتے ہیں تو مسالے کی اس چیز کو کہتے بھی کرن ہیں۔ یہ خفا اس وقت ہوتی ہے جب ایک لفظ اپنے وطن سے دور اور باہر چلا جاتا ہے۔ حکیم سید مہدی کمال لکھنوی اس لفظ مقیش کو ہندی بتاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک لفظ کتن ہے۔ اہلِ ہند نے سب سے پہلے روئی کات کر اس کا کپڑا بنایا۔ یہ کتن عرب میں جا کر قطن بنا اور یورپ میں جا کر کاٹن۔

یہ تو ہوا لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ فوجی اور نیم فوجی اعلیٰ عہدہ داروں کی وردی میں آستین پر جو خاص نشانات کپڑے کے کاٹ کر سی دیتے ہیں جن سے ان کی منصبی حیثیت معلوم ہوتی ہے اور جنھیں انگریزی میں بیج کہتے ہیں۔ اس بیج کا بلاّ کیوں کر بن گیا؟

مترادف کا غیر مترادف ہو جانا:۔

بعض لفظ ایسے ہیں جو کبھی مترادف تھے۔ مگر اب متفرق المعنی ہو گئے جیسے غریب اور اجنبی۔ اب غریب مفرد حالت میں اجنبی کے معنی نہیں دیتا۔ اس کے معنی ہو گئے، مفلس، نادار۔ ترتیب میں وہی اجنبی کے معنی دے گا۔ جیسے شامِ غریباں، گورِ غریباں، غریب الدیار۔

غیر مترادف کا مترادف ہو جانا:۔

بہانہ اور حیلہ کو لو۔ بہانہ کے معنی تھے اور ہیں محض عذر، معذرت، حیلہ کے معنی میں

دھو کے دھڑی کا جز شامل تھا۔ جواب اس میں سے نکل گیا اور اب یہ دونوں لفظ مترادف استعمال ہوتے ہیں۔ کہاوت ہے۔ ''جیلے روزی بہانے موت۔''

ایک لفظ کے کئی معنی:۔

پر، ایک لفظ ہے جو تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔

1۔اوپر، 2۔مگر، 3جن سے پرندہ اُڑتا ہے۔

بیٹھک:۔1۔ملاقات کا کمرہ اور 2۔ایک قسم کی ورزش۔

تھان:۔ 1۔ململ کا تھان، بیس گز یا مقررہ لمبائی کا سالم ٹکڑا جو بنانے والے بناتے ہیں، 2۔گھوڑے کے بندھنے کی جگہ، 3۔مزار، درگاہ جیسے سید کا تھان۔

لٹھا:۔1۔ایک قسم کا کپڑا، 2۔لکڑی کا بہت موٹا اور لمبا پورا۔

مگر:۔1۔حرف استثنا بہ معنی لیکن، 2۔پانی کا ایک بڑا جانور، 3۔کان کا زیور۔

گنج:۔1۔سر کے بال کا اُڑ جانا، 2۔خزینہ، 3۔یکساں چیزیں جو ایک دوسرے میں سما جائیں۔

بالا:۔1۔قد، 2۔اونچا، اعلیٰ، 3۔بچہ، 4۔چکمہ، دھوکا۔

اعراب کے اختلاف سے معنی میں اختلاف:۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ وہی رہتا ہے یعنی جن حروف سے وہ بنا ہے۔ ان میں فرق نہیں آتا صرف اعراب بدل جاتے ہیں۔ جس سے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ جیسے، حُکم، حَکَم، حِکَم، قَدَر، قدر، طَور، طور، بین، بَین، بُل، بِل، بَل، بل، پَل، پِل، پُل۔

اختلافِ زبان، اختلافِ معنی:۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک زبان میں ایک معنی دیتا ہے اور دوسری زبان میں دوسرے:۔ جیسے مور اردو میں ایک نہایت شاندار بڑے پرند کا نام ہے۔ اور فارسی میں چیونٹی کا، کان اردو میں سننے کا قدرتی آلہ، اور فارسی میں معدن۔ کبھی کبھی اردو میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

1۔ انگور دھو کے کھائے

2۔ آپ کے بہت دھوکے کھائے۔ اب میں ہوشیار ہو گیا ہوں۔ اس مکمل ہمنوائی سے

دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ بیان کے سلسلے اور عبارت کے قرینے کو سمجھنے سے غلط فہمی کا امکان جاتا رہتا ہے۔

ایک لفظ کے دو مقاموں پر دو معنی:۔

چالاک جب فرض کیجیے گھوڑے کے ساتھ استعمال ہو تو اس کی بہت اچھی صفت ہے لیکن آدمی کے ساتھ استعمال ہو تو اس کا عیب بتاتا ہے۔ یہاں اس کے معنی ہوں گے دغاباز، فریبی اور چور بھی۔

یتیم الفاظ:۔

بعض الفاظ (مرکب یا مفرد) ایسے ہیں جن کی اصلیت کا پتہ نہیں چل سکتا یعنی ان کا مادہ اور ماخذ نامعلوم ہے۔ جیسے:۔

چرقو، الپٹو، اول جلول، الم غلم، اللے تللے، نٹ کھٹ، پھچھالیدر ہنڈی، چرقاتیا۔

بعض جانوروں کے بچوں کے خاص لفظ:۔

میمنا۔ بکری کا بچہ	برہ۔ بھیڑ کا بچہ
پاٹھا۔ ہاتھی کا بچہ	پٹھا۔ الو کا بچہ
پلا۔ کتیا کا بچہ	بلونگڑہ۔ بلی کا بچہ
بچھیرا، بچھیری، گھوڑی کے بچے	بچھڑا (بچھیا) گائے کے بچے
کٹڑا (کٹڑی) بھینس کے بچے	چوزا۔ مرغی کا بچہ
ہرنوٹا (چکارا) ہرن کا بچہ	سنپولا۔ سانپ کا بچہ
گھٹیا۔ سور کا بچہ	

خاص اجتماعوں کے لیے خاص نام:۔

خاص جانداروں یا غیر جانداروں کے مجموعے کے لیے اردو میں خاص لفظ مقرر ہیں جو اسم جمع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے:۔

طلبا کی جماعت

رندوں کا حلقہ

بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، گلا

گوؤں کا جوتا

مکھیوں کا جھلڑ

ستاروں کا جھرمٹ یا جھومر

عورتوں کا جھرمٹ یا جھومر

آدمیوں کی بھیڑ

جہازوں کا بیڑا

ہاتھیوں کی ڈار

کبوتروں کی ٹکڑی

چیڑ کا، بانسوں کا جنگل

درختوں کا جھنڈ (بہت سے ساتھ اُڑتے ہوئے پرندوں کے لیے بھی)

اناروں کی کنج

بدمعاشوں کی ٹولی

سواروں کا دستہ

ٹڈی دل، چیونٹی دل

انگور کا گچھا

کیلوں کی گہل

ریشم کا لچھا

مزدوروں کا جتھا

فوج کا پرا

لکڑیوں کا گٹھا

روٹیوں کی تھئی

کاغذوں کی گڈی

خطوں کا طوبار ہندی
کا بتوں کی گُچی
بالوں کا گُچھا
پانوں کی ڈھولی
امتریاں۔آموں کا بڑا باغ
فالیز،خربزے یا کھیرے،ککڑی کا بڑا کھیت

آوازیں:۔

اردو کی فراخ دلی اور حوتیاتی عظمت ان لفظوں سے واضح ہوتی ہے ۔ جو مختلف جانوروں وغیرہ کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ایسے چند الفاظ یہاں لکھے جاتے ہیں۔

شیر دہاڑتا ہے۔ہاتھی چنگھاڑتا ہے۔گھوڑا ہنہناتا ہے۔گدھا، ہینچوں ہینچوں کرتا ہے۔ گدھا رینکتا ہے۔کُتا بھونکتا ہے۔بلّی میاؤں کرتی ہے۔گائے رانبھتی ہے۔سانڈ ڈکارتا ہے۔ اونٹ بلبلاتا ہے۔بکری ممیاتی ہے۔کوئل کوکتی ہے۔چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔کوا کائیں کائیں کرتا ہے۔کبوتر غٹرغوں کرتا ہے۔مکھی بھنبھناتی ہے۔مرغی کڑکڑاتی ہے۔اُلّو ہوکتا ہے۔مور جھنکارتا ہے۔تو تا رٹ لگاتا ہے۔مرغا ککڑوں کوں کرتا ہے۔پرندے چُر چُراتے ہیں۔اونٹ بغبغاتا ہے(مستی میں) سانپ پھنکارتا ہے۔گلہری چچچاتی ہے۔مینڈک ٹراتا ہے۔جھینگر جھنگارتا ہے۔بندر کھنکھیاتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی آوازیں خصوصیت رکھتی ہیں۔اُن کے لیے جدا جدا لفظ مقرر ہیں جیسے:۔

بادل کی گرج،بجلی کی کڑک،ہوا کی سنسناہٹ،توپ کی دنادن،صراحی کی گٹ گٹ، گھوڑے(کے چلنے) کی ٹاپ،ربوں کی کھنک،ریل کی کھڑکھڑ،گویوں کی تانا ری ری،طبلے کی تھاپ، تنبورے کی آس،گنبد کی گونج،گھڑیال کی ٹن ٹن،چھکڑے کی چوں چوں چکّی کی گُھمر وغیرہ۔

پھر خاص چیزوں کی جوہری کیفیت کے اظہار کے لیے خاص لفظ ہیں۔جیسے:

موتی کی آب،کندن کی دمک،ہیرے کی ڈلک،چاندی کی چمک،گھنگھرو کی جھن جھن، دھوپ کا تڑاقا،بو کی بھپک،عطر کی لپٹ،پُھول کی مہک۔

زبان کی اشتقاقی قوت اور فطرت سے موانست:۔

ہماری زبان میں یہ طاقت اور صلاحیت غیر معمولی ہے۔ایک رنگوں کے ناموں ہی کو لو۔کوئی دولفظوں سے نہیں بنا۔صرف تعریف کا عمل حاوی رہا۔پھران ناموں میں فطرت کتنی جھلک رہی ہے،اودا، ہرا، نیلا ، پیلا وغیرہ تو تھے ہی ، گیہواں ،چمپئی ، جامنی ، دھانی ،شنگرفی، فالسائی ،لاجوردی،موتیا،بیگنی،سروئی ، پیازی ،گلابی اور کاکریزی کو دیکھواور اردو کی تصریفی اہلیت اور فطرت پسندی کی داددو۔

خاص شخصوں اور جانوروں کے مسکن کے لیے خاص لفظ:۔

یہ ہماری زبان کی وسعت ہے کہ مختلف رہنے والوں کے مسکن کے لیے مختلف لفظ مخصوص ہیں۔جیسے:۔

بادشاہ کا محل،بیگموں کا حرم،رانیوں کا رنواس،فوج کی بارک،رشی کا آشرم،صوفی کا حجرا،فقیر کا تکیہ یا کٹیا، بھلے مانس کا گھر،غریب کا جھونپڑا،بھڑوں کا چھتا ،لومڑی (گیدڑ) کا بھٹ، پرندوں کا گھونسلا ، چوہے کا بل، سانپ کی بانبی ،فوج کی چھاؤنی ،مویشی کا کھڑک ، گھوڑے کا تھان۔

سابقے اور لاحقے:۔

عموماً ایک اور کبھی دوحرف ایک لفظ کے پہلے آکر اس کے معنی بدل دیتے ہیں۔ انھیں سابقہ کہتے ہیں ۔ یہی اگر لفظ کے آخر میں بڑھائے جائیں تو لاحقہ کہلاتے ہیں ۔ جیسے: امر(مر)اٹل(ٹل) کھاؤ،اڑاؤ،گھائل،مریل(گھاؤ) مرنا)ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ قواعد کی کتاب میں دیکھا جائے۔یہ سابقے اور لاحقے کہیں صفت کے،کہیں فاعلیت کے،کہیں مفعولیت کہیں مبالغے اور کہیں قسم قسم کے معنی اصل لفظ کو پہناتے ہیں۔

اردو میں مرکبات کا ذخیرہ بے انتہا اور بے بہا ہے۔یہ وہ موضوع ہے جو ایک علاحدہ دفتر چاہتا ہے۔ان مرکبات کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔بڑی قسمیں دو ہیں

1۔ جس میں دونوں لفظ دیسی ہوں

2۔ جس میں ایک لفظ دیسی اور دوسرا لفظ فارسی یا عربی ہو۔

دیسی الفاظ کے مرکب:۔

کبھی یہ دو مختلف فعلوں سے بنتا ہے۔ جیسے:۔

لے لوٹ۔ جو کسی سے کوئی چیز لے کر واپس نہ کرے۔ یعنی قرضہ یا کچھ چیز کسی سے لے کر لوٹنی لگا جائے۔ واپسی کا نام نہ لے۔

آیا گیا:۔ اس کے معنی ہیں ختم ہونا۔ ''آپ تو شریک ہی نہ ہوں گے تو جلسہ بس آیا گیا ہوا''۔ ''اب وہ رقم آئی گئی سمجھئے''۔

کبھی ایک اسم اور ایک فعل سے مرکب بنتا ہے۔ اُردو میں ایسے مرکبات کی کثرت ہے۔ مرجیوڑا، کھل اباڑ، ہنس مکھ، ہتھ چھٹ، پھلجھڑی، نام لیوا، ہری چگ، منہ پھٹ، یلین موتی، گل چلا، گھاؤ گھپ، کبھی مرکب کے دونوں اجزا اسم ہوتے ہیں:

بگلا بھگت۔ ٹیڑھی کھیر، جھٹ بھیا، رام کہانی، چوپٹ راج، مگر مچھ، اندر سبھا، راج روگ، گنگا جمنی، تل چاولی، بال کمانی۔

ایک اردو ایک فارسی وغیرہ کے میل سے:۔

ان مرکبوں میں ایک لفظ (اکثر) فارسی کا یا کبھی عربی کا اور دوسرا لفظ اردو کا ہوتا ہے۔ فارسی لفظ زیادہ تر فعل ہوتا ہے۔ ایسے مرکب اردو میں کثرت سے مستعمل ہیں۔ چند یہاں دیے جاتے ہیں۔

لچک دار، دھاری دار، گنڈے دار، بٹیر باز، چال باز، پٹے باز، ہتھیار بند، سنسنی خیز، گل تکیہ، گلے باز، ٹیپ دار، شور باچٹ، جوشیلا تھڑ دار، ہیرا تراش، امام باڑہ، جگت استاد، عجائب گھر، سبزی منڈی، کفن کھسوٹ، جوڑ دار، ٹکڑ گدا، نیک چلن، بدروپ، بے سرا، جیب کترا، کٹ ملا، دل لگی، سمجھدار، ڈھلمل یقین، گراں ڈیل، چوگوشیہ، چوراہہ، تراہہ، کم سمجھ، اُگال دان وغیرہ۔

نکتہ:۔ بعض اردو ادیبوں کو یہ سب اور ایسے بہت سے مرکب ہضم ہو جاتے ہیں مگر سنسنی خیز ذہنی متلی پیدا کر دیتا ہے۔

ایک انگریزی لفظ کے ساتھ:۔

جیل خانہ۔ توس دان (ٹوسٹ کا توس بن گیا) ٹکٹ بابو، ریل گاڑی، کلب گھر۔

بعض مرکبات میں دیسی لفظ کوئی نہیں :۔

بعض مرکب عربی فارسی یا فارسی الفاظ کو ملا کر بھی بنائے گئے ہیں جو صرف اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے قبول صورت، خوش دامن۔ طرہ باز وغیرہ۔

فارسی عربی مرکبات کو اپنا لیا:۔

کہیں قدرے تصرف سے کام لیا۔ کہیں نہیں، مزدور، مزدور بنالیا، شب برات کا شبرات ہوگیا۔ یہی حال بکرید کا ہے۔ گالی گفتار، تھکا فضیحتی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

اُردو کے مرکّب افعال

اُردو کے وہ تمام افعال جو ایک مادے سے وضع ہوئے اور صرف ایک معنی پر دلالت کرتے ہیں، بسیط یا غیر مرکّب (Simple) ہیں۔ جیسے اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، فرمانا، بخشنا، قبول کرنا، پتھرانا، بھنبھنانا، کھنکھنانا وغیرہ۔

یہ افعال ذیل کے فعلی، اسمی یا حکائی مادوں سے وضع ہوئے ہیں اور ان کے معنوں پر دلالت کرتے ہیں۔

اُٹھ، بیٹھ، کھانا، نرم، بخش، قبول، پتھر، بھن بھن، کھٹ کھٹ۔ اِس کے مقابلے میں دو طرح کے افعال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اوّل وہ افعال جو دو یا دو سے زیادہ مادّوں سے وضع ہوئے۔ لیکن ایک معنی پر دلالت کرتے اور ان سے صرف ایک معنی متبادر ہوتے ہیں۔ جیسے: آنکھیں دکھانا۔ سر اُٹھانا، طلب کرنا، نام دھونا، چُپ ہونا، قسم کھانا، باز آنا، بر لانا، از بر کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ افعال ایک اسم، ایک فعل، ایک صفت ایک فعل یا ایک (اور ایک سے زیادہ) حرف اور فعل سے وضع ہوئے ہیں۔ لیکن اِن کا مفہوم جو ان سے متبادر ہوا واحد ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں بسیط الفاظ مل جاتے ہیں۔ انھیں بسیط فعل سے ظاہر بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسے باز آنا (= رُکنا) چُپ ہونا (= چپنا) طلب کرنا (= چاہنا، منگانا) وغیرہ۔

دوسرے وہ افعال جو دو یا دو سے زیادہ مادوں سے ترکیب پا کر وجود میں آئے اور اُن سے ان دونوں مادوں کے معنی متبادر ہوئے ہیں۔ ہر شخص ان سے ان کے مجموعی معنی مراد لیتا ہے۔ مثلاً:

بول اُٹھنا، لڑ پڑنا، آنکلنا، دے مارنا، دوڑ سکنا، بگڑ جانا، رکھ لینا، بتا دینا، لکھ چکنا، وغیرہ۔

یہ افعال دو مختلف فعلی مادوں سے بنے ہیں۔ دونوں مادے اپنی بنیادی شکل میں ہیں۔ اور ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ جہاں ان کی گردان ہوتی ہے وہاں ان کے مصادر (Nouns of action) بھی مستعمل ہیں۔ اور مصدر کی علامت 'نا'، (جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے) مرکب فعل کے آخری جزو پر اضافہ کی جاتی ہے جو ثبوت ہے اس امر کا کہ یہ افعال دو مادوں کے ترکیب پانے کے باوجود ایک اکائی ہیں۔ لیکن ان میں ایک کمی ہے، وہ یہ کہ ان میں معنوی وحدت نہیں۔ پہلی قسم کے افعال کے برخلاف ان افعال کا ہر جزو ایک معنی ادا کرتا ہے۔ مثلاً بول اٹھنا کے معنی ہیں یک بیک (بے سمجھے بوجھے) دفعتہً بولنا۔ اسی طرح لڑ پڑنا کے معنی ہیں اچانک کسی سے الجھنا یا بھڑ جانا۔ آنکلنا اور چل نکلنا، وغیرہ الفاظ سے بھی محض 'آنا'، یا 'چلنا'، کے معنی متبادر نہیں ہوتے۔ دفعتہً نمودار ہونا اور حالتِ سکون سے حرکت میں آنا سمجھا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا افعال میں یہ نئے معنی کہاں سے آئے۔ کس نے ان کو یہ نئے معنی دیے؟ جواب واضح ہے۔ یہ نئے معنی ان افعال کو ان کے دوسرے جُزو اُٹھنا، پڑنا، نکلنا وغیرہ نے دیے۔ ان افعال کے اس دوسرے جزو کو جس نے اصل فعل میں ان نئے معنوں کا اضافہ کیا۔ قواعد کی اصطلاح میں امدادی فعل کہتے ہیں۔

اِس تفصیل سے مرکب افعال کی دو قسمیں اور روشنی میں آئیں۔ جن کا اس سلسلے میں ذکر ہونا چاہیے۔ تاکہ مقابلے اور موازنے سے یہ واضح ہو سکے کہ ان میں سے کون سے افعال اس قابل ہیں کہ انھیں مرکب کہا جائے۔ پہلی قسم ان افعال کی ہے جو اردو کی گردانوں یا صیغوں میں ملتے ہیں۔ ان کے مصادر مستعمل نہیں اور نہ حسبِ قاعدہ ان کے مصادر وضع کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تھا، ہے، گا، رہا، وغیرہ امدادی فعلوں سے ترکیب پانے والے صیغے ہیں۔ مثلاً کرنا کو لیجیے اِس سے مذکورہ بالا امدادی فعلوں کی مدد سے ذیل کے صیغے اور گردانیں وجود میں آئیں۔

کیا ہے۔ کرتا ہے = کیا (کرتا) + ہے۔ (فعل + فعل)

کیا تھا۔ کرتا تھا = کیا (کرتا) + تھا۔ (فعل + فعل)

کر رہا + ہے (تھا) = کر + رہا + ہے (تھا) (فعل + فعل + فعل)

یہ اردو کے چلتے ہوئے سکے جنھیں ہر جگہ چلایا جا سکتا اور ان کی مدد سے اردو کے ہر فعل کو (اصل ہو یا وضعی، لازم ہو یا متعدی) گردانا جا سکتا ہے، اپنے اصلی فعل کے ساتھ مل کر مصدر کی شکل اختیار نہیں کر پائے۔ کیوں؟ ہے۔ تھا یا رہا کو فعل کے ساتھ جوڑ کر ہونا یا رہنا نہیں کہتے۔ کیوں؟ یہ میں آئندہ سطروں میں عرض کروں گا۔

دوسری قسم میں وہ افعال آتے ہیں جن کے مصادر تو موجود ہیں لیکن مصادر میں ان کا اصلی فعل بنیادی (مادی) شکل کی بجائے بدلی ہوئی تعریفی شکل میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ کہیں مصدر (مغیرہ) کی صورت میں۔ جیسے آنے دینا۔ کہنے لگنا۔ جانے پانا۔

2۔ کہیں ماضی (قائم یا مغیرہ) کی صورت میں جیسے پڑا پھرنا، مٹا جانا، کیا کرنا۔ اُٹھا رکھنا، نکالا چاہنا، کہے جانا۔

3۔ کبھی فعل حال (مغیرہ) کی صورت میں۔ جیسے (بولتے رہنا وغیرہ)

اِن کے علاوہ ذیل کے افعال بھی ہیں۔ جن کا اس سلسلے میں اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ حالیہ عاطفہ سے ترکیب پانے والے افعال جن کا لاحقہ، عاطفہ حذف ہو گیا ہے۔ جیسے ہک بھرنا (ہک کر بھرنا) دیکھ آنا (دیکھ کر آنا) لے آنا (لے کر آنا)

2۔ وہ ہم معنی یا ہم ماخذ افعال کے جوڑے، جیسے دیکھنا بھالنا، ملنا جلنا، ناپنا تولنا، توڑنا تاڑنا، رونا دھونا، سینا پرونا، چلنا پھرنا، کھانا پینا وغیرہ۔

افعال کی یہ چھ قسمیں ہوئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ افعال مرکب ہیں یا ان میں سے کچھ مرکب ہیں اور کچھ غیر مرکب؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ طے ہونا چاہیے کہ ترکیب کے معنی کیا ہیں اور مرکب کسے کہتے ہیں۔ ترکیب کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ اشیا کا گھل مل کر ایک ہونا یا ایک اکائی کی شکل اختیار کرنا۔ کچھ چیزوں کو برابر رکھ دینے سے اس طرح پر کہ ان میں کوئی آمیزش یا ملاپ نہ ہو ترکیب حاصل نہیں ہوتی۔ ترکیب اس صورت میں حاصل ہوگی کہ مختلف چیزوں کو خلط ملط کر کے ایک وحدانی شکل دی جائے، تا آنکہ ترکیب سے پہلے کی کثرت وحدت

میں ڈھل جائے۔ وحدانی کیفیت ترکیب کی روح ہے۔

اس معیار کو سامنے رکھنے کے بعد آخری دو قسموں کے بارے میں بے جھجک کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو کے مرکب افعال میں شامل نہیں۔ پہلی قسم کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا بھی ہے کہ اس میں اور مرکب فعل میں فرق کرنا چاہیے۔

ان افعال میں ترکیبی روح نظر نہیں آتی۔ ان میں کا ہر فعل دوسرے سے بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی رشتہ ان میں نہیں کہ انھیں برابر ایک دوسرے کے پہلو میں بٹھا دیا گیا ہے۔ اگر وحدانی کیفیت ان میں ہوتی تو پہلی صورت میں ''کر'' لگا کر اور دوسری صورت میں دونوں فعلوں میں ''نا'' بڑھا کر ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی چار قسموں میں سے صرف پہلی قسم میں ترکیبی کیفیت پائی جاتی ہے۔ صرف پہلی قسم کے افعال اس قابل ہیں کہ انھیں اردو کے مرکب افعال کی فہرست میں جگہ دی جائے۔ ان افعال میں صوری (Morphological) وحدت بھی ہے اور معنوی (sementical) وحدت بھی۔ ''سر اُٹھانا''، قسم کھانا، وغیرہ افعال ایک مکمل اکائی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں کسی نوع کا ردو بدل یا نسخ و فسخ روا نہیں رکھا جاتا۔ اور ساتھ ہی وہ ایک معنی بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ افعال بسیط افعال کے قائم مقام ہیں۔ انھیں وضع کر کے اردو نے بسیط افعال کی کمی پوری کی ہے۔

ان کے علاوہ جو افعال مذکور ہوئے اُن میں سے دوسری قسم کے افعال میں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ صوری اکائی ہونے کے باوجود کور کسر نظر آتی ہے کہ ان میں معنوی وحدت نہیں۔ فعل میں ایک نیا مفہوم پیدا کرنے کے لیے اُس کے ساتھ ایک امدادی فعل لاحق کر دیا گیا ہے۔ ان میں کا ہر فعل اپنے معنوں پر دلالت کرتا ہے یا یوں کہیے کہ تابع نے متبوع کے ساتھ مل کر اس کے معنوں میں ردّ و بدل کر دیا ہے۔ تیسری قسم میں صوری وحدت ہے نہ معنوی وحدت۔ ان افعال کو کسی قاعدے سے بھی اردو کے مرکب افعال میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ہر فعل مستقل، آزاد اور دوسرے سے بے نیاز ہے۔ اگر ان میں ترکیبی کیفیت ہوتی تو ان سے مصادر وضع کیے جاسکتے جس طرح عام افعال سے وضع کیے جاتے ہیں۔

فعل بسیط ہو یا مرکب کسی نہ کسی مادے سے وضع ہوگا اور یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ مادے

تین طرح کے ہیں۔1۔اسمی (جس میں صفت بھی شامل ہے)2۔فعلی،3۔حکائی۔اردو کے ہر مادے کو جو فعل کی طرح مستعمل ہے گردانا جاسکتا ہے اس لیے اصولاً وہ تمام افعال جو اصلی بسیط مادوں کی کمی پوری کرنے کے لیے کسی ایک کلمے سے ڈھلے یا ایک سے زیادہ کلموں کو جوڑ کر ڈھالنے کے لیے عام افعال کی طرح ہر شکل میں ملنے چاہئیں جو عموماً زبان کے فعلی سرمائے میں ہوا کرتی ہیں تا کہ ان کے وضع کرنے کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو سکے۔اس کے برخلاف جہاں دو فعلوں کو کسی خاص صرفی یا قواعدی ضرورت کے تحت کوئی نیا مفہوم پیدا کرنے کے لیے جوڑا گیا ہے۔وہاں یہ جوڑ جاڑ یا تال میل اس ضرورت تک محدود رہے گا۔اس سے آگے صرفی تغیرات نہ ہوسکیں گے۔اردو میں معروف سے مجہول بنانے کے لیے ''جانا'' اور اس کے صیغوں سے مدد لی جاتی ہے۔استمرار کے لیے ''رہنا'' اور اس کے صیغوں سے ماضی قریب ''ہے'' نکالنے سے بنتی ہے۔بعید ''تھا'' نکالنے سے۔حسب قاعدہ تمام تصرفات ان گردانوں اور صیغوں تک محدود رہے۔اس کی گنجائش نہ نکلی کہ ان مخصوص صیغوں کے علاوہ یہ کسی اور صورت میں نظر آئیں۔ان سے بنیادی فعل وضع ہوں اور ان کے حسب قاعدہ مصادر ڈھالے جائیں۔حسب قاعدہ سے مراد یہ ہے کہ ''جانا'' اور ''رہنا'' سے مصدر مجہول یا استمراری بن سکتا ہے،لیکن اس میں اصل فعل مادے کی جگہ جیسا کہ قاعدے کے مطابق ہونا چاہیے۔ماضی یا فعل حال کی شکل میں ہوگا۔جیسے پڑھا جانا کیے جانا کرتے رہنا پڑھتے رہنا وغیرہ۔

اس سے چوتھی قسم کے افعال کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ انھیں کس لیے مرکب افعال میں شمار نہیں کیا گیا۔اس کے مصادر تمام تر بدلی ہوئی تعریفی شکل میں ہیں۔اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ افعال صرفی یا قواعدی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ان میں ایک سے زیادہ وہ افعال کی ہم آغوشی ایک خاص قواعدی مقصد یعنی زمانہ اور حالت وغیرہ کے اظہار کے لیے ہے۔اس مقصد کے لیے فعل میں جو تغیر ہوا وہ بہر حال اور بہر صورت میں برقرار رہنا چاہیے۔اس میں تبدیلی مقصد کے منافی ہوگی۔کیوں؟ اس لیے کہ اصل فعل میں تصرف کے بعد ہی نئے صرفی معنی حاصل ہوئے تھے۔مصدر میں وہ تصرف قائم نہ رکھا گیا تو اس سے وہ معنی حاصل نہ ہوں گے۔جس کے لیے تصرف روا رکھا گیا تھا۔

پہلی قسم کے افعال جنھیں میں نے مرکب افعال قرار دیا۔ دو گروہوں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ وہ افعال جو اپنے اجزا سے مختلف بالکل نئے معنی ادا کرتے ہیں یا کم سے کم ان کے آخری جزو کے معنی بدل گئے اور وہ نہیں رہے جو ترکیب سے پہلے تھے۔ اصطلاح میں یہ محاورہ کہلائیں گے۔ آنکھیں دکھانا (بے وفائی کرنا) سر اٹھانا (یا بغاوت کرنا) نام دھرنا (عیب لگانا) محاورے ہیں۔ یہ اپنے ترکیبی اجزا سے مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح قسم کھانا، نقشہ اتارنا، ڈینگ مارنا محاورے ہوں گے۔ ان کے آخری جزو یعنی کھانا، اتارنا، مارنا وغیرہ افعال کے معنی ان ترکیبوں میں وہ نہیں رہے۔ جو ترکیب سے پہلے تھے۔ باقی تمام افعال سیدھے سادے مرکبات ہیں۔ انھیں مرکب افعال کہا جائے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے مرکب افعال کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ افعال آتے ہیں جنھیں میں نے مرکب افعال قرار دیا۔ دوسری قسم اصل اور امدادی فعلوں کے مرکبات کی ہے۔[1]

میری تقسیم کے لحاظ سے دوسری اور چوتھی قسم کے افعال ان میں شامل ہوں گے۔ میں مولوی صاحب کی تقسیم میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔ ان افعال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تمام افعال کی طرح اردو میں ان کے مصادر مستعمل ہیں جو لغات میں افعال کی جگہ ان کے قائم مقام کی حیثیت سے درج کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں معنوی نہ سہی کم سے کم صوری وحدت موجود ہے۔ اور حسب قاعدہ، زمانہ، حالت اور کیفیت کے لحاظ سے انھیں گردانا بھی جا سکتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات بنیادی افعال کی ہیں۔ میرے نزدیک ترکیب افعال کو جانچنے اور پرکھنے کے حسب ذیل دو معیار ہیں۔

1۔ ان افعال کے مصادر مستعمل ہوں۔

2۔ یہ مصادر زیادہ سے زیادہ دو فعلوں پر مشتمل ہوں۔ ''جاتا ہے۔ جا رہا ہوگا۔ سمجھا دیا تھا۔'' وغیرہ صیغوں اور گردانوں کو جیسا کہ میں نے عرض کیا مرکب افعال میں جگہ نہ دی جا سکے گی

1۔ ''قواعد اردو'' ص 150

کہ ان کے مصادر اردو میں مستعمل نہیں۔ کود ے سکنا۔ پڑھ چکنا'' وغیرہ مرکب مصادر جو تین فعلوں پر مشتمل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں کثرت سے دیکھے گئے ہیں۔ یہ اردو روزمرّہ اور یہ محاورے کے خلاف اور زبان کی روح کے منافی ہیں۔[2]

---

[2] اردو کا مرکب مصدر زیادہ سے زیادہ دو فعلوں (اصلی + امدادی) کی ترکیب سے بن سکتا ہے

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے۔ اس لیے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس طرف ابھی تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے واقعات کو کتنا ہی اُلٹ پلٹ ڈالیں۔ مگر زبان اور اُس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے دیانت دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لیے تیار رکھتا ہے۔ جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لیے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا۔

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو۔ پھر بھی اس کی ملکیت میں

ایسے لفظوں کی کمی نہیں، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سُنانے کے لیے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں۔ جن کو کاغذی تاریخ کے اوراق بُھلا چکے ہیں۔

ہم اپنی زبان کے اِس قیمتی سرمایے کا آغاز سکّوں سے کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لیے فالِ نیک بن سکے۔

''دام'' ۔۔۔ ہماری زبان کا ایک پامال لفظ ''دام'' ہے۔ ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکّے کے ہیں۔ جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں ''چھدام'' کی ہے۔ جو 'چھ' اور 'دام' دو لفظوں سے بنا ہے۔ اس لفظ کی تاریخ کے لیے آج سے دو ہزار برس پہلے ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے۔ مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے۔ ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکّے چلتے تھے اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے۔

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکّے کا نام درخم ہندی (Drachma) تھا۔ اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ میں سے ایک حرف گرا کر درم کی صورت اختیار کی اور ہندوستان میں ایک حرف اور گر کر اور اُس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر ''دام'' ہو گیا۔ یہ لفظ جس طرح سکّے کو بتاتا تھا۔ سکّے کے وزن کو بھی بتاتا تھا۔ چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن ''درہم'' اور فارسی طب میں ''درم'' سے بتایا جاتا ہے۔ اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو 'ڈرام' ہو گیا، جو اب ہمارے انگریزی طبّی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانے کی حیثیت سے وارد ہے۔ اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ 'دام' اور 'ڈرم' دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے۔ صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں 'دام' چاندی کے سب سے چھوٹے سکّے کے بجائے تانبے کے سب سے چھوٹے سکّے کا نام تھا (صفحہ 18 نولکشوری) [1] اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے، اور اب بھی کہتے ہیں۔ یہ روپے کا چالیسواں حصہ تھا۔ پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصے کو جیتل کہتے تھے۔ اب اس کو گنڈہ کہتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ (ص 12)۔

---

[1] آئینِ اکبری جلد اول۔ [2] لسان العرب ملفظ قرط ج 9

ہندی

اسی تقسیم سے ایک محاورہ یورپ کی زبان میں اور چلا ہے۔ ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت 16 آنے فرض کی جاتی ہے۔اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں۔ایک دام کا آدھاحصہ ادھیلا اور پاؤ، پاؤلہ اور 1/8 ڈمری کہلاتا ہے۔اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے۔

اِس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنے میں ہم بولتے ہیں وہ اسی سکہ کی یادگار ہے۔جس سے پہلے چیزوں کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔

آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس دام (پیسے) تیار ہوتے تھے۔(فیروز شاہی ضیا برنی،ص319)

تغلقوں کے زمانے میں ''درم سنگ'' خرید و فروخت کی تول میں باٹ کے معنی میں بولا جاتا تھا۔

''کیرانت'' ۔۔۔۔اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں 16 آنے کی تقسیم آنوں پر اور آنوں کی پائیوں پر اور اس کے بعد کیرانت اور جو پر ہوتی ہے۔لفظی بہر دیپوں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہوسکتی کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے۔ایک عربی دینار میں 20 یا 24 قیراط ہوتے تھے۔عربی میں قیراط یونانی زبان سے آیا ہے۔آج کل انگریزی میں یہی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیوروں اور چیزوں میں اتنے کیرٹ گولڈ کی اصطلاح کا عام رواج ہے۔

''اشرفی'' ۔۔۔۔درم اور قیراط جس طرح سے باہر سے آئے ہوئے نام ہیں۔اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکّے اشرفی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے۔مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی اور پتہ نہ چلنے پر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکّوں میں اشرف ہے۔اس لیے اشرفی کہلایا۔مگر دفعتہً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ سکہ اشرف نہ تھا۔بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے۔وہ اشرف تھا۔

طلائی سکے کے لیے سب سے پُرانا نام دینار ہے اور یہ بھی یونانی۔[1] ہے۔مگر چونکہ

---

[1] جورجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے۔تاریخ تمدن اسلامی،ص119 ج1،2 مقدمہ ابن خلدون ص218

عربوں میں یہ سکہ جاری تھا۔ اس لیے انھوں نے عبدالملک کے زمانے میں 74ھ یا سنہ 75ھ میں جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام بھی دینار ہی رہنے دیا۔ جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی ان کے ساتھ آیا اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ راج الوقت کے ساتھ چند ''دینار سرخ''، رسمی طور سے جاری ہے۔

تغلق کے زمانے میں ہم کو ''اشرفی'' کے لیے دو لفظ ملتے ہیں۔ ایک ''تنکۂ زر'' یہ تنکہ سکّے کے معنے میں عام طور سے بولا جاتا تھا (برنی ص314 و315) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی۔ پیادے کی ماہانہ تنخواہ 24 تنکہ اور سوار کی 78 تنکہ تھی (برنی ص319) مخدوم زادۂ بغداد کے لیے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا۔ (برنی ص496) مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی بار پڑھا گیا ہے تو چندین طبقہا پُر از تنکۂ زر و نقرہ بر آن نثار شد (برنی ص492)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لیے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا۔ خلجی کے زمانے میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا۔ (فرشتہ ص114)

رُوپے کو تنکہ نقرہ اور اس سے کم درجے سکّے کو صرف تنکہ کہتے تھے۔ یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پُرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین ہندی میں بولا جاتا ہے (دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف) خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج ''ٹکے'' کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟

دوسرا لفظ ''مہر زر'' ہے۔ اس کو مہر اس لیے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نام نقش ہوتا تھا۔ مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے۔

سلطان محمد مہر مس پیدا آورد و فرمان داد کہ مہر مس را خرید و فروخت چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری است۔''

یہی مہر زر اکبر کے زمانے میں بھی زبان وقلم پر تھا۔ آئین اکبری میں اکبری سکّوں کے بیان میں بھی یہ لفظ ملتا ہے (ص ۱۷) اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لیے سہنسہ، رہس، آتمہ،

چنگل، لعل جلالی، آفتابی وغیرہ الفاظ بنائے اور چلائے مگر مہر کا نقش بھی مٹا نہیں بلکہ پُرانی شاہی اشرفی کو آج بھی مہر کہتے ہیں۔

دکن میں طلائی سکّے کا نام ''ہون'' جو آخر میں مخفف ہوکر ''ہُن'' ہوگیا اور آج ہماری زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنے میں ''ہن برسنا'' ایک یادگار رہ گیا ہے۔ روپے کا لفظ اور سکّہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے (آئین اکبری ص 18) اور عجب نہیں کہ یہ روپا سے بنا ہو۔ سونے کے سکّے کے لیے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانے میں استعمال میں آیا ہے چنانچہ فرشتہ نے حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگزشت کے بیان میں لکھا ہے کہ:۔

''زنجیر اور گردن ظرِ ہندی سے مملواز اشرفی علائی و طلائی غیر مسکوک دید۔''

(فرشتہ نولکشوری، ص 274)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ 1015ھ سے 1023ھ تک ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات ودکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ہندوستان وارد ہوئی ہے۔

یہ عجب بات ہے کہ سونے کے سکّے کے لیے افریقہ کے طلا خیز اور زرریز زمین ہی سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی ہے۔ انگریزی گنی کا مولد افریقہ کا ملک گانا یا گینی قرار پایا ہے۔ جس کو عرب خانہ کہتے تھے اور بلادالتبر (سونے کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے اور وہیں سے سونا لاتے تھے۔ وہم پہنچتا ہے کہ غانا کا تعلق عربی کے غنی اور غنا سے تو نہیں؟ بہر حال ہماری اشرفی کا مولد ومنشا بھی ہندوستان نہیں بلکہ ایشیا بھی نہیں۔ افریقہ ہی کا ایک گوشہ ہے مگر دوسری طرف کا یعنی مصر۔

مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک برسبائی تھا۔ 825ھ سے 841ھ تک حکومت کی ہے۔ اس کا لقب الملک الاشرف تھا۔ یہی اشرف اشرفی کا مصدر ومعدن ہے۔ مشہور عرب جہاز ران ابن ماجد اسد البحر نے جس نے 904ھ 1498 میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا۔ الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہاز رانی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جو چند سال

ہوئے فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا۔ یہ بحر ہند اور بحر عرب کا نڈر جہاز راں تھا۔ گجراتی ہندو بیوپاریوں کی طرف سے اس کو کنکا کا سنسکرت خطاب ملا تھا جس کے معنی ماہر ریاضی داں کے ہیں (دیکھو میری کتاب عربوں کی جہاز رانی ص130 اور 137) اس کی اسی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا۔ ابن ماجد ایک خاص سلسلے میں لکھتا ہے" والحادی عشر برشھی الاشرف ضارب سکتہ الاشرفی" (ص 40 طبع پیرس) (گیارھواں بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی سکے کا چلانے والا ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب 895ھ میں لکھی ہے اور اس سکے کے بانی کا ذکر کیا ہے اور فرشتہ نے اپنی اصلی کتاب اس کے بیس برس کے بعد 915ھ میں لکھی اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی حالانکہ خلجی کے زمانے میں اشرفی کا نام بھی نہیں پیدا ہوا تھا مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پُرانے زمانے کے بادشاہوں کے سونے کے سکوں کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں۔

"بیمہ"۔۔۔رُوپے اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ، ڈاک بھیجتے ہیں جن کو ہم آپ بیمہ کہتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ہے اور جہاں سے یہ نئے طریقے آئے ہیں وہیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے۔ مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گزرا جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے۔ 1107ھ میں عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ہے۔

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں کے مہاجنوں کے ذریعے ترسیل زر کا حال لکھتا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

> "لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی کتنا ہی نا آشنا اور انجان ہو، گواہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں روپے امانت صرافوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ہیں کہ جب ان سے امانت واپس مانگیے بلا حیلہ حوالہ کیے

بے توقف واپس کر دیتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز
راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تو وہ
ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ دیانت دار صراف ان روپوں کو اپنی
تحویل میں لے کر ہنڈی میں اپنے کارندوں کے نام جو شہر میں ان
کی طرف سے سچائی کی دوکان کھولے رہتے ہیں۔ ایک پرچہ لکھ کر
دیتے ہیں۔ اس کو یہاں کی زبان میں ہنڈی کہتے ہیں۔ یہ
کارندے اگر چہ سیکڑوں میل کی مسافت پر ہوں اس پرچے کو
دیکھنے کے ساتھ بلا حجت اس کو روپیہ دے دیتے ہیں۔ اس سے
بڑھ کر یہ ہے کہ اس پرچے کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ
نہیں ہے اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بیچنا
چاہے تو اتنے ہی روپے اس کو فوراً مل جائیں گے۔ صرف یہ ہوگا
کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتع) اس سے لے لے گا۔"

اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے:۔

"عجیب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق هائلہ اقمشہ وامتعہ و دیگر
اموال آنہا بجنس در قرار گاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عاید ی
نمایند و آن را بزبان بان این مردم بیما گویند۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ پرانے ہندوستان میں منی آرڈر بھیجنے، بینک چیک استعمال کرنے اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا اور اس لفظ بیمہ کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا۔

"بزبان این مردم بیما گویند" سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا۔ مگر میں نے ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتہ بتا نہ سکا۔ اس سے وہم ہو جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ "بیم" بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو۔ سجان رائے نے اس بیان کا آغاز بھی ان لفظوں سے کیا ہے:

''وطرفہ آنکہ اگر بنا بر خوف مسالک ممالک شخصی مبلغہای نقد

بمسافت دور ونزدیک نتواند برد۔''

اس لفظ ''خوف'' سے بھی ادھر ہی خیال جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی کتابوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نول کشور صاحب کے نام سے لکھا ہے اور نول کشور پریس میں 1900 میں چھپا ہے۔ مؤلف نے مقدمے میں یقین دلایا ہے کہ تمام لغات دیکھ کر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ہے اس میں ''بیا'' کے لفظ کے نیچے اس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ہے:

''بخوف رہزنی جو کسی ساہوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے

کا دیں اور وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔''

لغاتِ کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمہ کے فارسی ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

ڈاک۔۔۔ بیمہ کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک، ڈاک خانہ اور ڈاک گھر کی طرف چلا گیا ہوگا۔ موقع ہے کہ آپ کے اس حسنِ التفات سے ہم فائدہ اُٹھائیں۔ تعجب ہوگا کہ اس ڈاک کا ہمارے لغت میں پتہ نہیں۔

عربی میں ڈاک کے لیے برید کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں امیر معاویہ نے سب سے پہلے اِس نظام کو قائم کیا اور برید اس کا نام پڑا۔ ہمارے عجمی اہلِ لغت نے اس کو فارسی بریدن سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک کے لیے دُم بریدہ یعنی دُم کٹے گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے اس لیے ڈاک کو برید کہنے لگے۔ حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ہوتا تو زبر کے بجائے ب کو پیش ہونا چاہیے تھا۔ اب نئی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی اور لاطینی سے عربی میں آیا ہے اور بریداس کی اصل ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ پہلے یہی لفظ آیا۔ پھر ترکی لفظ اولاغ چلا (برنی 446 کلکتہ) مگر فوراً ہی اس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا اور وہ لفظ دھاوا ہے۔ چنانچہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ ابن بطوطہ نے

سفر نامہ میں بعینہ یہی لفظ لکھا ہے۔ (2 ص 1 مصر) برنی نے فیروز شاہی میں اسی لفظ کا استعمال کیا ہے (ص 446 کلکتہ)

مگر اس کو دھاوا کیوں کہتے تھے؟ اس کا پتہ ہم کو اپنوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنی اہلِ ہند میں تہائی میل کے ہیں۔ چونکہ یہ ہرکارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے۔ اس لیے اس کو دھاوا کہتے تھے اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے۔

لیکن غریب نا آشنائے زبان کو اس میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دھاوا کے معنی سنسکرت میں دوڑنے کے ہیں۔ چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لیے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر وہ دھاوا ہو گئے اور ہر تہائی میل پر جہاں وہ ٹھہرتے تھے وہ دھاوا ہو گیا۔ دھاوے کے ان پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پر دلی سے لے کر دولت آباد تک بنی ہوئی تھی۔ پیادے گھنگھر دار لاٹھی کو کندھے پر رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے پر پہنچتا تھا۔ وہاں دوسرا پیادہ گھنگھرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑتا تھا۔ اس طرح سندھ سے دلی 5 دن میں ڈاک پہنچتی تھی۔ (ابن بطوطہ)

اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا، آج بھی موجود ہے۔ اور دھاوے کے پیادے کو پائک کہتے تھے جو پیک کی صورت میں محرم کی تقریب میں امام کے نقلی قاصدوں کا ہم نے نام رکھا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آلِ تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں جب بدایونی نے اس لفظ کا استعمال کیا تو اس کے ترجمے کی ضرورت ہوئی۔ سلطان محمد تغلق کے حال میں کہتا ہے۔ ''در 222ھ سلطان تغلق عزیمت، دیوگر کردہ از دہلی تا آنجا برسر کردہ دھادہ یعنی پایکان خبر داور نشاندہ، فرشتہ نے جہانگیر کے زمانے میں اپنی کتاب لکھی تو ''دھادہ'' کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا۔ مگر کہتا ہے کہ اس کو پہلے یام (ی ام) کہتے تھے۔ سلطان علاءالدین کے حال میں لکھتا ہے کہ ''از دہلی تا آنجا'' ڈاک چوکی'' کہ بزمان سلف یام می گفتند۔ ی۔ نشاندہ'' یہ یام فارسی استعمال میں

ہے۔ دکن میں مدراس سے لے کر پونہ تک اس کے لیے ٹپہ، ٹپال اور ٹپہ خانہ بولا جاتا ہے۔ حیدرآباد کا سرکاری لفظ بھی ہے۔

بہرحال ڈاک کا لفظ جہانگیر کے عہد میں یا اس سے کچھ پہلے بولا جانے لگا۔ اس کی اصلیت پر میں غور کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے معنی منزل کے ہوں گے۔ چونکہ یہ منزل بہ منزل جاتے تھے۔ اس لیے اس کو ڈاک کہنے لگے اور اس کے پڑاؤ کو ڈاک چوکی۔ چوکی بمعنی پہرا جس کی ایک یادگار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لیے انگریزوں نے اسی اصول پر بنگال سے الہ آباد تک اپنے منزل بہ منزل سفروں کے لیے جو مختصر قیام گاہیں بنائیں ان کو ڈاک بنگلہ کہا اور اب بھی وہ بھی کہے جاتے ہیں اور اگر لغت گھڑنے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہوں کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈکہ اور بنگال کی حد پر ڈھاکہ اور دوسری طرف موتی ہاری میں نیپال کے پاس دوسرا ڈھاکہ اسی منزل گاہ کے باقی نشان ہیں۔ بہرحال منزل نے راستے کی اور راستے نے خط، لفافہ اور اشیائے ڈاک کی صورت اختیار کی۔ اور اب وہ ریل گاڑی جو بہت کم منزل کرتی ہے مگر ڈاک لے کر چلتی ہے ڈاک گاڑی کہلاتی ہے۔ ڈاک کے پچھلے معنی کی یادگار ڈاک بٹھانا۔ ڈاک لگانا یعنی جلدی جلدی منزل بہ منزل یا ہاتھوں ہاتھ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا رہ گیا ہے۔

فیض ساقی نے میرے ڈاک لگا رکھی ہے (راسخ)

روح ہے ہر جسم میں مشتاقِ اخبارِ اجل

اس لیے یہ آمد و رفت نفس کی ڈاک ہے ناسخ

اسی لیے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ہے۔ یعنی نیلام میں منزل بہ منزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا۔ کچھ دن ہوئے ایک قلمی ہندوستانی فارسی لغت برادرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (اسمٰعیل کالج بمبئی) کے یہ لغت کسی ایرانی یا پارسی نے لکھا ہے۔ تالیف کا سنہ نہیں معلوم، اس میں ایک لفظ ڈانکیہ دیکھا جس کے معنی نقیب کے لکھے ہیں، نقیب شاہی درباروں میں درباریوں کو با ادب رہنے کے لیے زور سے آواز لگایا کرتے تھے۔ ڈانکنا کے معنی زور سے آواز لگانے کے ہیں۔ اس سے دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ ڈاک کی اصل ڈانک اور ڈاکیہ کی ڈانکیہ ہے۔ چونکہ ڈاک کا

چوبدارا آواز دیتا ہوا چلتا تھا۔اس لیے اس کو ڈانکیہ اور اس کے کام کو ڈانک کہا گیا،اور ڈانک نے ڈاک کی صورت بدل کر منزل بہ منزل رفتار کے معنی اختیار کر لیے۔

اگلے زمانے میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے بھی ڈاک کے کبوتر اُڑا دیے تھے۔اس نسبت سے ایک اُڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سُن لیجیے۔

''قمری''۔۔۔ہماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے۔یہ نام عربی اور فارسی سے آیا ہے۔مگر اس کی اصلیت کے بتانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں۔فارسی کے خالص لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں۔موید الفضلا میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پُرانا لغت ہے۔یہ لفظ ملتا ہے۔اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں۔پھر اس سے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے اور قمری اور فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور اس کی آواز یکی تو یا کوکو کی ہوتی ہے۔گلے میں طوق ہوتا ہے۔اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک سفید کا فوری اور دوسری صندلی اور اس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ہے۔

تاج کے مشہور نام سے تو جوہری کی تاج اللغتہ کی طرف خیال جاتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ جوہری نے قمری کا ذکر کیا ہے۔مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں۔بہر حال یہ فارسی نہیں۔عربی بھی نہیں۔کیونکہ اوّل تو عرب اس سے واقف نہ تھے۔ان کے شعروں میں اس کا ذکر نہیں۔قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں۔اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں۔اس کے اخیر میں جو یائے مشدّد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔اور اسی نسبت کی طرف اکثر اہل لغت گئے ہیں۔جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ قمر سے مشتق ہے۔جس کے معنے سپیدی کے ہیں اور اس سے صفت بنی اقمر بمعنی سپید۔اس اقمر کی جمع ہوئی قمر۔جیسے احمر سے حمر اور اب یہ ہوا کہ سپید پرندوں کو جمع کے ساتھ یوں بولے ''طیر قمر'' اب اس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یائے نسبت لے کر قمری کو واحد بنالیا ہے۔جیسے روم سے رومی۔زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی) مگر اس تحقیق میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے۔عربی میں اس نسبت سے کسی اور پرندے کا نام نہیں رکھا گیا۔

مجد فیروز آبادی نے قاموس میں قمریا لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے۔ مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زمخشری سے لیا ہے۔ بعضوں کا دعویٰ ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے۔ اس کی جمع قمر ابو عامر نام کے ایک جاہلی عرب شاعر کے کلام میں ہے۔

ما قر قر قمر بالواد الشاہق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہیں۔

قمری کے آخر میں جو ی، ہے اس کو کوئی صاحب یائے مبالغہ سمجھتے ہیں مگر اکثروں کی رائے یہی ہے کہ یائے نسبت ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرف نسبت ہے تو بعض لوگ اس کو اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاد نے شرح کفایہ میں اس کی تحقیق کی ہے۔

اب اہلِ لغت کے دربار سے اُٹھ کر ہم آوارہ گرد جغرافیہ نویسوں کے مسافر خانوں میں پہنچتے ہیں۔ یاقوت روی ''معجم البلدان'' میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ہے اور ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے۔ مقریزی خططِ مصر میں دریائے نیل کے منبع کی تلاش میں نکلتا ہے اور بحرِ ہند کے جزیروں کو دیکھتا بھالتا چلتا ہے اور اسی اثناء میں جزیرۂ قمر کا ذکر کرتا ہے اور اس کا دوسرا نام جزیرۂ ملای بتاتا ہے جس کو آج ہم ملایا کہتے ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک جزیرے کا نام قمریا بتایا ہے۔ اور اس کے بعد کہتا ہے:

والیھا ینسب الطائر القمری (ص 81 مصر) (اور اسی جزیرے کی طرف قمری پرندہ منسوب ہے + البیرونی نے کتاب الہند میں ملایا کے کچھ جزیروں کا نام قُمیر بتایا ہے۔ (ص 103)

پرندوں کے نام ان مقاموں کی نسبت سے رکھنا۔ جہاں پہلے پہل وہ پرندے کسی خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہوں، عام بات ہے۔ لڑکی، چینی، شیرازی، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا استانے کے لیے غالبؔ کے اِس شعر کا مطلب حل کیجیے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

فارسی شاعروں نے گل و بلبل کی طرح سرو وقمری میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے۔

قمریاں پاسِ غلط کردۂ خود ی دار ند
ورنہ یک سروایں باغ بہ اندام تو نیست

ایک اور یائے نسبت حل طلب ہے۔

''سوسی''۔۔۔سوسی ہمارے ملک میں رنگین باریک دھاریوں کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے جس کو سوسی کہتے ہیں۔ اسلامی زمانے کے اکثر بنے ہوئے کپڑوں کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام یا اس امیر یا بادشاہ کے نام یا اس کام کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ جو اس کپڑے میں خاص طور سے کیا جاتا تھا۔ جیسے ''تافتہ''''بافتہ''''زری''''کارچوبی'' وغیرہ یا مظفری، محمودی، علی قلی خانی وغیرہ یا کاشانی، بنارسی، بھاگلپوری وغیرہ۔ انگریزی میں ململ کو جو مسلین کہتے ہیں وہ موصل کی طرف نسبت ہے۔ سوسی نہ تو شخص کا نام ہے نہ ہندوستان کے کسی مقام کا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی نسبت سوس کی طرف ہے سوس کے نام سے ایک شہر ترکستان میں اور دوسرا مغرب اقصٰی یعنی ملک مراکش میں ہے۔ مگر یہ دونوں مقام پارچہ بافی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ لیکن ہے یہ واقعی شمالی افریقہ کے ایک صنعتی مقام کا نام۔ اس کا نام سوسہ ہے۔ یہ عربوں کی ترقی کے عہد میں پارچہ بافی کا ایک بڑا مرکز تھا اور یہاں کے بنے ہوئے کپڑے کو سوسی کہتے تھے۔ پھر اس نمونے پر جہاں جہاں کپڑے بُنے جانے لگے ان کو سوسی ہی کہنے لگے۔ یہ گویا ایک طرز کا نام ہو گیا۔ یہ کپڑے کبھی اس شان سے بنے جاتے تھے کہ ان کے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی۔ جغرافی ڈکشنری معجم البلدان کا مصنف یاقوت حمری رومی جس نے 626ھ میں وفات پائی۔ سوسہ کے ذکر میں لکھتا ہے (لفظ سوسہ) ''صحیح یہ ہے کہ سوسہ ایک چھوٹا سا شہر افریقہ کے اطراف میں ہے۔ یہاں کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہیں۔ یہ بیش قیمت (یا باریک)

سوتی کپڑے بنتے ہیں اور جو کپڑا دوسری جگہوں پر ویسا بنا جاتا ہے وہ انھیں کی نقل ہے (یا انھیں کے مشابہ ہے) ان میں سے ایک تھان کی قیمت وہاں دس دینار ہے اور جو دھاگا وہاں کتتا ہے اس کے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے۔

لیکن ہماری ہندوستانی سوسی بہت سستی ہے اور غریبوں کی ستر پوش ہے۔ اکثر غریب عورتوں کے پاجاموں میں کام آتی ہے۔ چیز وہ نہیں رہی، طرز وہی ہے۔ وہ ریشمی ہوگی۔ یہ سوتی ہے۔

ایک مجہول یائے نسبت ہمارے خوش ذائقہ کھانے میں بھی ہے۔

''فیرنی''۔۔۔ یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے۔ جس کے مزے سے ہم سب واقف ہیں۔ لیکن اس کی لفظی اصلیت سے ہم سب ناواقف ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ فرنی اصل میں قرنی (بالضم) ہے۔ چوتھی صدی کا مصنف خوارزمی جو غزنویوں کا معاصر تھا۔ اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں بیماروں کی غذاؤں کے سلسلے میں فُرانی نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس غذا کی تیاری کی صورت یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی تنوری پھولی ہوئی (پاؤ روٹی جیسے) روٹی کو دودھ میں بھگو کر شکر ڈال کر تیار کی جاتی ہے (نان بہ شیر) کہیے اس کا واحد فرنی ہے۔ اس کو فرنی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ موٹی روٹی تنور میں جس کو عربی 'فرن' کہتے ہیں۔ تیار ہوتی ہے۔ گویا فرنی کو تنوری کے معنوں میں سمجھیے۔ ہندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی ہوئی روٹی کی بجائے اس میں چاول ڈالنے لگے ہیں اور اب شکر قند ہو سابودانہ ہو جس چیز کو آپ دودھ شکر میں پتلا کر کے بنایئے وہ فیرنی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اتنی ترمیم اور کیجیے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجیے۔

یہی مصنف ہمارے بھارت کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جس سے کھیر کی خوشبو آتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ بھتہ (بہطہ) سندھی لفظ ہے۔ چاول میں دودھ اور گھی ڈال کر بناتے ہیں۔ کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے۔ سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں۔ جس سے ہماری یہ کھیر پکتی ہے اور اسی لیے یہ کھیر کہلاتی ہے۔ بھارت سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے۔ جو میت کے کھانے کو کہتے ہیں۔ کیوں صاحبو! انگریزی ملازموں کا بھتہ اسی بھات سے تو نہیں ہے۔ جس کا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا ہو۔ اور اس کے معنی خرچ، خوراک کے ہوں۔ 1765ء و 1768 میں لارڈ کلایو نے جو اصلاحات کیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو

تنخواہ کے علاوہ بھتہ دیا کرتی تھی۔ کلایو نے اس زمانے میں اس کو بند کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی اس لفظ کا اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے۔

''رقم''۔۔۔اس بھتے سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے۔ کبھی آپ دوسروں کے ذمے اپنی رقم نکالتے ہیں اور کبھی دوسرے آپ کے ذمے۔ مگر کبھی آپ نے یہ سوچا کہ یہ رقم کہاں سے آپ کے ہاتھ آیا۔ آج ہم رقم روپے کی ایک مقدار کو کہتے ہیں۔ رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے۔ مگر اس معنی میں نہ عربی میں مستعمل ہے نہ فارسی میں بلکہ یہ خالص ہندوستانی ہے۔

رقم کے معنی عربی میں نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ الا رقمانی ثوب۔ اس سے لکھنے کے معنی ہوئے۔ جیسے کالرقم علی الماء۔ عربی میں حساب اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لیے رقم کا لفظ پسند کیا گیا۔ اور اس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیے کے لفظ ہیں اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنے میں استعمال ہو چکا تھا۔ اس لیے اسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لیے مناسب معلوم ہوا۔ یہ جمع کے ساتھ اقلام اور ارقام بولے جاتے تھے۔ بیرونی نے کتاب الہند میں خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے (ص 78) اسی سے اعداد کے علامات خصوصاً روپے کے اعداد کے علامات کے لیے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے ارقام ہندیہ مستعمل ہوا اور جب حساب کی اصطلاح میں ارقام اور رقم کا لفظ آ گیا تو نقد روپے کے لیے اس کا استعمال پا جانا کتنی بڑی بات تھی۔

''ہندسہ''۔۔۔رقم سے ہندسہ کی طرف خیال گیا۔ چونکہ ارقام 'ہند' سے عربی میں لیے گئے ہیں اس لیے عوام ہندسہ کو زبر کے بجائے زیر دے کر ہندسہ بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ ''ہند'' سے ہے اس لیے ہندسہ ہے اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبر والمقابلہ کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اس وہم میں مبتلا ہے (ص 196۔ ص 197۔ مقدمہ انگریزی 1831) فارسی لغت برہان قاطع کے مصنف بھی اسی غلطی میں گرفتار ہیں۔ کہتے ہیں:

''ہندسہ بکسر اوّل و ثالث و فتح سین بے نقطہ بمعنی اندازۂ و شکل باشد۔ و ارقامی را نیز گویند کہ در زیر حروف کلمات نویسند۔ بچو، ابجد، ہوز، حطی۔''

یہ بیان تمام تر غلط در غلط ہے۔ ہندسہ بفتح اول وثالث ورابع بروزن فعللۃ فارسی لفظ ''اندازہ'' کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے۔ معنی اندازہ کرنا اور اس سے مراد عمارت کا ناپنا اور نقشہ بنانا یعنی فنِ تعمیر ہے۔ جس کو آج انجینیرنگ کہتے ہیں۔ بعضوں نے اس کو فارسی اندیشہ کا معرّب بتایا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ خوارزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم میں لکھتا ہے۔

> ''امام اہندستہ فکلمۃ فارسیہ معربہ وفی الفارسیۃ اندازہ ای القادیر
> قال الخلیل المھندس الذی یقدر مجاری، فنی صواضعبا حیث تحفر وہی
> مشقۃ من الہندۃ وہی فارسیۃ فصیرت الزائی سینالانہ لیس بعد
> الدال زای فی الکلام العرب (ص 2.2 لیڈن)۔ لیکن ہندسہ تو
> یہ فارسی لفظ کا معرّب ہے۔ فارسی میں اندازہ ہے۔ یعنی مقار
> خلیل نے کہا ہے کہ مہندس وہ ہے جو نہروں کے نکالنے کا اندازہ و
> پیائش کرتا ہے تاکہ نہریں کھودی جائیں اور ہندزہ سے بنا ہے اور
> فارسی ہے تو زکی جگہ س نے لے لی۔ کیونکہ عربی میں ذ کے بعد
> ز نہیں ہے۔''

''ریاضیات''۔۔۔ ہندسے سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی۔ عربی میں روض کے دو معنی ہیں۔ زمین کی سرسبزی وشادابی، اُس نے باغ وبہار کا مفہوم پیدا کیا اور ریاض جنت کے پھول کھلائے۔ دوسرا مفہوم سواری کے جانوروں اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے، سکھانے اور پھیرنے کا ہے۔ عربی فعالۃ کا وزن پیشہ، فن اور صنعت کے کام آتا ہے۔ اس سے ریاضت بن کر گھوڑا پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا۔ گھوڑے کو پھیر کر سیدھا اور شائستہ بنانے سے صوفیا نے نفس کو رام کر کے شائستہ بنایا اور ریاضت روحانی اس کا نام رکھا۔ ادھر گوشت پوست اور جوڑ بند کے حسن کے شائقوں نے جسمانی ورزش ومشق کو ریاضتِ جسمانی کہا۔ اہلِ علم کیوں چپ رہتے انھوں نے حساب اور ہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا۔ جاہل اہلِ پیشہ نے کہا ہم کو بھی اپنے کاموں میں محنت کم نہیں پڑتی انھوں نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا۔ لیکن اس معنی میں یہ خالص ہندوستانی ہے۔

عرب حکیموں نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیوں دیا؟ جب کہ ریاضیات کی خصوصیت نہیں ۔ ہر فن مشق کا محتاج ہے ۔ اصلیت یہ ہے کہ ہندیوں کی طرح یونانیوں میں بھی بچوں کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا ۔ اسی لیے جب شروع شروع میں عربی میں یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمات پڑا ۔ کیونکہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا ہے ۔ اب عربی فلسفہ میں اس اصطلاح کا اثر اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اس میں اب بھی ''جسم تعلیمی'' ہے لیکن تعلیمات کی جگہ بہت جلد اس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی ۔ اس لیے کہ بچوں کی مشقی تعلیم اسی سے شروع ہوتی ہے ۔

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں ''جسم تعلیمی'' کے نیچے لکھتے ہیں:

''ویسمی جسما تعلیما از یبحث عنہ فی علوم التعلیمۃ ای الریاضیۃ ۔۔۔ منسوبۃ الی التعلیم والریاضیۃ فانھم کانو ایبتدون بھا فی تعالیمھم وریاضتم لنفوس الصبیان ۔''

''سیاست'' ۔۔۔ ریاضت کے وزن پر سیاست ہے ۔ اور آج کل کیا کہنا ساری دنیا میں اسی کی بہار ہے ۔ مگر معلوم ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے ۔ لغت میں اس کے اصل معنی جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے اور اسی سے امیر کی اپنی جماعت اور بادشاہ کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا ۔ ظالم بادشاہوں کے ظلم نے اس کے معنی بدل دیے ۔ اسی سے '' سیاست کردن' سزا دینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

عوض اللہ اس کا محکمہ میں حشر کے لے گا
کرے گا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر (صبا)

سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اتنا ضروری نہ تھا ۔ مگر مجھے پروفیسر ۔ ٹی ڈبلیو ۔ آرنلڈ (مانسوف علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا ۔ سواء السبیل فی معرفۃ مد والدخیل میں وہ کہتے ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے ۔ چنگیز خان نے اپنی اولاد کے لیے جو چند ملکی قاعدے بنائے تھے ان کا نام ''سہ یاسہ'' تھا ۔ اسی سے عربی میں سیاست آیا ۔ مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے ۔ یہ لفظ عربی میں اتنا پرانا ہے کہ حدیث تک میں موجود ہے ۔ ان الناس کان لیوسھم الانبیاء (صحیح

مسلم) پہلی صدی ہجری کے اخیر میں محمد بن قاسم نے جب سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا تو ایک شاعر نے اس کی مدح میں کہا۔ ساس الرجال سبع عشرۃ حجتہ (اس نے سترہ برس کی عمر میں لوگوں کی سیاست کی) ابن ندیم نے فہرست میں جو 375ھ میں تاتاریوں سے صدیوں پہلے لکھی گئی سیاسیات کا لفظ سیاسی ملکی کتابوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ پھر قدیم کتب لغت میں اس کی اصل موجود ہے۔

ہاں اپنی زبان کے لحاظ سے یہ کہنا رہ گیا کہ ہماری زبان میں سائس اور سیس کا لفظ اسی سیاست سے بنا ہے۔ اس کی اصل سائس ہے۔ مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے۔ نہ عربی ہے اور نہ فارسی مگر شوخی معاف، آپ نے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سیس دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی۔ دونوں نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں۔ سیاسی آج کل جس کو کہتے ہیں ہمارے تازہ دکنی نوجوانوں نے اس کے لیے سیاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے۔ مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے۔ یہ لفظ داوی ہے یائی نہیں۔ دھوکا، سیاست اور سیاسی کی ''ی'' سے ہوا ہے۔ مگر داو کی جگہ یہ ''ی'' قاعدے سے ہے۔ اور سیاس کی واؤ کی جگہ ''ی'' بے قاعدے ہے۔ اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سواس ہوتا سیاس نہیں۔ اب یہ سیاس جب تک چل نہ جائے غلط العام فصیح کی حد میں نہیں آ سکتا۔

بحث ''سیاسیات'' کی خطرناک الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہی ہے۔ اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔

''نے'' کی سرگزشت

''نے'' یوں تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے، اس کی سرگزشت ہی کیا۔ لیکن اِس چھوٹے سے لفظ کی اُردو زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس میں اُردو کی قدامتِ عہد کی داستان پنہاں ہے۔ یہ ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اہلِ نظر کہاں ہیں، آئیں اور میرے دل کو چیریں اور اِس میں اُردو زبان کے بیتے ہوئے دنوں کی داستان پڑھیں۔ میں نے رسالہ ''اردو'' کی کسی گزشتہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا کہ میں اس لفظ کی کہانی قارئین ''اُردو'' کو سناؤں گا کہ اتفاق سے جنوری 1952 کی اشاعت میں ایک صاحب نے جو مری کالج کے استاد ہیں اس کی ایک مختصر سی روداد شائع کرادی۔ اُس نے بقول شخصے ''سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا'' مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اس ہیچ اور بے مقدار لفظ کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ سناؤں اور ساتھ ہی ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کروں جو اس کے متعلق ہمارے اہلِ علم میں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ بے زبان تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اُس کی زبان بن کر اس کی مشکل حل کروں۔

سب سے بڑی شکایت تو اس لفظ کو اپنے بزرگوں اور قدر دانوں سے یہ ہے کہ وہ اسے کل کا بچہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہی صدی دو صدی کی بات ہے کہ یہ نہ معلوم کہاں سے رمتے جوگی کی طرح گھومتا پھرتا اُردو میں آیا۔ اردو نے اس کے لیے

اپنی آغوش کھول دی اور بڑے چاؤ چونچلوں سے پال پوس کر اس کو بڑا کیا۔ اس کے حسب نسب کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کا جنم کہاں ہوا۔ اس نے کس کی چھاتی کا دودھ پیا اور کس طرح اپنی ماں سے بچھڑ کر اردو کی گود میں پہنچا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے اس کو بڑی امیدیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مولانا کو اردو سے کتنا پیار ہے۔ انھوں نے اس کی تربیت میں کیسی کیسی جان فشانیاں کی ہیں۔ اس کو خیال تھا کہ مولانا ضرور اس کو پہچانتے ہوں گے اور اس کے حسب نسب کا صحیح پتہ لگا کر بتائیں گے کہ یہ خاندانی ہے۔ اِس نے اردو کے بڑے گھرانے میں جنم لیا ہے۔ بڑوں بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اردو کے دوسرے الفاظ کے ساتھ پل کر بڑا ہوا ہے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ مولانا نے بھی اسے کل کا چھوکرا سمجھا اور یہ لکھ دیا۔ '' فاعل کی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں '' نے '' کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اور ہندی کی پوربی شاخوں میں اس کا وجود نہیں۔ تلسی داس تک کے کلام میں کہیں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ اس کا استعمال اس طور پر غالبًا اس وقت شروع ہوا جب کہ اردو نے اپنا سکہ جمایا۔'' مولانا کی اس تحریر سے مضمون نگار نے یہ نتیجہ نکالا کہ قدیم اردو میں '' نے '' نہیں تھا۔ دکن کی اردو قدیم اردو ہے۔ وہ تقریبًا آج تک ویسی ہی سیکڑوں سال پرانی چلی آتی ہے۔'' دلی کی زبان میں برابر ارتقا ہوتا رہا۔ اس لیے وہ بدل گئی۔ دکن والوں کو اردو کے اس ارتقا کا علم نہ ہو سکا۔ اس لیے وہ جوں کی توں رہی۔ اور ردو بدل اس میں راہ نہ پا سکا۔ '' نے '' اگر قدیم اردو میں ہوتا تو دکن کے مصنفین اس کو استعمال کرتے اور آج بھی روزانہ بول چال میں اس کا سراغ ملتا۔ لیکن یہ نہ دکن کے شعرا اور نثر نگاروں کے یہاں ہے اور نہ آج کی زبان میں۔ روزانہ کی بول چال میں اکثر اہلِ دکن کو یہ کہتے سنا ہے '' میں کتاب میز پر رکھ دیا ہوں۔'' ایک صاحب ہیں جنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے لسانیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھا ہے۔ '' قدیم ہندی یا اردو ادب میں '' نے '' علامتِ فاعل کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔''

مولانا عبدالحق صاحب سے '' نے '' کو بجا شکایت ہے۔ وہ اردو کے بڑے محقق ہیں۔ زبانوں کے مزاج شناس ہیں۔ لفظوں کی بڑی اچھی پرکھ رکھتے ہیں۔ کم سے کم انھیں تحقیق سے کام لینا چاہیے تھا اور حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ مانا کہ مولانا نے جو

کچھ لکھا ہے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ انگریز محققوں میں سے جان بیمز اور گریرسن کی تحقیقات پر اعتماد کیا۔ بیمز نے غالباً سب سے پہلے یہ بادہوائی بات لکھی کہ "نے" جمعہ جمعہ آٹھ دن کا ہے۔ قدیم ہندی میں کہیں اس کا وجود نہ تھا۔ اس پر گریرسن نے حاشیہ چڑھایا۔ "بے شک یہ لفظ بھاشا میں اس معنی میں کبھی استعمال نہ ہوا۔" لیکن مولانا عبدالحق صاحب کو اس کی تقلید کیا ضروری تھی۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر لسانیات نے مولانا کے ہاں میں ہاں ملائی۔ اچھا کیا۔ لیکن مولانا نے تو صرف اتنا لکھا تھا کہ "نے" قدیم ہندی میں استعمال نہیں ہوا۔ انھوں نے "قدیم اردو ادب" میں یہ الفاظ اپنی طرف سے بڑھا کر اپنے خیال میں اس کمی کو پورا کردیا جو مولانا سے رہ گئی تھی۔ اردو کے مضمون نگار نے ایک قدم اور بڑھایا اور یہ لکھ مارا کہ قدیم آریائی زبانوں میں "جن کا تعلق اردو کے شجرے سے قریب یا بعید کا ہے" نے کا سراغ "نہیں ملتا۔" اور اس پر غضب یہ کیا کہ یہ قول بھی مولانا کی طرف منسوب کردیا۔ کہ مولانا نے "قواعد اردو" میں "نے" پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قدیم زبانوں میں اس کا نام ونشان نہیں۔ یہ سب کچھ ایک دوسرے کی تقلید سہی، نقل وحکایت سہی، لیکن اس نقل وحکایت میں بھی ان کے کرم فرماؤں نے کوئی نہ کوئی نئی اور انوکھی بات کہی ہے اور جدّت کے شوق میں میری ہستی کو مٹانا اور مجھے ملیامیٹ کرنا چاہا ہے لیکن میں تو غالبؔ کا ماننے والا ہوں اور بقول اس کے میرا مسلک ہے۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

باتیں تو سبھی غلط ہیں لیکن ان سب سے زیادہ گمراہ کن اور بے اصل بات یہ ہے کہ "نے" کا قدیم آریائی زبانوں میں نشان نہ تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب پر یہ اتہام ہے کہ انھوں نے "قواعد اردو" میں اس قسم کی کوئی بات کہی۔ مولانا ایسی غلط اور بے سروپا بات کبھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے تو اس کے خلاف "قواعد اردو" ہی میں لکھا ہے کہ مرہٹی میں اس کا استعمال اردو یا ہندی کی طرح ہوتا ہے۔ بھلا وہ یہ کیسے لکھ دیتے کہ قدیم زبانوں میں "نے" کا نشان نہیں ملتا۔ آخر قدیم زبانوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ہندو پاکستان کی جدید آریائی زبانیں قریب قریب سب ہم عمر ہیں اور جو معمولی سی چھوٹ بڑائی ہے بھی وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔ ان زبانوں کے ابھرنے

اور نمایاں ہونے کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔ اس لحاظ سے یہ زبانیں ایک حیثیت کی ہیں۔ اگر آپ نے اردو کو کم عمر اور نوخیز سمجھ کر دوسری تمام آریائی زبانوں کو قدیم کہا ہے تو مرہٹی بھی ان کے ساتھ قدیم ہے۔ بلکہ زبان کی عام بناوٹ اور ارتقای تاریخ کے لحاظ سے وہ ہندو پاکستان کی دوسری جدید بولیوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب کی اس تصریح کے بعد کہ مرہٹی میں "نے" اردو یا ہندی کی طرح استعمال ہوا ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "نے" قدیم زبانوں میں نہیں اور اس کو مولانا کی طرف منسوب کرنا آپ کی بہت بڑی جسارت ہے اور اگر آپ کا مقصد ہے کہ ہندو پاکستان کی موجودہ بولیوں میں سے کسی ایک میں بھی قدیم زمانے میں "نے" استعمال نہیں ہوا تو یہ بھی غلط ہے۔ مرہٹی میں "نے" اردو یا ہندی کی طرح قدیم زمانے میں مستعمل تھا اور جس طرح آج استعمال ہوتا ہے۔ پہلے بھی استعمال ہوتا تھا۔ گیا نیشور مرہٹی کا قدیم ترین شاعر تھا۔ اس کا زمانہ 1290 لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اس کو امیر خسرو کا معاصر سمجھنا چاہیے۔ مرہٹی ادبیات میں دو ایک کتبوں کو چھوڑ کر سب سے زیادہ قدیم نمونہ اسی کا کلام ہے۔ بھنڈارکر نے کم سے کم چار مثالیں اس شاعر کے کلام سے پیش کی ہیں جن میں "نی" اردو "نے" کی طرح استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہاں "نیں" یائے مجہول بھی ہے لیکن یہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"بے نیں مانیں" (اس معیار سے) "جے نیں توشیس" (جس اطمینان سے)

"بے میں پرسادیں" (اس عنایت سے) ان مثالوں میں "نیں" جو اردو "نے" کا ایک روپ ہے آلے یا ذریعے کے معنی میں ہے اور یہی مفہوم اُردو "نے" کا ہے۔ رسالہ "اردو" کے مضمون نگار نے اس کو دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ "نے" اردو میں فاعل کی علامت نہیں بلکہ آلے یا واسطے کے لیے ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ مضمون نگار یہ کہیں کہ قدیم زبانوں کے جو دو مفہوم بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی میرے ذہن میں نہ تھا۔ میرا منشا قدیم زبانوں سے سنسکرت پراکرت، اپ بھرنش اور قدیم ہندی (مغربی ہندی) وغیرہ زبانیں ہیں جو براہ راست اردو کے سلسلۂ نسب میں ہیں اور اردو نے جن سے ترقی پا کر اپنا موجودہ رنگ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے منشاء کی مزید

وضاحت کے لیے قدیم آریائی زبانوں کے بعد یہ ایک توصیلی فقرہ بھی بڑھا دیا تھا۔ ''جن کا تعلق اردو کے شجرے سے قریب یا بعید کا ہے۔'' اس پر بھی اگر کسی نے میرا منشا سمجھنے میں غلطی کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اردو کے شجرے میں تو ہندو پاکستان کے سب ہی قدیم و جدید آریائی زبانیں ہیں۔ وہ بھی جو اردو کی ماں، نانی، پرنانی ہیں وہ بھی جو اس کی خالائیں ہیں۔ اور وہ بھی جو اس کی بہنیں ہیں۔ ان سبھی زبانوں کا اردو کے شجرے سے تعلق ہے۔ کچھ ان میں سے قریب ہیں اور کچھ بعید۔ ہاں اردو کے سلسلۂ نسب (Lineage) میں صرف وہ زبانیں آتی ہیں جن سے ترقی پاکر اردو بنی اور جنھیں اردو کی ماں، نانی، پرنانی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی سنسکرت (قدیم آریائی) شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش اور قدیم ہندی۔ اگر فاضل مضمون نگار کا قدیم آریائی زبانوں سے زبان کا یہ اوپر سے نیچے اُترتا ہوا سلسلہ مراد تھا تو انھیں صحیح، مناسب اور برمحل لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا اور اردو کے شجرے کی بجائے ''سلسلۂ نسب'' لکھنا چاہئے تھا۔ اس وقت اگر ان کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوتی تو مخاطب کے قصورِ فہم پر محمول کیا جاتا۔

خیر اس بحث کو چھوڑیے اور مضمون نگار کے مفہوم و منشاء کو فلسفہ لسان کی کسوٹی پر پرکھئے۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ زبان ایک نامی چیز ہے جو گردشِ روزگار اور اختلافِ لیل و نہار کے ساتھ برابر بنتی، بگڑتی اور ڈھلتی ڈھلاتی رہتی ہے جو کل تھی آج نہیں اور جو آج ہے وہ شاید کل نہ ہوگی۔ اس لیے زبان کے سرمایۂ الفاظ میں سے کسی ایک لفظ کو لے کر یہ کہنا کہ اسے قدیم زبانوں میں دکھایے بچوں کی سی ضد ہے۔ قدیم زبانوں میں اپنے موجودہ روپ کے ساتھ مشکل ہی سے کوئی لفظ مل سکتا ہے۔ اگر آپ سراغ لگانا چاہیں اور بقول شاعر۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت راہی شناسم

لفظ کے ''اندازِ قد'' سے آپ کو واقفیت بھی ہو تو آپ اس کو کسی نہ کسی رنگ میں، کسی نہ کسی روپ میں اور کسی نہ کسی آہنگ کے ساتھ شاید پا سکیں گے۔

''نے'' کا کھوج بعد میں لگائیں گے۔ لگے ہاتھوں اس سلسلے کے دوسرے بیانات کو بھی پرکھتے چلیں۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اور اپنے زعم میں دور کی کوڑی لائے ہیں

کہ "نے" قدیم اردو ادب میں علامتِ فاعل کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا۔ قدیم اردو ادب اگر انھوں نے دکھنی اور گجراتی اردو ادب کو کہا ہے تو اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر آگے آئے گا۔ فی الحال شمالی ہند کے قدیم اردو ادب کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس میں "نے" کا کوئی سراغ ملتا ہے یا نہیں آخر یہ بھی تو اردو زبان کا ادب ہے اور زمانے کے لحاظ سے اس کا کچھ حصّہ تو دکھنی ادب سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ ہر چند اس کا ایک حصہ اس زمانے کا ہے جب دکن میں تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ امیر خسرو دہلوی اردو (کھڑی بولی) کے اوّلین شاعر ہیں۔ ان کا زمانہ تیرھویں صدی کا نصف آخر اور چودھویں صدی کا ربع اول ہے۔ امیر خسرو کا کلام عام طور سے دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی چند غزلیں جو ادھر اُدھر سے ملی ہیں۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان کی نہیں۔ ہم ان کو ان کی طرف منسوب کر سکتے ہیں اور ان سے لسانی نتیجے بھی نکال سکتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی جیسے محقق نے ایک غزل ان کے نام سے اپنی مایۂ ناز تصنیف "پنجاب میں اردو" میں نقل کی ہے اور اس کی بابت لکھا ہے کہ یہ جس بیاض سے نقل کی گئی ہے وہ تیرھویں صدی ہجری کے ابتدا میں لکھی گئی تھی۔ اس میں یہ شعر بھی ہے۔

میرا جو من تم نے لیا، تم نے اُٹھا غم کوں دیا
غم نے مجھے ایسا کیا، جیسا پتنگا آگ پر

اس شعر میں تین جگہ "نے" ہے۔

محمد افضل سولھویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ جھنجھانہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا زمانہ اور اردو کے قدیم ترین شاعر ملا وجہی مصنف قطب مشتری کا زمانہ ایک ہے۔ مولانا شیرانی کے بقول انھوں نے 1035ھ میں انتقال کیا۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی کے نام سے انھوں نے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ مشہور تذکرہ نگار کمال کا کہنا ہے کہ یہ دکنی زبان میں ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اس میں چھ جگہ "نے" استعمال ہوا ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں اِس کے دو شعر بطور مثال لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا
انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

اس میں "نے" ہے اور دو جگہ ہے۔

چندر بھان برہمن عہد شاہ جہانی کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ سب سے پہلے اُردو میں غزل اسی نے لکھی (شمالی ہند میں) اس کی غزل کا مطلع ہے۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

یہاں بھی "نے" موجود ہے۔

سعدیؔ کاکوروی ایک اور شاعر ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے تو انھیں "باشندہ دکن کا تھا" بتایا تھا۔ لیکن اصل میں وہ شمالی ہند کے ہیں۔ زورؔ نے لکھا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھے۔ اور محمد قلی قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ ان کا ایک شعر تذکروں میں اس طرح منقول ہے۔

ہمنا تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

اس میں "ہمنا" کا "نا" "نے" کے معنی میں ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ "ہم نے" تھا۔ اور اگر "ہمنا" ہی ہے تو "نا" "نے" کا منہ بولا بھائی ہے۔

یہ چند مثالیں "نے" کے استعمال کی ہیں۔ جو متقدمین شعرا کے کلام سے منتخب کی گئی ہیں۔ کیا ہمارے دوستوں اور بزرگوں کو ان کی قدامت سے انکار ہے اور کیا وہ ان کو قدیم اردو ادب میں شمار نہیں کرتے۔

قدیم ہندی بھی کچھ کم مبہم اور شبہ میں ڈالنے والا لفظ نہیں۔ عام طور سے قدیم ہندی اس زبان کو کہتے ہیں جو اپ بھرنش کے بعد ہے اور مشرقی ہندی و مغربی ہندی کے درمیان کی چیز ہے۔ یہ دو زبانیں اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں اور مشرقی ہندی کی تین۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں سے اردو (کھڑی) اور برج بھاشا (پڑی) زیادہ اہم اور بڑے درجے کی ہیں۔ اور مشرقی ہندی کی بولیوں میں سے اودھی کو شہرت اور عزت حاصل ہے۔ صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ قدیم ہندی کوئی زبان نہیں۔ جس طرح انسان، زید، عمر، بکر وغیرہ سے الگ کوئی شخص نہیں۔ میکس مولر کے لفظوں میں ایک منطقیوں کی اپج ہے تو دوسری لغویوں کی۔ یہ بال کی

کھال نکالنے والوں کا کام ہے۔ ہاں! برج اور اودھی جدا جدا دو بولیاں ہیں جن میں ایک مغربی ہندی کی قائم مقام ہے۔ اور دوسری مشرقی ہندی۔ کی۔ مولانا عبدالحق کا یہ فرمانا درست ہے کہ ہندی کی پوربی شاخوں میں "نے" کا وجود نہیں۔ تلسی داس کے کلام میں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہندی کی پچھمی شاخوں میں اس کا وجود ہے۔ سورداس کے یہاں کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ایک پرش نے آجو ہوہی سپنا دینوں

(سورساگر پد 29 صفحہ 200)

ایک شخص نے آج مجھے خواب میں اپنے درشن دیے۔ یہاں "پرش،، نے نائب فاعل یا (آلی فاعل) ہے۔ اور ٹھیک اردو محاورے اور استعمال کے مطابق ہے۔

پرتھی راج راسو کی زبان کو بھی لوگ قدیم ہندی کہتے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ راسو میں "نے" اپنے اصلی روپ (نا، نے، نی، نیں وغیرہ) میں استعمال نہیں ہوا۔ لیکن اس سے "نے" کی قدامت پر حرف نہیں آتا۔ ایک تو راسو کی زبان خالص ہندی زبان نہیں۔ اس میں پنجابی کی آمیزش بھی ہے۔ چند اصل میں لاہور کا باشندہ تھا۔ ممکن نہیں کہ دہلی پہنچ کر وہ اپنے وطن کی زبان جو اس نے ماں کی گود میں سیکھی تھی۔ یکسر بھول گیا ہو۔ اس کے یہاں فارسی، عربی الفاظ کی کثرت بھی اسی وجہ سے ہے۔ یہ الفاظ اس نے لاہور میں سیکھے تھے اور وہ اس کی زبان پر اس طرح چڑھ گئے تھے کہ وہ خود بخود زبان پر لڑھکتے چلے آتے تھے اور اسے اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ دوسرے وہ برج کے سلسلے کی زبان ہے۔ اس قدیم ہندی سے اس کا کوئی تعلق نہیں جس سے اردو (کھڑی) نے ارتقا پایا۔ تیسرے "نے" بدلے ہوئے روپ میں چند کے یہاں بھی ہے۔ اس کی تفصیلات میں اس وقت بیان کروں گا۔ جب اس کی اصلیت بتاؤں گا۔ اور اس کے نسب کا سراغ لگاؤں گا۔

راسو بارھویں صدی کے آخر کی تصنیف ہے۔ اس زمانے کے کچھ پروانے ناگری پر چارنی سبھا نے دریافت کیے ہیں۔ یہ پرتھی راج نے اپنے عہد کے جاگیرداروں، ویدوں، اور عالموں کو لکھے تھے۔ ان میں ایک فرمان آچاریہ رشی کیش دہن دفتری کے نام کا ہے۔ اس میں یہ

الفاظ غور کرنے کے قابل ہیں" تم نے کا کا جی تم کے دوا کی آرام چنؤ" (تم نے کا کا جی کی دوا کی ان کو اچھا کیا) اس میں ' نے ، اردو محاورے کے مطابق ہے۔ یہ فرمان 1335 سمبت بکری کا لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ پُرانی تحریر کا ملنا ممکن نہیں۔ یہ زمانہ جدید آریائی زبانوں کے اُبھرنے اور وجود میں آنے کا ہے۔

"نے" کم سے کم اردو میں قدیم زمانے سے ہے۔ یہ اس وقت بھی تھا جب بقول مولانا عبدالحق صاحب کے اردو نے اپنا سکہ جمایا تھا۔ اور اس وقت بھی تھا جب اردو کا سکہ جم چکا تھا۔ اور گلی گلی کوچے کوچے چل نکلا تھا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی جس کا تعلق "حرف نے" کی نوخیزی سے ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہ قول ہے کہ "نے" اردو میں درآمد کیے جانے کے بعد بھی مدتوں زبان میں اچھی طرح رچ بس نہ سکا۔ اور کچھ نیا سا رہا۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ میر و سودا کے زمانے تک "نے" ، کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی۔ اس کے استعمال کے قواعد حال ہی میں منضبط ہوئے ہیں۔ گریرسن کے خیال میں "نے" کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے 1778 میں مرتب ہوئے۔ یہ بھی "نے" کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ "نے" اردو کی اپنی چیز ہے۔ یہ کہیں سے درآمد نہیں ہوا۔ اردو کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی چھاتی سے اس نے دودھ پیا۔ اس کی آغوش میں اس نے پرورش پائی۔ اردو میں اس کا استعمال ہمیشہ قاعدے کے مطابق ہوا اور کبھی اس کے استعمال میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں برتی گئی۔ میر و سودا کے زمانے سے پہلے بھی اہلِ زبان اس کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے اور ٹھیک قاعدے کے مطابق اس کا استعمال کرتے تھے۔ فعل متعدی کی ماضی اور ان تمام افعال کے ساتھ جو ماضی کی ترکیب سے بنتے ہیں۔ فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی ناہمواری نہ تھی۔

"نے" ، کے استعمال میں بے قاعدگی کو عام طور سے لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کو بھی بے قاعدگی کہتے ہیں کہ جہاں "نے" ، آنا چاہئے۔ وہاں نہ آئے اور جہاں اس کا ذکر ضروری ہو وہاں چھوٹ جائے۔ مثلاً حاتم کے اس مصرعے میں "نے" چھوٹ گیا تھا۔

رات ہم خواب میں اُس زلف کو پیچاں دیکھا

وہ اسے بے قاعدگی کہتے ہیں۔ یہ بے قاعدگی نہیں ناہمواری ہے" نے" اس مصرعے میں مقدر ہے کہ مذکور نہیں۔

یعنی لفظوں میں " نے" نہیں۔ لیکن وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کا اثر موجود ہے " نے" کا اثر یہ ہے کہ فعل کا تعلق اس اسم سے ندر ہے جس پر " نے" آئے۔ جیسے " میں بولا" اور " ہم بولے"۔

ان جملوں میں فعل " میں" اور " ہم" نے جھوٹ بولا۔ ان میں " نے" کی وجہ سے " بولا" کا تعلق " میں" اور " ہم" سے منقطع ہو گیا اور وہ دونوں صورتوں میں " بولا" رہا۔ حاتم کے مصرعے میں " نے" مذکور نہیں لیکن اس پر بھی " ہم" کے ساتھ فعل " دیکھا" ہے۔ دیکھے نہیں۔ اس لیے اس میں بے قاعدگی کہاں؟ بے قاعدگی اس جملے میں ہے۔ اس خاطر زلیخا نے کیا کری (سب رس)۔ اس میں نے کے ہوتے بھی 'کری' کا فاعل کے مطابق مونث ہے۔ قاعدے کے مطابق یہ جملہ یوں ہونا چاہئے تھا۔ " زلیخا نے کیا کرا"، (کیا) یا اس جملے میں ہے۔ " میں کتاب میز پر رکھ دیا ہوں۔" اس میں " نے" صرف ترک ہی نہیں کیا گیا بلکہ فعل کو فاعل کے مطابق بنا کر اس کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ جملہ اس طرح صحیح ہے۔ " میں نے کتاب میز پر رکھ دی ہے۔"

حاتم کے زمانے میں ترک 'نے' معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر حاتم نے شعر کہا۔

سر کو پیٹا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

یہاں " نے" آنا چاہئے تھا۔ جو حاتم سے چھوٹ گیا تھا۔ سادت یار خاں رنگین حاتم کے ایک منہ چڑھے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کا شعر سنا تو فرمایا۔ حضرت! اس کے دوسرے مصرعے میں یہ ترمیم فرمالیں تو بہتر ہے۔

ہم نے شب ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

رنگین کا بیاں ہے کہ حاتم نے ان کی اس اصلاح کو قبول فرمایا اور ان کو شاباش دی۔ اس واقعہ کو رنگین نے خود " مجالس' میں بیان کیا ہے اور بظاہر اس کی صحت میں شبہ کرنے کی گنجائش

نہیں۔ اگر میرؔ و مرزاؔ کے زمانے تک ''نے'' کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی اور اس کا کوئی معیار یا ضابطہ نہیں تھا تو رنگینؔ نے کس لیے اپنے استاد کے شعر میں اصلاح کی جرأت کی۔ حاتم نے اس کی اصلاح کو کیوں قبول فرمایا۔ اور کس واسطے رنگین کی اس جر ۔۔۔ و بے باکی پر حاتم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

دراصل یہ ساری غلط فہمی اس لیے ہے کہ میرؔ و مرزاؔ کے زمانے ۔۔ ے ہماری شاعری کا کوئی اچھا اور صحیح معیار قائم نہیں ہوا تھا۔ اردو شاعری میں فن کی پختگی اور استواری نہیں آئی تھی۔ اردو کے متقد مین شعراء وزن اور قافیہ کی کڑی پابندیوں سے مجبور ہو کر زبان کے اصول کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ محاورے غلط نظم کر جاتے تھے۔ الفاظ ان سے چھوٹ جاتے تھے۔ کوئی لفظ دب جاتا تھا۔ کسی لفظ میں بے جا تصرّف کر لیتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ابتدائی دور کے شعرا نظم پر اچھی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ زبان اور محاورے سے متعلق جو فرد گزاشتیں اُن کے کلام میں ہیں وہ اس عہد کی زبان میں صحیح اور جائز تھیں۔

اس بدعنوانی اور ناہمواری کو اس سے بڑی مدد ملی کہ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز اردو کے مرکز یعنی دتی سے دور دکن میں ہوا۔ اردو محمد تغلق کے عہد میں مسلمانوں کے ساتھ دکن میں پہنچی۔ ایک تو دکن جانے والے مسلمان اچھی طرح اردو نہیں جانتے تھے ان کی زبان فارسی تھی۔ دتی پہنچ کر انھوں نے اردو سیکھ لی تھی۔ دوسرے مولانا شیرانی کی تحقیق کے مطابق یہ لوگ پنجاب سے گئے تھے۔ محمد تغلق غیاث الدین کا بیٹا تھا۔ جس کی زندگی کا بڑا حصہ پنجاب میں گزرا۔ اس نے 720ھ میں ایک ٹڈی دل کے ساتھ دہلی کا رخ کیا اور اپنے پنجابی لشکر کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ محمد تغلق نے 728ھ میں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دکن کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت کرنے والوں میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو 720ھ میں محمد تغلق کے باپ کے ساتھ دلی آئے تھے۔ یہ لوگ آٹھ سال کے عرصے میں دلی کی زبان کیا سیکھ سکتے تھے۔ بُری بھلی پنجابی آمیز زبان بولتے ہوئے یہ دکن پہنچے۔ مشہور فرانسیسی ماہر لسانیات ڈاکٹر جولس بلاک کی رائے بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ساتھ دکن پہنچی جس نے زمانے کے اُلٹ پھیر کے بعد شائستہ ادبی معیاری زبان کی حیثیت اختیار کی۔ کچھ عرصے بعد

جب اردو کے مرکز سے ان کا سیاسی تعلق منقطع ہو گیا تو ان کی زبان ادھوری اور ناقص رہ گئی۔ ساتھ ہی پڑوس کی زبانوں میں سے گجراتی اور مرہٹی نے بھی اس کو متاثر کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دلی کی اردو سے مختلف ہو گئی اور بہت سے صرفی اور نحوی اصول میں اس سے پچھڑ گئی۔ دکنی اُردو میں جو بے قاعدگیاں ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ "نے" کے استعمال میں ان کا بڑا سبب یہی ہے۔

فاضل مضمون نگار کا یہ کہنا غلط ہے کہ دکن کے شعراء اور نثر نگاروں کے یہاں "نے" نہیں ملتا۔ ان کے یہاں "نے" ہے۔ لیکن اس کا استعمال ہموار اور باقاعدہ نہیں۔ اس کا اعتراف مولانا عبدالحق صاحب کو بھی ہے۔ انھوں نے مقدمہ "سب رس" میں دکنی اردو کی خصوصیت بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ "نے" کا استعمال بہت بے قاعدہ ہے۔ اس حرف کے استعمال کے قواعد حال میں منضبط ہوئے ہیں "سب رس" اردو نثر کی قدیم کتاب ہے جو خالص دکنی زبان میں ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اس کا سالِ تصنیف 1030ھ بتایا ہے۔ یہ کتاب مولانا باقر آگاہ کے دیباچہ نظم سے زیادہ قدیم ہے۔ خود مضمون نگار کا بیان ہے کہ باقر آگاہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ دیباچہ 1206ھ میں تصنیف فرمایا۔ "سب رس" کی زبان دکن کی قدیم زبان ہے۔ "اگر دکن کی اردو قدیم اردو ہے تو اس کا قدیم روپ "سب رس" کے آئینہ میں دیکھئے۔ "سب رس" کے چند جملے جن میں "نے" استعمال ہوا ہے (گو بے قاعدہ اور بے محل سہی) میں ذیل میں دے رہا ہوں۔ اگر آپ "نے" کے اعداد و شمار جمع کرنا چاہیں تو "سب رس" کی سیر فرمائیں۔

1۔ غمزے نے نظروں کو اپنے گھر لے کر گیا (ص90)

2۔ رقیب نے روسیاہ نے بے نصیب نے بولیا (ص71)

3۔ بے نمک کھانے تے آدمی نے کیا سواد پانا (ص68)

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔ دکن کی اُردو قدیم اردو ہے۔ وہ آج تقریباً ویسی ہی سیکڑوں سال پُرانی چلی آتی ہے۔ دہلی کی اردو میں ارتقا برابر جاری رہا۔ لیکن دکن والوں کو اس ارتقاء کا علم نہ ہو سکا۔ اس لیے دتی کی اردو میں تو نیا پن آ گیا۔ لیکن دکنی اردو بدستور پُرانی رہی۔ وہاں کے عوام کی بول چال پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا (اردو صفحہ 93) اب ان سے کون پوچھے کہ دتی کی اردو میں ارتقا کیوں برابر جاری رہا۔ دکن کی اردو اس سے کیوں محروم رہی۔ اس کو

مِی بنا کر کس نے رکھا۔ وہ زمانے کے بہاؤ کے ساتھ کیوں نہ بہی۔ بہاریں بھی آئیں اور خزاں بھی۔ لیکن اس کا گلشن صدا بہار رہا کیوں؟ اس کے درختوں کے پتے پیلے کیوں نہ پڑے؟ اور اب پت جھڑ میں کیوں نہ جھڑ گئے؟

یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر اس کا فیصلہ کر لیں کہ "نے" اردو میں کہاں سے آیا۔ یہ خود اردو کی چیز ہے یا کسی دوسری پاس پڑوس کی زبان سے اردو میں لیا گیا ہے۔ "نے" ہندوستان و پاکستان کی جدید آریائی زبانوں میں سے مرہٹی، گجراتی، پنجابی، ہریانی اور برج بھاشا میں بھی ہے۔ ان میں ہریانی اور برج اردو سے زیادہ قریب ہیں۔ اور ماہرین لسانیات کے خیال میں وہ اردو کی سگی بہنیں ہیں۔ باقی زبانیں اردو کی خالائیں ہیں۔ ان زبانوں میں "نے" کے روپ اور اس کے مختلف استعمالات اس طور پر ہیں۔

	زبان	روپ	محل استعمال	ترجمہ
1۔	اردو	نے آلی فاعل	(نائب فاعل)	ذریعہ۔واسطے سے
2۔	مرہٹی	میں (بیائے مجہول) مفرد	آلی	ذریعہ۔واسطے سے
		نیں (بیائے معروف) جمع		
3۔	گجراتی	نے	آلی	
		نے	مفعولی	کو
		نوں۔نی۔نوں	اضافی	کا
4۔	پنجابی	نے	آلی	ذریعہ۔واسطے
		نوں	مفعولی	کو
5۔	ہریانی	نے	فاعلی آلی	ذریعہ۔واسطے سے
		نے	مفعولی	کو
6۔	برج	میں (ے مجہول)	فاعلی آلی	ذریعہ۔واسطے سے

چیتاونی مرہٹی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں "نا" (کو) کے معنی میں ہے۔ اور غالباً دکنی اردو، کے "ہمنا" (ہم کو) کا "نا" مرہٹی زبان کی اسی شاخ سے لیا گیا ہے۔

"نے" کے بارے میں گریرسن کا خیال ہے اور اس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں کہ یہ بھاشا (برج) کا نہیں۔ اس معنی میں کبھی یہ بھاشا میں نہیں استعمال ہوا۔ اس کی اصلیت میں اختلاف ہے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ مرہٹی سے لیا گیا ہے اور کچھ کی رائے ہے کہ مضافات دہلی کی زبان سے۔ شیام سندر داس اسے، مغربی ہندی کی پیداوار بتاتے ہیں۔ مضافات دہلی کی تین زبانیں ہیں جن میں "نے" ہے۔ ایک میرٹھ اور اس کے نواح کی کھڑی (یہی زبان ہے جس پر اردو کی بنیاد کھڑی ہے) دوسری ہریانی۔ تیسری متھرا کی برج۔ یہ زبانیں مغربی ہندی کی شاخیں ہیں۔ دکنی کے آغاز و اشاعت سے متعلق جو تفصیلات اوپر دی گئیں ان سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اردو "نے" "پنجابی" "نے" یا "نوں" سے ماخوذ نہیں۔ دکن جانے والے مسلمان پنجابی تھے۔ جو مدتوں پنجاب میں رہے تھے۔ مولانا شیرانی کا کہنا ہے کہ انھوں نے پنجاب میں پنجابی سیکھی اور اس کے بعد دلّی پہنچ کر انھوں نے "دہلوی زبان" سیکھی ہو یا نہ سیکھی ہو۔ دکنی زبان پر جو پنجابی کا اثر ہے اور اس کا ڈول جو پنجابی سے ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دکن کی طرف ہجرت کرنے والے پنجابی بولتے تھے۔ یا کم سے کم یہ زبان جانتے تھے۔ اس مسئلے کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مولانا شیرانی کے نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی طور پر شاید اس کو جھٹلایا بھی جا سکتا ہے کہ دکن جانے والے پنجابی تھے۔ لیکن دکنی اور پنجابی میں جو لسانی مشابہتیں ہیں۔ صرف ونحو کے اصول میں جو ان کا اتحاد ہے۔ اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ دکن کی اردو، پنجابی سے بہت قریب ہے۔ بلکہ قدیم دکنی اردو تو ہر لحاظ سے پنجابی کا ایک چربہ ہے۔ اور پھر اس کی توجیہ یہ کرنی ہوگی کہ دکن جانے والے مسلمان پنجابی تھے۔ ان کی زبان کا پرچھانواں اس زبان پر بھی پڑا۔ جو دلی آکر انھوں نے سیکھی تھی۔ اگر یہ زیادہ عرصے تک دلی میں رہتے۔ اہل زبان سے ان کا اختلاط و ارتباط بڑھتا تو شاید یہ اس زبان کو اتنا نہ بگاڑ سکتے۔ لیکن زبان کے اصل مرکز سے دور ہو جانے کے بعد انھیں اپنی منشا کے مطابق اس زبان کو ڈھالنے کی آسانیاں حاصل ہو گئیں۔

"نے" اگر پنجابی سے اردو میں آیا ہوتا تو دکن کی قدیم زبان میں پایا جاتا اور دکنی ادبیات میں اس کا استعمال نہایت باقاعدہ اور ہموار ہوتا۔ بلکہ "نے" کے ساتھ ساتھ "نوں" بھی دکن میں ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ "نے" کی بابت تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پنجابی میں بعد کی

پیداوار ہے اور شاید اس کی شکل و صورت بھی پاس پڑوس کی زبانوں کی شرمندۂ احساں ہے۔ لیکن "نوں" پنجاب کی اپنی چیز ہے۔ یہ اس معنی میں اور اس صورت کے ساتھ کسی اور زبان میں نہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شمالی ہند کے قدیم و جدید شعرا کے یہاں تو "نے" ہے اور بہت با قاعدہ تاریخی تسلسل کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ لیکن دکن میں "بقول" مضمون نگار یہ قدیم زمانے میں تھا اور نہ آج ہے۔ وہاں کے لوگ اسے نہیں جانتے۔ اور گو نادانستہ سہی اکثر اس طرح لکھ جاتے ہیں۔ "میں کتابیں میز پر رکھ دیا ہوں۔" رہا "نوں" تو اس کا دکنی اردو میں نام و نشان تک نہیں۔

"نے" مغربی ہندی کی پیداوار بھی نہیں۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ پرتھی راج راسو میں جسے مغربی ہندی کا قدیم ترین نمونہ بتایا جاتا ہے یہ نہیں ملا۔ وہاں اس کا مفہوم (نے) کی جگہ قدیم اپ بھرنش "یں" سے ادا کیا گیا ہے۔ یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ "نے" برجی بھی نہیں۔ راسو کی زبان برج بھاشا سے بہت ملتی ہے بلکہ وہ برج بھاشا کا ہی ایک قدیم روپ ہے۔ شیام سندر داس کا بیان ہے کہ "پرتھی راج راسو میں برج کے ڈھانچ کا بہت کھرا بھاس ہے۔ اگر (نے) برج میں قدیم زمانے سے ہوتا تو اس کے قدیم روپ یعنی راسو کی زبان میں اس کا استعمال ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ برج نے اودھی کو بھی متاثر کیا ہے اور اس پر برج کی چھاپ بہت گہری ہے۔ "نے" برج میں ہوتا ہے تو اس کے چونچال پن کا تقاضا تھا کہ وہ اودھی سے بھی رسم و راہ پیدا کر لے۔ اودھی کا اس سے نا آشنا ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ کم سے کم اس زمانے میں برج کی گود اس سے خالی تھی۔ جب اس نے اودھی کو دودھ پلایا۔ ان تمام قرائن کو سامنے رکھ کر ہی شاید گریرسن نے اس کے ہندی الاصل ہونے سے انکار کیا تھا۔

پنجابی، مغربی ہندی اور برج بھاشا کو چھانٹ دینے کے بعد مرہٹی، گجراتی اور ہریانی صرف تین زبانیں رہ جاتی ہیں۔ جن میں "نے" استعمال ہوا ہے۔ ہارنلے کے اس خیال کو بھی اگر سامنے رکھ لیا جائے کہ "نے" راجستھانی بولیوں میں سے مارواڑی میں بھی ہے۔ وہاں سے بھی اردو میں آسکتا ہے تو اس فہرست میں ایک زبان کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کہ اردو ہریانی، گجراتی، مارواڑی اور مرہٹی ان پانچ زبانوں

میں سے ''نے'' کس زبان کا ہے اور کہاں اس نے جنم لیا۔ اس کی زندگی کے مختلف دوروں پر ایک نظر ڈال لیں تو بہتر ہے۔ اگر ہم اس کی زندگی کے مختلف دوروں کو روشنی میں لا سکے اور اس بہروپیے کو اصلی روپ میں دیکھ سکے تو اس کی اصلیت، حقیقت اور نسب کا کھوج لگانے میں بھی شاید ہم کامیاب ہو جائیں۔

آیئے! دیکھیں ماہرین لسانیات نے ''نے'' کے بارے میں کیا کیا قیاس آرائیاں کی ہیں۔

1۔ ہارنلے کہتے ہیں کہ ''نے'' اصل میں ''لبدھے'' تھا جو لبھ (حاصل کرنا سے) اسم مفعول ہے اور مفعولی ثانی یعنی (Dative) حالت میں ہے۔ ''لبدھے'' کے لفظی معنی ہیں حاصل کردہ کے لیے اور اس کے مختلف مدارج ارتقا اس طور پر ہیں۔ لبدھے، لبھے، لبھے، لیے، لے، نے۔

2۔ جان بیمز اس کی اصل سنسکرت ''لگنے'' بتاتے ہیں ۔ یہ بھی اسم مفعول اور مفعول ثانوی حالت میں ہے۔ لیکن اس کا مادہ ''لگ'' بمعنی چمٹنا اور چپکنا ہے۔ لگنے کے معنی ہیں لگے ہوئے اور چپکے ہوئے کے لیے۔ اس کے ارتقای درجے یعنی منازل حیات یہ ہیں۔ لگنے، لگے، لگے، لیے، لے، نے۔

3۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اسے سنسکرت علامت آلہ (کرن) ''آیں'' (بیائے مجہول) سے ماخوذ بتاتے ہیں جس کا استعمال پراکرت کے آخری عہد تک ہوا ہے۔ پالی اور پراکرت میں مفتوح الاواخر اسماء کے آخر میں آلی حالت (Instrumental) کے اظہار کے لیے یہی علامت استعمال ہوتی تھی۔ اپ بھرنش عہد تک پہنچتے پہنچتے ''این'' کا ''ن'، غنہ ہو کر ''آیں'' رہ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ''آیں'' باظہار 'ن' بھی رائج تھا۔ آلے کے لیے بھی اور مجہول کے فاعل یعنی Agent کے لیے بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ ''آین'' سے ''نے'' کیسے بنا؟ اس کی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔

(الف)۔ بھنڈارکر کہتے ہیں کہ ''نے'' دوہری علامت ہے۔ اول ہٹے ''یں'' سے ''ن'' تراش لیا گیا۔ بعد میں اپ بھرنش ''آ'' آیں، (دن، غنہ کے ساتھ) اس پر اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح ن۔ (دن یں = نیں) اور پھر نے بنا۔

(ب)۔ شیام سندر، ہری اودھ دھریندر نے ''نے'' کو آیں کا مقلوب (اُلٹا) مانا ہے۔ قلب ارتقائے زبان کا ایک محرک ہے جس نے جدید آریائی زبانوں کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ایک تیسری توجیہ بھی ہے کہ اصل علامت آلہ سنسکرت میں 'ن' ہے۔ مفتوح الاواخر اسماء میں یہ ن جمع یں، کی شکل میں تھا اور مکسور یا مضموم الاواخر (مذکر، مونث) اسماء میں 'نا' کی شکل ین۔ جیسے مُنِ (عابد) سے مُنا، اور بھان (سورج) سے بھانا، 'نے'، 'ن' کی مفعولی ثانی حالت ہے۔

'نے' کو لگنے یا لبدھے سے نکالنا کئی وجہ سے غلط ہے۔ 'نے' مذکورہ بالا زبانوں میں 'واسطے' اور 'ذریعے' کے معنی میں ہے یا 'کو' کے معنی میں یعنی 'نے' آلے یا نائب فاعل کی علامت ہے یا مفعول کی۔ لگنے یا لبدھے جنھیں ان علمانے 'نے' کا ماخذ بتایا ہے۔ ان دو معنوں میں سے کسی ایک سے بھی تعلق نہیں رکھتے۔ نہ قریب کا اور بعید کا، نہ لفظی اور نہ معنوی، اس لیے قدرتی طور پر یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ خالص سنسکرت کلمے اولاً کب اور کس لیے نائب فاعل یا مفعول کا مفہوم ادا کرنے کے لیے منتخب کیے گئے۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر لسانیات کا یہ فرمانا بڑا ہی مضحکہ انگیز ہے کہ چونکہ سنسکرت کے مفعول (اسم مفعول) ''لگیا'' سے نکلا ہے اس لیے (نے) بیشتر زبانوں میں علامت مفعول ٹھہرایا گیا ہے۔'' آخر کیوں نہیں مفعول اور اسم مفعول بھائی بھائی جو ہوئے۔ لیکن جن زبانوں میں علامت فاعل ٹھہرایا گیا ہے۔ انھوں نے فاعل کا مفعول سے کیا رشتہ بتایا ہے؟ قدیم زمانے سے لے کر آج تک سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش میں یہ کلمے یا ان کے درمیانی حلقے کبھی ''نے'' کی جگہ اور اس کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے۔ صرف بمز نے اتنا لکھا ہے کہ نیپال میں 'لائی' مفعول کے لیے ہے اور 'لے' آلے کے لیے۔ لیکن نیپالی جدید آریائی زبانوں میں سے ہے اور اس کے اُبھرنے کا زمانہ قریب قریب وہی ہے جو دوسری جدید زبانوں کا ہے۔ اس لیے اس میں کسی لفظ کا کسی معنی میں استعمال اور اس کا رنگ روپ اس حقیقت کا پتہ لگانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔ نیپالی 'لے'، ہوسکتا ہے کہ 'نے' ہو اور اس کا 'ن' 'ل' سے بدل گیا ہو۔ جدید آریائی زبانوں میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثلاً لوٹنا، پراکرت، لوٹ، سنسکرت نورت، صوتی اعتبار سے بھی یہ اشتقاق صحیح نہیں۔ 'نے' کے متعدد روپوں میں سے ایک روپ 'نیں' ہے۔ جو مرہٹی اور مارواڑی کے علاوہ برج میں بھی ہے۔ اگر ''نین'' لئے یا 'لے'

سے بنا ہے تو اس میں 'نون' کہاں سے آیا۔ اس کے علاوہ لگے۔ لیے سے نے (بفتح (ن) تو
ہوسکتا ہے۔ نے (بکسر "ن") نہیں ہوسکتا۔

ان وجوہ میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ 'نے' کی زندگی اور اس کے ارتقا کے جتنے
منازل ہارنلے یا بیمز نے بیان کیے ہیں وہ جدید آریائی زبانوں کے اصل ماخذوں میں نہیں ملتے۔
سنسکرت (قدیم ہند آریائی) پالی پراکرت اور اپ بھرنش یہ چار بڑے ارتقائی زینے ہیں جن سے
اُتر کر ہماری موجودہ زبانوں نے اپنا موجودہ روپ اختیار کیا اور ان کے خط و خال اتنے اُبھرے
اور نمایاں ہوئے کہ وہ اپنے ماخذوں سے الگ مستقل اور آزاد زبانیں بنیں۔ 'نے' کا اس سے پہلے
کیا روپ تھا یہ بتایا جائے اور صرف بتایا ہی نہ جائے بلکہ اپ بھرنش ادب میں اس کا یہ روپ دکھایا
بھی جائے۔ اسی طرح اس سے پہلے کا روپ پراکرت میں دکھایا جائے اور اوپر تک اس کے تمام
ارتقائی درمیانی منزلوں کی نشان دہی کی جائے۔

یہ بات صرف اس قیاس کو حاصل ہے جو بھنڈارکر اور اس کے دوسرے ہندی ساتھیوں
نے پیش کیا ہے۔ اس میں 'نے' کی صرف دو منزلیں ہیں۔ ایک قدیم جو سنسکرت میں ہے۔ یعنی
آیں اور 'نا' دوسری جدید جو ہماری زبان میں ہے یعنی 'نے' اور 'نا' نیں کی تین منزلیں ہیں۔ ایک
وہی جو سنسکرت میں ہے۔ دوسری 'تیں' یہ اپ بھرنش میں ہے اور تیسری 'نیں' اس حساب سے 'نے'
سب سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ سنسکرت کے قدیم روپ 'یں' سے لیا گیا ہے۔ اس میں نہ پراکرت کا
واسطہ ہے نہ اپ بھرنش کا اور نہ قدیم مغربی ہندی کا۔ اس لیے کہ پراکرت اور قدیم ہندی میں اس
لاحقے کا روپ یں) نون غنہ کے ساتھ تھا۔ اپ بھرنش میں ہر چند نون کا اظہار بھی ہے۔ لیکن زیادہ
تر اس میں نون کا اخفا دیکھا گیا ہے۔ 'نے' میں 'ن' کا اظہار ہے۔ ہماری زبانوں کا عام رجحان ہے
کہ ان میں سنسکرت اور پراکرت "انوناسک" (م۔ن وغیرہ) غنہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ
جدید زبانوں کے عام میلان اور مزاج کے خلاف جب 'یں' سے 'نے' ڈھالا گیا ہو تو غنہ کو ظاہر
کر دیا ہو۔ یہ اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ جس کا زبان کی شریعت میں ذرا سا بھی امکان نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ 'نے' اصل میں حالت آلی کی علامت ہے۔ سنسکرت میں
بھی پراکرت میں بھی اور اپ بھرنش میں بھی۔ بلکہ اپ بھرنش میں جو قدیم آریائی زبان کے تنزل کا

آخری درجہ اور جدید آریائی زبانوں کے ارتقا کا اولین درجہ ہے'ں' نائب فاعل Agent کی حالت بتانے کے لیے استعمال ہوا ہے اور یہ استعمال ٹھیک ٹھیک اردو میں 'نے' کے استعمال کے مطابق ہے۔ 'نے' کے نسب اور اس کے نشو ونما کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اگر وہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ 'نے' قدیم ہی نہیں بلکہ قدیم ہند آریائی عہد سے لے کر جدید زبانوں کی تعمیر کے زمانے تک یہ صرف ایک معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے اور اس سے صرف ایک کام لیا گیا ہے یعنی آلی حالت کا اظہار اسم مفعول (یعنی ماضی متعدی) کی فاعلی حالت بھی اسی میں آجاتی ہے۔ سنسکرت میں ان دونوں حالتوں کے لیے ایک خاص اصطلاح 'کرن' تھی۔ اُردو میں آلہ کے لیے میں نے آلی حالت کی اصطلاح وضع کر لی ہے اور ماضی متعدی کے فاعل کے لیے نائبَ فاعل یا آلی فاعل کی سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش میں 'ترتیہ' آلے اور آلی فاعل دونوں کے لیے مستعمل تھا۔ اردو میں آلے کے لیے (سے) ہے اور آلی فاعل کے لیے (نے) جیسے زید نے عمر کو لاٹھی سے مارا۔ اس میں لاٹھی آلۂ ضرب ہے اور اسے 'نے' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بس اتنا سا فرق ہے۔ ویسے 'نے' آلی حالت کے لیے سنسکرت اور پراکرت استعمال کے مطابق ہے۔

''نے'' کے ماخذ آین کا اپ بھرنش عہد تک صرف ایک مفہوم رہا۔ اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ 'نے' جو اس کی فرع ہے۔ اول اول اپنے اصلی مفہوم میں استعمال ہوا۔ بعد میں جب اس کا یہ مفہوم حافظہ سے اُتر گیا، یا عام اعرابی حالتوں میں فرق نہ رہا تو یہ مفعول کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ایک مفہوم سے دوسرے مفہوم تک منتقل ہونے میں ضرور کچھ وقت لگا ہوگا۔ لیکن آج اس وقت اس کی حد بندی اور تعین ذرا مشکل ہے۔ اس اصول کی صحت میں شبہ نہیں۔ میں اس اصول کو 'نے' اور اس کے استعمال کی قدامت کا معیار سمجھتا ہوں۔ 'نے' کا پہلا استعمال دوسرے استعمال سے قدیم ہے۔ جن زبانوں میں صرف پہلا استعمال ہے ان میں 'نے' زیادہ قدیم زمانے سے ہے اور جن میں دوسرا استعمال ہے یا پہلا اور دوسرا دونوں استعمالات ہیں ان میں کسی قدر متاخر زمانے سے ہے۔ یہ اتنی صاف اور واضح بات ہے کہ اس کے ماننے میں کس کو تامل نہ ہونا چاہیے۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ ایک تو 'نے' کا دوسرا استعمال بعد کے زمانے کا ہے۔ اس لیے جس زبان میں یہ استعمال ہے وہ اگر بعد کی نہیں تو کم سے کم 'نے' کا اس زبان میں وجود ضرور متاخر ہے۔ دوسرے یہ

استعمال اس زبان میں یقیناً قدیم زبانوں سے نہیں آیا۔ یہ قدیم زبانوں میں تھا ہی نہیں۔ ان سے کوئی زبان اس استعمال کو کیسے حاصل کر سکتی تھی۔ اس لیے یوں کہیے کہ ان زبانوں نے 'نے' کو اس کے پہلے استعمال کے ساتھ قدیم زبانوں سے لیا۔ دوسرا استعمال کچھ زمانہ گزرنے کے بعد خود ان زبانوں میں اُبھر آیا۔

ممکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ 'نے' کا پہلا استعمال جسے آپ قدیم بتاتے ہیں ان زبانوں سے آیا ہو جن میں 'نے' کے دونوں استعمال پہلے سے تھے۔ آخر اس میں کیا دقت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ اگر 'نے' کسی ایسی زبان سے لیا جاتا تو اپنے دونوں مفہوموں کے ساتھ لیا جاتا۔ یہ قطعاً خلاف قیاس ہے کہ 'نے' کسی زبان میں فاعل و مفعول دونوں کے لیے استعمال ہو اور ہم اسے اپنی زبان میں لیں تو اس کا ایک مفہوم کم کر دیں۔ دوسری زبانوں میں تو 'نے' کو ایک نئے معنی پہنا دیے جائیں اور ہم جب اس لفظ کو اختیار کریں تو کاٹ چھانٹ دیں۔ آخر یہ فرق کیوں؟ اہلِ علم اس کے کیا اسباب بتائیں گے۔ سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ ہم 'نے' کو اس زبان کی چیز بتائیں جس میں سنسکرت سے لے کر اپ بھرنش عہد تک کی قدیم زبانوں کی طرح 'نے' کا ایک صاف اور واضح مفہوم تھا۔ اور اس کے نئے مفہوم کو دوسری زبانوں کی پیداوار بتائیں یہ صاف بھی ہے۔ صحیح بھی ہے اور قیاس کے مطابق بھی۔ ہم اس سیدھی اور سچی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی اور غلط راہ کس لیے اختیار کریں۔

اس اصول کے مطابق ہریانی، گجراتی اور مارواڑی زبانیں نکل جاتی ہیں۔ ان میں سے پہلے دو زبانوں میں 'نے' آلی فاعلی اور مفعولی دونوں مفہوموں کے لیے ہے اور مارواڑی میں صرف مفعول کے لیے۔ اردو ''نے'' ان زبانوں سے ماخوذ نہیں۔ اردو میں 'نے' کا آلی استعمال ان زبانوں کے مشتبہ اور مخلوط دوگونہ استعمال سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ اب صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ میرٹھ کی کھڑی بولی سے 'نے' لیا گیا دوسرے مرہٹی سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو مرہٹی حلقۂ اثر سے بہت دور ہے۔ اس لیے وہاں سے لینے کی کوئی صورت نہیں۔ دوسرے مرہٹی میں 'نے' کی نوعیت اردو 'نے' سے ذرا مختلف ہے۔ اردو میں 'نے' غیر منصرف ہے اور مرہٹی میں منصرف۔ اردو میں 'نے' واحد اور جمع دونوں کے لیے ہے۔ مرہٹی میں ''نے'' ''نیں'' (بیائے

مجہول) مفرد نیں (بیائے معروف) جمع کے لیے۔اردو نے سنسکرت ٹڑیں سے زیادہ قریب ہے۔
اورمرہٹی ''نیں' 'اپ بھرنش یں سے۔اس لیے میرا خیال ہے کہ اردو 'نے' اور مرہٹی 'نیں' جدا جدا دو
صیغے ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہیں۔نہ یہ اس سے لیا گیا ہے اور نہ وہ اس سے۔دونوں
سنسکرت اور پراکرت عہد سے ارتقا کے منازل الگ الگ طے کرتے آئے ہیں۔ان کے
استقلال اور ایک دوسرے سے بے نیازی کا ثبوت یہ ہے کہ اردو اور مرہٹی دونوں زبانوں میں 'نے'
قدیم سے ہے اور ان کے قدیم ادب میں اس کا سراغ ملتا ہے۔گیانیشور اور امیر خسرو قریب قریب
معاصر ہیں۔اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔دونوں کے یہاں 'نے' ہے۔ان دو زبانوں کو چھوڑ کر
جدید آریائی زبانوں کے قدیم ادب میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اس کے بعد اردو کی قدامت پر غور فرمائیں۔یہ زبان جدید آریائی زبانوں میں کسی
سے کم عمر نہیں۔قدیم زمانے سے یہ ترقی کرتی آئی ہے۔یہ دوآبے کے اس حصے کی زبان تھی جو
آریاؤں کے زمانے سے علم،تہذیب روشن خیالی کا مرکز رہا ہے۔اس پر قدیم آریائی زبانوں کی
گہری چھاپ ہے۔یہ کسی زمانے میں پالی اور قدیم آردھ یا ماگدھی کی جانشین تھی۔اور شاید پالی
اس زبان کی علمی اور معیاری شکل ہے۔یہ داستان بڑی طویل ہے۔لیکن اتنی ہی دل چسپ بھی
ہے۔میں نے 'نے' کی تاریخ سے اس زبان کی قدامت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے اردو کی
عظمت اور اس کے خاندانی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چوتھا باب: اردو زبان ۔ افکار و مسائل

i ابتدائیہ

ii اُردو زبان کے مطالعہ میں لسانیات کی اہمیت

iii زبان اور تہذیب

iv اُردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ

v اُردو میں تلفظ کا مسئلہ

vi صحتِ زبان کے لسانیاتی پہلو

ابتدائیہ

ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اُردو کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہے۔ یہ ہند آریائی علاقہ سے باہر دراوڑی زبانوں کے علاقہ میں بھی یکساں طور پر بول چال کی زبان ہے۔ اُردو کی اسی ہندوستان گیر حیثیت کی وجہ سے اس کے مسائل بھی بے شمار ہیں۔ صحتِ زبان اور معیار کے مسائل کی بنیادی وجہ اس کی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ اُردو اس لحاظ سے بہت بدقسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، پھیلاؤ اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے تسلی بخش کام ابھی نہیں ہو پایا ہے۔ اُردو کا توضیحی مطالعہ، اُردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور اسی قسم کے دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیق چند مضامین سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پچھلے دو دہوں میں لسانیات نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یورپ کی زبانوں سے مقابلہ بے سود ہے۔ اردو ابھی لسانیاتی تحقیق اور علمی بصیرت کے لحاظ سے ہندوستان کی دیگر زبانوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جدید دور میں علم زبان نے تاریخی لسانیات کی سرحدوں سے باہر قدم رکھ کر فلسفہ دریاضی کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان منزلوں تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی بنیادیں مستحکم کر رہی ہے۔ زبانیں اب اپنے مخصوص دائروں میں محدود نہیں رہ سکتیں بلکہ تہذیبی اُلٹ پھیر، لسانی انقلاب اور صنعتی وسائنسی ترقی کی بے پناہ وسعت میں انھیں اپنے لیے جگہ متعین و

مقرر کرنی ہوگی۔ ماضی کی طرف نگاہ رکھنا ضروری سہی لیکن زمانہ کی رفتار کے پیش نظر مستقبل سے آنکھیں چرائی نہیں جا سکتیں، زندہ رہنے کے لیے اس سے آنکھیں ملانی ہوں گی۔

''حرف وصوت'' میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مقالہ ہمزہ کیوں؟ کی طرح جس نے علمی نقطۂ نظر سے ہمزہ کی اہمیت اور اردو رسم خط میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصہ میں ڈاکٹر نارنگ کا مقالہ اردو زبان کے مطالعہ میں لسانیات کی اہمیت صرف ان کی دقتِ نظر کا پتا دیتا ہے بلکہ اردو والوں کو شاید پہلی بار مشہور ریاضی داں اور لنگوسٹ چامسکی کے نظریات سے متعارف کراتا ہے۔ اردو میں علمی اصطلاح سازی پر وحید الدین سلیم کی معرکۃ الآرا کتاب ''وضع اصطلاحات'' آج بھی اس موضوع پر بنیادی کتاب ہے۔ جس سے ہر دور میں روشنی حاصل کرنی ہوگی۔ ''اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ'' وضع اصلاحات ہی سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے مضامین زبان اور تہذیب اور صحتِ زبان کے لسانیاتی پہلو احتشام صاحب کے فلسفیانہ ذہن اور علمی بصیرت کے نادر نمونے ہیں۔ راقم الحروف کا مقالہ اردو زبان میں تلفظ کے معیار کی تلاش کی ایک کوشش ہے۔

اُردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت

میں اِس مختصر مضمون کو ایک معذرت کے ساتھ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ اگر اس عنوان سے یہ توقع پیدا ہو کہ لسانیات سے زبان کے مطالعے میں جو مدد مل سکتی ہے یہاں اس کے تمام پہلوؤں سے بحث کی جائے گی، تو یہ میرا مقصد نہیں۔ اس سلسلے کی بعض بنیادی باتیں میں اپنے کتابچے ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' کے پہلے حصے میں کہہ چکا ہوں۔[1]

یہاں انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ صوتیات کی گفتگو میں بعض حقائق کی تکرار ناگزیر ہے۔ لیکن گرامر کی بحث میں کوشش کی جائے گی کہ بعض نئی معلومات کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ دوسرے یہ کہ لسانیات کی بعض اصطلاحوں کا ابھی اردو میں پوری طرح چلن نہیں ہوا۔ اس لیے اس مضمون میں جہاں مناسب تھا، انگریزی اصطلاح ساتھ درج کر دی گئی ہے، یا صرف انگریزی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہ بات اگر قابلِ فخر نہیں تو کچھ ایسی افسوسناک بھی نہیں کہ اردو میں لسانیات اب فیشن میں داخل ہوتی جاتی ہے۔ اس سے اتنی امید تو ضرور ہے کہ اردو میں اب صحیح معنوں میں لسانیات کے اسکالر پیدا ہونے لگیں گے۔ اب تک گنتی کے جن لوگوں نے اردو لسانیات میں تھوڑا بہت کام کیا ہے، بنیادی طور پر وہ ادب اور لسانیات کے

---

1. مطبوعہ دہلی۔ 1962

دورا ہے پر کھڑے ہیں اوران کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ لسانیات خاصا پھیلا ہوا موضوع ہے۔ اس کی دنیا میں آسمان دور اور زمین سخت ہے۔ اس میں ہر شخص ہاورڈ یونیورسٹی کے روسی عالم Roman Jakobson کی طرح تو ہو نہیں سکتا کہ اعلیٰ پائے کا نقاد بھی ہو بہترین اسکالر بھی ہو اور چوٹی کا ماہر لسانیات بھی ہو۔ یہ تو وہی سعادت والی بات ہے جس پر رشک کیا جاسکتا ہے۔ جس کی تقلید خطرے سے خالی نہیں۔

زبان کے تعلیمی کام میں لسانیات کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اُس نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ زبان ہے کیا چیز۔ مغرب میں زبانیں پڑھانے کے طور طریق میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی وجہ یہ ہے کہ لسانیات نے زبان کو افسانہ وافسوں (Myth) کی دنیا سے نکال کر سائنس کی واقعاتی روشنی میں پیش کیا ہے اور اس کی اصلیت سے نقاب اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اہم نکتے یہ ہیں۔

1۔ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔ Language is vocal

2۔ زبان بنیادی طور پر بول چال کے لیے ہے۔ تحریر ثانوی چیز ہے اور زبان کے ملفوظی پہلو سے ماخوذ ہے۔

(Language basically is speech, Writing is its secondary and Derivative manifestation)

3۔ زبان تغیر پذیر چیز ہے۔ (Language is Dynamic changing thing)

4۔ زبان ایک نظام رکھتی ہے۔ (Language has a system)

سب سے پہلے اسے لیجیے کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے اور زبان کے ملفوظی پہلو کو اس کے تحریری پہلو پر فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں عام روایت اس کے برعکس رہی ہے یعنی حرف ہی کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ حرف کا تصور اردو میں بُری طرح ذہنوں پر مسلط ہے۔ زبان کی کوئی بھی بحث ہو، حرف سے ہٹ کر کی ہی نہیں جاتی۔ اتنی بات سب جانتے ہیں کہ اردو، ہند آریائی زبان ہے اور اس کا رسم الخط سامی خاندان کی ایک زبان سے ماخوذ ہے۔ اس سے یوں تو اردو کے پھیلاؤ اور اس کے تہذیبی رابطوں کا پتا چلتا ہے۔ لیکن حرف اور صوت کے رشتے کو صحیح طور پر سمجھنے

اور سمجھانے کے کام میں کئی دشواریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اردو میں ان دشواریوں کی طرف آج تک پوری توجہ نہیں کی گئی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو پڑھنے اور پڑھانے والوں میں سے کتنے اِس بات کو جانتے ہیں کہ اردو میں بنیادی مصوتوں کی تعداد دس ہے۔ بظاہر اردو میں مصوتوں کے لیے صرف تین علامتیں ہیں۔ ا، و، ی، ی کے دو روپ ہیں۔ ی اور ے۔ ان میں سے واؤ اور یائے دوہری علامتیں ہیں۔ یعنی مصوتوں کے علاوہ یہ نیم مصوتوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً وہاں، یہاں، وہ، یہ وغیرہ کے شروع میں۔ باقی رہا، الف، یہ خالصتہً مصوتوں کے لیے وقف ہے۔ اردو میں تین اعراب ہیں۔ زیر، زبر اور پیش جن کا استعمال ابتدائی جماعت کے قاعدوں تک محدود ہے۔ اس کے بعد پڑھنے اور لکھنے میں ان کا چلن نہ ہونے کے برابر ہے۔ غرض اتنی کم علامتوں سے اردو میں ہم دس بنیادی آوازوں کا کام لیتے ہیں۔ بحث یہ نہیں کہ یہ ہماری زبان کی قوت ہے یا کمزوری بلکہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ زبان کے مطالعے میں سب سے پہلی بات جس پر لسانیات زور دیتی ہے، یہی ہے کہ اس کی آوازوں کے بارے میں پوری واقفیت و آگہی حاصل کی جائے۔ تبھی صحیح معنوں میں معلوم ہوگا کہ ہم جو موقع و محل کی رعایت سے دین کو کبھی دین اور کبھی دِین، میرا کو میرا اور کبھی میرا، تو کو کبھی تو، اور کبھی تو یا میل کو میل یا میل، یا پھر مول کو مَول یا مول پڑھتے ہیں تو وہ بلا وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے آوازوں کا ایک پورا نظام ہے جسے ذرا سی کوشش سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک مثال اور لیجیے۔ مصّوتوں کے معاملے میں آپ نے دیکھا کہ اردو میں آوازیں زیادہ ہیں۔ علامتیں کم۔ لیکن مصّوتوں کا حال اس کے برعکس ہے۔ ان میں بعض آوازیں ایسی ہیں کہ ان کے لیے دو دو نہیں بلکہ تین چار علامتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر (h) کے لیے ہ اور ح (t) کے لیے ت اور ط (s) کے لیے س، ث اور ص، یا پھر (z) کے لیے ذ، ز، ظ، اور ض موجود ہیں۔ یہاں یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اردو میں ان علامتوں کو باقی رکھنا کیوں ضروری ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اردو میں حرف کی اندھی غلامی کو قبول کرتے ہوئے بعض اوقات جو اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ اردو میں ذ، ز، ظ، ض الگ الگ آوازیں ہیں تو اس کا جواب صرف یہی ہے کہ ایسا سمجھنا دن کو رات کہنے پر اصرار کرنا ہے۔ اگر تابع، طابع، ثواب، صواب، یا زن، ظن

جوڑوں میں ایک لفظ کے معنی دوسرے سے مختلف ہیں۔ یعنی ت اور ط، ث، اور ص، یاز اور ظ
آوازیں معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں تو اردو میں ایسا از روئے قانون نہیں بلکہ از روئے اصل
ہے۔ اصل سے یہاں مراد ان الفاظ کی اصل زبان سے ہے۔ اردو میں یہ مستعار الفاظ ہیں۔ ان
کی اصل زبان میں ث اور ص یاز اور ظ میں فرق ہے۔ اس لیے یہ آوازیں وہاں معنی کی تفریق میں
مدد دیتی ہیں۔ اگر اردو میں معنی کا فرق قائم رہا۔ تو وہ اس لیے کہ یہ فرق اصل زبان سے چلا آتا ہے۔
اس لیے نہیں کہ اردو میں بھی ث، ص، یاز ظ الگ الگ آوازیں ہیں۔ یہ بات صوت کی بنیادی
اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد ہی کہی جاسکتی ہے کہ حرف کی سطح پر کچھ قبول کرنا ایک چیز ہے اور صوتی
سطح پر کچھ قبول کرنا دوسری۔ اردو نے ایک چیز لے لی ہے، دوسری کو رد کر دیا ہے۔ لسانیات کے
عقیدے کی آنکھ نہیں ہے۔ نہ ہی اس کے پاس جذبے کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ سائنس ہے اور اس کا
کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔ اردو میں اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم ماضی کے بوجھ سے
نڈھال ہیں۔ ماضی کا شعور بہت اچھی چیز ہے لیکن اگر یہ پاؤں کی زنجیر بن جائے تو ترقی کی راہیں
مسدود ہوسکتی ہیں۔ لسانیات قدر (Value) سے نہیں واقعہ (Fact) سے بحث کرتی ہے۔ روایت
کے غبار کو ہٹاتی ہے۔ اور زبان کے عناصر کو جیسے وہ ہیں خود انھیں کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

اردو میں علامتوں ہی کو زبان سمجھنے کی ایک دل چسپ مثال اس صوتی خصوصیت کی ہے
جسے ہم ہمزہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آتی ہے۔ کہ اُٹھیے، کیجیے،
چاہیے، لیے، دیے وغیرہ الفاظ کو ہمزہ سے لکھتے ہیں، سو سب آنکھیں بند کیے اسی لکیر کو پیٹتے چلے
جارہے ہیں۔ ابتدائی اسکولوں کا کیا ذکر ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے لوگ یہ سوچنے
کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمزہ آخر استعمال کس لیے کیا جاتا ہے؟ اردو کے صوتیاتی نظام میں وہ
کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم اس علامت کو استعمال کرتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ عربی میں ہمزہ
کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جبکہ اردو میں یہ مصمتہ نہیں۔ یہ دو مصوتوں کے جوڑ کو ظاہر کرتا ہے جیسے
گئی میں a اور i کا جوڑ یا کوئی میں o اور i کا جوڑ (لیکن o اور A کے جوڑ کے لیے ہمزہ استعمال
نہیں ہوتا، مثلاً ہونا کی ماضی ہوا کو ہمزہ سے لکھنے کا چلن نہیں۔ دوسری طرف لیے، دیے، کیے،
وغیرہ الفاظ ہیں۔ جس میں عام لوگ تو کیا اردو کے بعض اچھے اچھے ادیب بھی لکھتے ہیں اور پیچھے دو

نقطے بھی لگا دیتے ہیں۔ اردو میں اس کا رواج اب ''غلط العام'' کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ہمارے ہاں اتنا سر کھپانے کی ضرورت کسے ہے کہ کیا لیے، دیے، کیے اور آئے، جائے، گئے میں درمیانی آواز ایک جیسی ہے یا اس میں کوئی فرق ہے! یہ مضمون اردو رسم الخط پر نہیں، ورنہ اس موضوع پر اظہار خیال کیا جاتا کہ اردو میں ہمزہ کی علامت گردن زنی ہے یا نہیں[1]۔

اس وقت جس بات پر زور دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ حرف وصوت کے باہمی رشتے سے بے توجہی کی جیسی مثالیں اردو میں پائی جاتی ہیں۔ کم زبانوں میں ملتی ہیں۔ اس میں عام پڑھنے والوں کا کیا قصور۔ جب خود پڑھانے والوں کو خبر نہیں کہ جس علامت کو وہ استعمال کرتے ہیں، اسے کیوں استعمال کرتے ہیں۔ لسانیات زبان میں رسم ورواج یا روایت کے خلاف جہاد کا نام نہیں، لیکن اس لحاظ سے یہ بُت شکن ضرور ہے کہ یہ زبان کے پڑھنے اور پڑھانے والے کو ایک نئی نظر اور نیاذ ہن دیتی ہے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ زبان کی تعلیم کے نقطۂ نظر سے ہم صرف چند باتوں کو لیں گے، ایک یہ کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے اور صوت حرف پر مقدم ہے۔ اس کی طرف کچھ اشارے کیے گئے۔ دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ Language has a system یعنی زبان ایک نظام رکھتی ہے۔ یہ نظام زبان کی ہر سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے زبان کی تین سطحوں یعنی Hierarchies کو تسلیم کیا ہے۔ ایک phonology یعنی صوتیات، دوسری morphology یعنی لفظیات اور تیسری syntax یعنی جملے کی سطح ہے۔ زبان کے نظام کی کارفرمائی اِن سب سطحوں پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اب ہم صرف syntax یعنی جملے کو لیں گے۔ لیکن اس سے پہلے دو ضمنی باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلے یہ کہ جدید لسانیات اِس بات پر زور دیتی ہے کہ جملے کی نحوی صحت (Grammaticalness) کا کوئی تعلق معنی (Meaning) سے نہیں ہے۔ یہ بحث خاصی پیچیدہ ہے۔ لیکن اسے مختصراً ان دو جملوں کی مدد سے سمجھایا جا سکتا ہے۔

بے رنگ سُرخ پہاڑ بے تحاشا ناچتے ہیں۔

بے ناچتے رنگ پہاڑ تحاشا بے ہیں سُرخ۔

---

[1] اس مسئلے پر ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون ''ہمزہ کیوں'' مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ، 1، 8 اور 15 رمئی 1967۔ یہ مضمون حصہ اول حرف وصوت میں بھی شامل ہے۔ (دلوی)

بظاہر یہ دونوں جملے بے معنی ہیں۔ لیکن اردو جاننے والا کوئی بھی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ پہلا جملہ نحوی طور پر صحیح یعنی Grammatical ہے اور دوسرا غلط ہے۔ یعنی Ungrammatical۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان کا ڈھانچہ (Structure) معنی سے الگ اپنی آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی وہی بحث زیادہ صحیح ہوگی جو معنی سے آزاد ہو کر کی جائے گی۔

دوسرے یہ کہ جس طرح گرامر اور معنویات (Semantics) زبان کے اندر دو الگ الگ سطحیں (Hierarchies) ہیں۔ اسی طرح گرامر اور اسٹائل یعنی اسلوب بھی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زبان میں الفاظ کس طرح بنتے ہیں اور وہ کس ترتیب سے جملے میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ گرامر ہے۔ اور ہزاروں الفاظ میں سے کن کو لیا جائے اور انھیں کس موقع کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ اسٹائل ہے۔ اسٹائل میں گرامر کی پابندی ہے ورنہ جملہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ جبکہ گرامر میں اسٹائل کا عمل دخل نہیں۔ گرامر کا تعلق زبان کے نظام سے ہے جبکہ اسٹائل نام ہے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنی پسند، اپنے ذوق اور اپنی تخلیقی حس کے ثبوت دینے کا۔ اردو میں یہ فرق پوری طرح نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی تہذیبی اور سماجی وجوہ ہیں۔ یعنی ہماری زبان نے شاعری کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ جس سماج میں پروان چڑھی تھی۔ وہ شعر میں خط لکھتا اور قصائد پڑھتا تھا۔ ہمارے یہاں روایت رہی ہے کہ شاعری ادب ہے اور ادب زبان ہے۔ علمی اردو نثر کی عمر تقریباً ڈیڑھ صدی سے کم نہیں۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہمارے ہاں افسانے کی زبان، ناول اور ڈرامے کی زبان، اور تو اور ہماری تنقید اور تحقیق کی زبان بھی شعر کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکی۔ ہمارے نثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی شعر کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتی۔ اور محض رنگینی بیان ہی کو اچھی نثر سمجھتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں زبان اور اسٹائل کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ ہمارا ادیب زبان پر قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اسٹائل کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ اکثر و بیشتر اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا میدان یا موضوع کیسی نثر کا تقاضا کرتا ہے لیکن وہ اسٹائل اُڑانے یا اپنانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ نتیجہ ژولیدگی بیان ہے اور تضییع اوقات۔ یوں اس کی ذمہ داری ہمارے ابتدائی نصاب پر ہے۔ اردو کے ابتدائی انتخابات اُٹھا کر دیکھ جایئے۔ زیادہ تر اقتباسات ایسے ملیں گے جن کو محض اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ ان کی نثر حسین ہے۔ حسین نثر اور اچھی نثر میں

جوفرق ہے اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے انتخابات نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں زبان کو زبان کی حیثیت سے یا نثر کو اچھی نثر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔

اس وضاحت کے بعد سب سے پہلے مروجہ گرامروں کو لیجیے، جنھیں لسانیات کی اصطلاح میں روایتی گرامرس (traditional grammars) کہا جاتا ہے، ان گرامروں میں زبان کے نظام کو جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ایسی گرامروں کا ایک بنا بنایا فریم پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اور جس زبان کی گرامر لکھی جانی مقصود ہو۔ اس کو اسی فریم میں فٹ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا دار و مدار بعض تصورات (Concepts) پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جملہ الفاظ کے ایسے مجموعے کا نام ہے جس سے بات پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔'' (مولوی عبدالحق اردو، صرف ونحو ص 107) اس تعریف سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ''بات'' سے کیا مراد ہے۔ جواب میں کہا جائے گا وہ چیز جو ''ایک جملے'' میں بیان ہو یعنی جملے کی تعریف بات کی تعریف کے بغیر ممکن نہیں اور بات کی تعریف بغیر جملے کی تعریف کے ممکن نہیں۔ اس سے دلیل کی تدویر (circularity) ظاہر ہے جو منطق میں قابل قبول نہیں۔ ایسی تعریفیں (Definations) کبھی جامع و مانع نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر ابھی ابھی کہے گئے جملے کو لے لیجیے۔ یہ لفظ ''ایسی'' سے شروع ہوا ہے۔ ظاہر ہے ''ایسی'' کا ربط معنوی اس پیراگراف میں کسی دوسرے جملے یا جملوں سے ہے۔ گویا جو بات اس جملے میں کہی گئی ہے وہ ''پورے طور پر'' تبھی سمجھ میں آئے گی جب اس سے پہلے کا جملہ یا جملے بھی پڑھے جائیں۔ چنانچہ اگر مندرجہ بالا تعریف کو صحیح مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس مضمون میں ایک جملے یا پیراگراف کا دوسرے جملے یا پیراگراف سے کوئی معنوی ربط نہیں ہے۔

یا پھر فعل کی تعریف لیجیے۔ ''فعل وہ ہے کہ جس سے کسی شے کا ہونا یا کرنا ظاہر ہوتا ہے۔'' (مولوی عبدالحق اردو، صرف ونحو، ص 44) اگر یہ صحیح ہے تو پھر رفتار، چال، اُٹھان، آوارگی، اُچھل کود، وغیرہ الفاظ کو بھی فعل قرار دینا ہوگا کیونکہ ان میں بھی تو کسی شے کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

یا پھر صفت کی تعریف دیکھیے۔ ''صفت وہ (الفاظ) ہیں جو کسی کی حالت یا کیفیت یا کمیت ظاہر کریں۔'' (مولوی عبدالحق اردو صرف ونحو۔ ص۔ 27) اس تعریف کی رو سے ''خالی گھر''

میں خالی صفت ہے اور گھر اسم۔ اسی طرح ڈاک گھر میں پہلا لفظ صفت ہے اور دوسرا اسم۔ لیکن وجدانی طور پر ہم محسوس کرتے ہیں کہ دونوں ترکیبوں کی ساخت میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ یعنی خالی گھر، اُجاڑ گھر، نیا گھر تو ایک طرح کی ترکیبیں ہیں۔ اور ڈاک گھر دوسری طرح کی۔ مگر مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں ان سب میں پہلا لفظ، اسم کی حالت یا کیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ''صفت کا یہ تصور زبان کے ڈھانچے سے پورا انصاف نہیں کر سکتا۔ روایتی گرامروں کی اصطلاح میں ترکیب (ڈاک گھر) کے بارے میں یہ پوچھنا کہ اس میں لفظ ڈاک اسم ہے یا صفت ایسے ہی ہوگا جیسے پوچھا جائے کہ فلاں جلسے میں لوگ کتنے تھے اور مرد اور عورتیں کتنی؟

پرانے انداز کی روایتی گرامروں پر لسانیات کی دنیا میں ایک مدت سے اعتراضات کیے جا رہے ہیں۔ جن ماہرین نے جملے کے تجزیے کے نئے طریقے و نظریے پیش کیے ہیں ان میں Lems Hokett' Harris' Wells, Block pike کے کام کی بڑی اہمیت ہے لیکن حال ہی میں Massachusetts institute of technology (جو ہاورڈ یونیورسٹی کا پڑوسی ادارہ ہے اور دنیا بھر میں سائنسی ریسرچ کے لیے مشہور ہے) کے لسانیات کے پروفیسر Noamchomsky نے Frans formational grammer یعنی تشکیلی گرامر کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اُس سے لسانیات کی دُنیا میں انقلاب سا آ گیا ہے۔ چاسکی اپنے سے پہلے کے ماہرین لسانیات کی دُنیا کو مجموعی طور پر phrase structure grammers کا نام دیتا ہے۔ چاسکی کو ان گرامروں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ Structure یعنی لسانی ڈھانچے کی صرف ظاہری سطح پر کام کر سکتی ہے۔ اس کی اندرونی پیچیدگی کا ساتھ دینا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے برعکس چاسکی جملوں کی ساخت کے اندرونی باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے بعض واضح اور آسان (Trans formational Rules) یعنی تشکیلی قوانین کو استعمال کرتا ہے جن کی بنیاد علامتی منطق (Symbolic logic) پر رکھی گئی ہے۔

چاسکی کے نزدیک جملے دو طرح کے ہوتے ہیں kernel یعنی اصل اور Derived یعنی ماخوذ۔ سادے بیانیہ جملوں کو وہ kernel جملے کہتا ہے اور باقی سب کو ان سے ماخوذ بتاتا ہے kernal جملوں کا تجزیہ وہ phrase structure rules یعنی ترکیبی قوانین کی

مدد سے یعنی $x \longleftrightarrow y$
(x کو دوبارہ لکھو y)
سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ kernal جملہ لیجئے

وہ لڑکا نئی کتاب پڑھتا ہے۔

$x \longrightarrow y$ کی رو سے اس کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جملے میں نحوی تقسیم کی پہلی لکیر لڑکا اور کتاب کے درمیان کھینچی جائے گی، گویا

$1.S \longrightarrow NP + VP$

$2.NP \longrightarrow M + N$

$3.VP \longrightarrow NP + V$

$4.M \longrightarrow$ وغیرہ ایک، نئی، وہ

$5.N \longrightarrow$ وغیرہ بکر، زید، عمر، کتاب، لڑکا

$6.V \longrightarrow$ وغیرہ لکھتا ہے، دیکھتا ہے، پڑھتا ہے

اس تجزیے کو زیادہ واضح طور پر اس خاکے کی مدد سے پیش کیا جاسکتا ہے۔
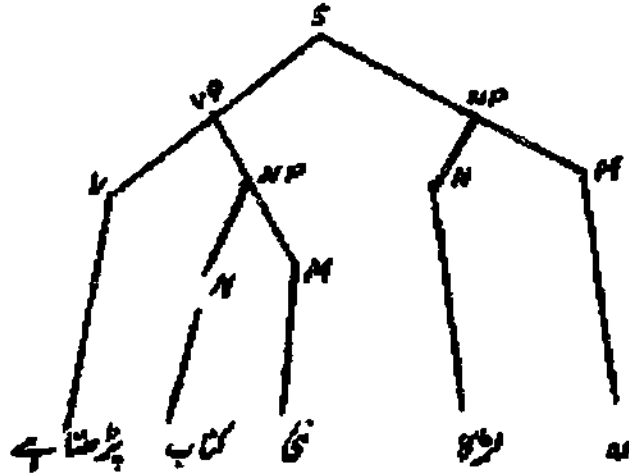
اب ان Phrase structure Rules کی مدد سے ان گنت kernal جملے وضع کیے

جاسکتے ہیں (اتنی بات واضح رہے کہ زبان میں جملوں کی ساخت (Structure) کے انداز (patterns) متعین ہیں۔ لیکن ان میں جو جملے وضع کیے جاسکتے ہیں، ان کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے (اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں جملوں کی تعداد ان گنت ہے کیونکہ زبان میں طویل جملہ کوئی نہیں) سادہ جملوں کی حد تک ترکیبی قوانین Phrase structure rules نہایت کامیاب ہیں لیکن اگر ماخوذ (Derived) جملوں کا تجزیہ بھی ان کی مدد سے کیا جائے تو گرامر کا کام سنبھلے گا۔ ان کے لیے چامسکی نے (transformational Rules) یعنی تشکیلی قوانین کا نیا تصور پیش کیا ہے جن کی مدد سے kernel جملوں کے اجزا کو گھٹایا بڑھایا یا تبدیل کیا جاسکتا ہے مثلاً اگر W+X+A اور W+Y+A دو جملے ہوں اور Y ان جملوں کے باہم مختلف لیکن ماخذ کے اعتبار سے ایک جیسے اجزا ہوں، تو مندرجہ ذیل طریقے سے ایک نیا جملہ وضع ہو سکتا ہے۔

$$W - Y + \text{اور} + X - A \leftarrow W - Y - A + W - X - A$$

فرض کیجیے وہ دو جملے یوں تھے:

1۔زید۔۔انگریزی۔۔پڑھ سکتا ہے $(W + X + A)$

2۔زید۔۔عربی۔۔پڑھ سکتا ہے $(W + Y + A)$

اب مندرجہ بالا تشکیلی قانون (T.Rule) کی مدد سے تیسرا جملہ یوں بن سکتا ہے۔

3۔زید۔۔انگریزی اور عربی۔۔۔پڑھ سکتا ہے $(W - Y + \text{اور} + X - A)$

اسی طرح منفی، غیر منفی اور سوالیہ، غیر سوالیہ جملوں میں جو اندرونی ربط ہے اسے بھی تشکیلی قوانین کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ kernel جملہ لیجیے لڑکی نے آئس کریم کھائی۔

فرض کیجیے کہ ہم اس کے اجزاء کو Z+Y+X سے ظاہر کریں گے۔ اب اس سے ہاں یا نہیں کے جواب والا سوالیہ جملہ وضع کرنا ہے جو ''کیا'' کے اضافے سے بنتا ہے۔ اگر ''کیا'' کو A فرض کرلیا جائے تو سیدھا سا تشکیلی قانون یوں ہوگا:

$$Z + Y + X + A \longleftarrow 2 + Y + X$$

لڑکی نے + آئس کریم + کھائی ۔۔۔کیا+ لڑکی نے + آئس کریم + کھائی غرض اس قانون سے ہزاروں ماخوذ جملے وضع کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن کیا آم نے آئس کریم کھائی یا کیا پتھروں نے حلوہ کھالیا وغیرہ ماخوذ جملے ناممکن ہیں۔ کیونکہ اردو میں " آم نے آئس کریم کھائی۔" یا "پتھروں نے حلوہ کھالیا" وغیرہ اصل جملوں کا وجود نہیں۔

غرض زبان کا تجزیہ Trans formational theory (تشکیلی نظریے) کی مدد سے نہایت منطقی طور پر اور پوری سائنسی صحت سے کیا جاسکتا ہے۔ بعض نہایت ابتدائی اور بنیادی تشکیلی قوانین کی مثالیں اوپر پیش کی گئیں۔ اس طرح کی گرامر پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوسکتا ہے کہ جب یہ تیار ہوگی تو اچھا خاصا الجبرا معلوم ہوگی جسے پڑھتے ہوئے سر چکرائے گا اور ذہن پریشان ہوجائے گا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ریاضی اور فلکیات کے اعلیٰ مسائل کی طرح زبانوں کے پیچیدہ تجزیاتی مسائل بھی بغیر برقیاتی کمپیوٹر (Electronic computer) کی مدد سے حل نہیں ہوسکتے اور تشکیلی گرامر ہی وہ گرامر ہے جو برقیاتی ذہن کا ساتھ دے سکتی ہے اور جو مستقبل کی ضرورتوں کو پورا کرسکے گی۔

اردو چونکہ دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے، اس کے تمام قوانین بھی اسی انداز پر مرتب ہوں گے، تیر کے نشان کو جو Rewrite یعنی "دوبارہ لکھو" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الٹا لگانا ہوگا۔ اس کے علاوہ بہ مقابلہ انگریزی کے اردو میں چونکہ فعل کی تذکیر وتانیث ہے اور اس کی واحد اور جمع بھی وسیع پیمانے پر زبان کے ڈھانچے کو متاثر کرتی ہے، اس میں کئی لازمی اور کئی اختیاری ترکیبی قوانین وضع کرنے ہوں گے۔ علاوہ ازیں اردو کی فعلیہ ترکیبیں بھی تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ ان سب کو سمیٹنا ناممکن نہیں لیکن ان کا احاطہ کرنے کے لیے بڑی محنت اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوگی۔

چامسکی کے نظریے کی رو سے تشکیلی گرامر کے تین حصے ہوں گے۔ پہلا ترکیبی قوانین (P.s.rules) کے لیے وقف ہوگا۔ دوسرے میں تمام تشکیلی قوانین (T.rules) درج کیے جائیں گے اور تیسرے میں phonalogical یعنی صوتیات اور morphol ogical یعنی لفظیات سے متعلق قوانین ہوں گے۔ بلوم فیلڈ کے زمانے کی لسانیات میں گرامر کی بحث آواز سے شروع کی جاتی تھی اور جملے پر ختم ہوتی تھی۔ چامسکی کے ہاں اس کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ یعنی اب زبان کی بحث s یعنی جملے سے شروع ہوا کرے گی اور آوازوں پر ختم ہوگی۔

تشکیلی گرامر کا نظریہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ لیکن زبان کے اسکالروں کو ایک بار تو اس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دور مشین اور ترقیاتی ذہن کا دور ہے۔ لسانیاتی تجزیہ اب صرف ماہر لسانیات کے تصرف میں نہیں رہا۔ بلکہ ریاضی داں، منطق داں اور طبیعیات، برقیات اور رسمیات کے ماہرین بھی اس میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان تمام شعبوں میں trans formational theory (تشکیلی نظریے) پر آج کل خوب بحث ہو رہی ہے۔ اس کی روشنی میں بعض زبانوں کے تجزیے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں اس کی تکمیل سے زبردست فائدے حاصل ہوں گے۔ اس کے امکانات کا تصور یوں کیا جاسکتا ہے کہ زبان کے پیچیدہ نظام کو تھوڑے سے قوانین میں پوری جامعیت اور قطعیت کے ساتھ سمیٹا جاسکتا ہے۔ یہ قوانین اس انداز سے مرتب کیے جائیں گے کہ Electronic computer یعنی برقیاتی ذہن کو ہضم کرائے جاسکیں۔ جن کی بدولت علامتیں الفاظ میں ڈھلیں گی اور الفاظ خود بخود آوازوں میں تبدیل ہوتے جائیں گے۔ آخر میں انھیں مشین ٹائپ کرکے پیش کردے گی۔ اس سے مشینی ترجمہ کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا یعنی زبانوں کے کامیاب تجزیے کے بعد انگلی کے ایک اشارے سے ایک زبان کے جملے خود بخود دوسری زبان کے ہم معنی جملوں میں ڈھلنے لگیں گے۔ یہ سوچنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کے بعد زبانوں کی الگ الگ حد بندیاں کس قدر حقیر معلوم ہوں گی اور لسانی سطح پر ہم آہنگی کے امکانات کس قدر بڑھ جائیں گے اور خود ہندوستان میں علاقائی زبانوں کی الگ الگ دیواریں کتنی بے معنی نظر آنے لگیں گی۔ شاید یہ منزل بہت دور ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ مستقبل کا سینہ امید کی روشنی سے بھرا ہوا ہے۔ لسانیات میں روز بروز معلومات کے نئے اُفق سامنے آرہے ہیں۔ لسانیات کی دنیا تجربے کی دنیا ہے۔ اس سے زبان کے مطالعے میں بیش بہا مدد لی جاسکتی ہے، جس کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اگر اُردو جدید دور کے تقاضے کو پورا کرنا چاہتی ہے تو اسے لسانیات سے ضرور استفادہ کرنا ہوگا۔ آخر میں اتنی بات پھر کہہ دی جائے کہ جس تشکیلی گرامر یا مشینی ذہن کا ابھی ذکر کیا گیا وہ محض Grammatical جملے وضع کرے گا۔ اسٹائل یا شعر نہیں "لکھے گا" گویا ہمیں اپنے انشا پردازوں اور شاعروں کی ضرورت برابر محسوس ہوتی رہے گی۔

زبان اور تہذیب

انسان کی زندگی میں زبان کو وہ عمومیت حاصل ہے کہ انسانی آبادی کا بہت بڑا حصہ کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کرتا کہ زبان کا اس کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا سے کیا اور کتنا گہرا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کے بغیر تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو جس قدر اپنے تہذیبی ورثے کا احساس ہوتا جا رہا ہے اسی قدر زبان سے ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس دلچسپی کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ کیونکہ زبان کا مسئلہ کسی نہ کسی حیثیت سے ہر شعبۂ حیات سے اور اس وجہ سے اکثر عوام سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہم انسان کا تصور بغیر زبان کے کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں جانور اور انسان میں امتیاز کرنا مشکل معلوم ہوگا۔ دونوں میں جو چند مابہ الامتیاز چیزیں ہیں ان میں زبان کو غالباً سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ سماجی ارتقا میں اس نے ایک جذباتی مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ انسان کی مادی ضرورت اور ابتدائی ذہنی ارتقا کا نتیجہ بھی ہے اور ترقی کی نئی راہیں کھولنے کا ذریعہ بھی۔ اس کی مدد سے وہ تجربے کی نئی منزل میں داخل ہوا اور نئے تجربوں کو مقید کرنے کی صلاحیت بھی اس میں پیدا ہوئی۔ اس طرح زبان کی ایجاد انسان کا سب سے قیمتی حربہ بن گئی اور اس نے اپنے تجربات اور تصورات، خیالات اور محسوسات کو دوسروں تک منتقل کرنا شروع کر دیا۔ خیالات خیالوں کے مقابل آئے، تجربے تجربوں

سے ٹکرائے محسوسات اور مبہم تصورات کے متعلق تبادلۂ خیال ہوا۔ ایک دوسرے کے درد سے شناسائی ہوئی۔ دوسرے کی خوشی میں شریک ہوا۔ اس طرح معلومات کے خزانے جمع ہونے لگے اور جذبات کے اشتراک کا پتہ چلنے لگا۔

جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان نے اپنی ابتدائی زندگی ہی میں قوتِ گویائی سے کام لینا شروع کر دیا ہوگا۔ وہاں یہ بتانا تقریباً ناممکن ہے کہ اس نے بولنا کس طرح شروع کیا ہوگا۔ اس کے متعلق جو نظریے پیش کیے گئے ہیں وہ ادھوری صداقتوں کے حامل ہیں۔ ان سے یقینی طور پر اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ زبان کی ابتدا کس طرح ہوئی لیکن اتنا سمجھنے کے لیے کسی مخصوص علم کی ضرورت نہیں ہے کہ زبان انسان کی اجتماعی زندگی میں تنظیم پیدا ہونے کا نتیجہ ہے۔ زبان ایک شخص کی نہیں ہوتی کسی سماجی گروہ کی ہوتی ہے۔ وہ قبیلہ ہو، کوئی جغرافیائی خطہ ہو، قوم یا ملک ہو اور اس کی یہی حیثیت اسے تہذیبی ارتقا کا آلہ بناتی ہے کیونکہ تہذیب بھی انفرادی نہیں ہوتی، کسی نہ کسی شکل میں جماعتی یا اجتماعی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زبان اور خیال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان کی ضرورت نہ ہوتی اگر انسان کے پاس کچھ کہنے کو نہ ہوتا اور بغیر زبان کے سوچنا یا قوتِ متخیلہ سے کام لینا بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ یہاں زبان کا تصور بولی میں محدود نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ ساری علامتیں ہیں جن میں خیالوں کو باہم مربوط کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ منطق اور نفسیات کے علما نے اس موضوع پر بڑی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی ہے کہ لفظ سے معنی اور معنی سے اس کے صوتی اظہار کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور خاص کر اس وقت تو الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جب اس کا مقصد ترسیل اور ابلاغ بھی ہو۔ اسی وجہ سے زبان کو اظہارِ خیال کا آلہ قرار دیا ہے۔ زبان خیال کا ظاہر ہے اور خیال زبان کا باطن۔ لیکن اگر ہم زبان کا محض اتنا ہی مقصد سمجھتے ہوں کہ یہ اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے تو یہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اظہارِ خیال کے اور بھی ذریعے ہیں جن سے انسان کام لیتا رہا ہے۔ گو وہ اتنے ہمہ گیر اور مفید نہیں ہیں، جتنا زبان۔ اصل یہ ہے کہ زبان صرف اظہارِ خیال ہی کا نہیں مربوط اور منظم غور و فکر کا بھی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگرچہ بعض فلسفیوں اور خاص کر اطالوی فلسفی کروچے کا کہنا ہے کہ جیسے ہی ذہن میں اس کی ہیئت عکس پذیر

ہوتی ہے ویسے ہی خیال کی تکمیل ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک الفاظ میں قید نہ کرلیا جائے خیال کی واضح اور یقینی شکل ہمارے سامنے نہیں آتی۔ خیال پر پوری قدرت زبان ہی کے ذریعے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ عام گفتگو بھی الفاظ کے صحیح اور مناسب استعمال کی کیا قیمت ہوتی ہے اور الفاظ کے بے محل اور نامناسب استعمال سے کتنی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے اور کتنا انتشار وجود میں آتا ہے۔ سیاسی معاہدوں میں اور قانونی اہمیت رکھنے والی دستاویزوں میں ایک ایک لفظ کتنی اہمیت رکھتا ہے اس کے واضح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شعر و ادب میں مناسب الفاظ کی تلاش معنویت میں کس طرح گہرائی اور حسن پیدا کرتی ہے۔ اس سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جو الفاظ کے لغوی، جذباتی اور علامتی مفاہیم سے آگاہ ہیں اور ان کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس طرح لفظ اور معنی کا تعلق خیال اور اظہار خیال کے ذریعے پیچیدہ بنتا ہے۔ لیکن جب اس پیچیدگی پر قابو حاصل کرلیا جاتا ہے تو انسانی شعور کا افق وسیع تر ہو جاتا ہے۔

زبان کی ضرورت اس قدر عام ہے کہ اکثریت اس پر غور ہی نہیں کرتی کہ اس سے زندگی کا خلا کہاں کہاں پُر ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سا بھی غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا واسطہ زبان سے نہ ہو۔ کچھ علما نے زبان کے دو کام قرار دیے ہیں۔ ایک سماجی دوسرا جذباتی (یعنی انفرادی) اس تقسیم سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں کام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ زبان کا جذباتی اظہار جو شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلتا ہے ایک منزل پر وہ بھی سماجی نوعیت اختیار کرلیتا ہے۔ اس لیے ان کی یہ بنیادی نوعیت انفرادی نہیں ہوسکتی۔

جب یہ بات ہر طرح سے روشن ہو جاتی ہے کہ زبان ایک سماجی عمل ہے تو ہم بڑی آسانی سے سماج اور اس کے مختلف مظاہر سے زبان کے ہر تعلق کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ سماجی نشو ونما مختلف اداروں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ یہ ادارے تعلیمی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی بقا کے لیے زبان سے کام لینا پڑتا ہے۔ تعلیم کا سارا نظام، سیاست کے سارے ہتھکنڈے، مذہب کی ساری اشاعت، تہذیب کی ساری بقا زبان ہی پر منحصر ہے۔ اس

سے تہذیب کے نقش ونگار محفوظ رہتے ہیں اور وسیع تر بھی ہوتے ہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے محکوم بنالیتی ہے۔ جب ایک ملک کا سیاسی وقار دوسرے ملک کو متاثر کرتا ہے۔ جب زوال کے عہد میں ایک گروہ کا اقتدار تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اُس وقت تہذیبی قدروں کا احساس ہی قومی زندگی کا محافظ بنتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے نمایاں کام زبان کرتی ہے کیونکہ وہی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے اور تہذیبی اقدار کی مظہر بن جاتی ہے اس میں قوم کے تمام افراد شریک ہوتے ہیں۔ یا اگر وسیع ملک ہے اور اس میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں تو ہر خطے کے لوگ اپنی اپنی زبان کو قومی زبان قرار دیتے ہیں وہ نہ صرف اسے محفوظ رکھنے اور دوسری زبانوں کے برے اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کے دائرے کو وسیع تر بنانے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس کے مواقع برابر فراہم کرتی رہتی ہے کہ ایک زبان اپنے دائرے کو وسیع تر بناتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی وجوہ سے اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس جگہ اگر چند اہم زبانوں سے تاریخی مثالیں پیش کی جائیں تو بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔ لیکن مثالیں پیش کرنے سے قبل ایک اور حقیقت کا انکشاف ضروری ہے۔ دنیا بہت پرانی ہے اور اس کے سینے پر بسنے والے انسان بھی بہت پرانے ہیں۔ لیکن ان کی زبانوں کے متعلق ہماری معلومات چار ہزار سال قبل مسیح سے کسی طرح آگے نہیں بڑھتیں۔ یعنی زبانوں کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس کی مدت زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال کی ہے۔ یہ مدت بھی کچھ قیاسات پر مبنی ہے۔ کیونکہ زبانوں کے لکھے ہوئے نمونے جن کی مدد سے ہم قدیم زبانوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ جن لکھاوٹوں اور رسم خطوں میں ملے ہیں ابھی مکمل طور پر انھیں پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ دنیا کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ مدت کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے اس لیے جب زبانوں کی قدامت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا دائرہ بہت دور تک نہیں پہنچتا۔ اب اگر انسانی تہذیب کے متعلق ہماری معلومات کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی یقین کی حد سے زیادہ آگے نہیں بڑھتا۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر زبان اور تہذیب کے تعلق پر غور کرنا چاہیے۔ آریہ قوم جو سن عیسوی سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے وسط ایشیا میں بستی تھی۔ آہستہ آہستہ مختلف گروہوں میں

تقسیم ہو کر مختلف علاقوں میں پہنچی۔ اس کا ایک گروہ ڈینوب کو پار کرتا ہوا جنوبی یورپ میں بس گیا۔ جہاں اس نے یونانی قوم کی حیثیت سے ترقی کی۔ اس کا دوسرا گروہ ایران کے مسطح میدانوں میں آباد ہو گیا۔ ان دونوں علاقوں کی قدیم تاریخیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی زبانوں کا تسلسل برقرار ہے۔ ان کی ترقی کی داستانیں کم و بیش محفوظ ہیں۔ اس لیے ہم بڑی آسانی سے ان کے تعلق کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ آریہ قوم کا وہ ٹکڑا جو ایران میں آباد ہوا تھا کچھ دنوں کے بعد منتشر ہوا اور اس کے مختلف قبائل اپنی تہذیب، زبان اور دوسری خصوصیات کے ساتھ کوہ ہندوکش کو پار کر کے ہندوستان پہنچے۔ ایران کی ایرانی کچھ ہی دنوں میں یہاں سنسکرت بن گئی لیکن اس کا لسانی رشتہ اپنے ماخذ سے برقرار رہا۔ تاریخ نے پلٹے کھائے یونان کے آریوں نے اپنی ضروریات کے مطابق اپنی زندگی ایک سانچے میں ڈھالی۔ ایرانیوں نے دوسرے میں اور ہندآریوں نے تیسرے میں لیکن جو شخص بھی یونانی، قدیم ایرانی اور قدیم سنسکرت سے واقف ہے وہ ان تین مختلف علاقوں میں جو لسانی رشتہ قائم ہے۔ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کے عہد قدیم میں جب قومی تہذیبیں وجود میں آئی تھیں اور انسان دورِ وحشت سے دورِ تہذیب میں داخل ہو رہا تھا۔ ان تینوں علاقوں میں الگ الگ قومی تہذیبیں وجود میں آئیں اور انھوں نے الگ الگ بعد کی تاریخ کو متاثر کیا۔

یونانی زبان اور تہذیب کے اثرات کن وجوہ سے اور کس کس طرح یورپ میں اور پھر یورپی تہذیب اور علوم کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلے۔ اس کی کہانی بہت طویل ہے۔ لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ قدیم یونانی تہذیب کے بعض پہلو رومن تہذیب میں منتقل ہوئے۔ رومن تہذیب سے مسیحی تہذیب کا جزو بنے اور چوتھی پانچویں صدی عیسوی میں تقریباً دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن آٹھ نو صدیاں گزرنے کے بعد اس کی بازیافت نے یونانی فکر و فن کو پھر زندہ کیا اور اس دفعہ اس کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا جس کے تاریخی اسباب ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ یورپ کی اور یورپ سے متاثر ہونے والی زبانوں کو اگر کھنگالا جائے تو معلوم ہوگا کہ یونانی تہذیب کی برتری کی وجہ سے یونانی زبان کس طرح دوسری زبانوں کو متاثر کرتی رہی۔

یہی حال فارسی کا ہے۔ اس زبان پر زبان کی حیثیت سے سب سے براوقت اس گھڑی آیا جب عربوں نے ایران پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ محض ایک سیاسی تسلط نہیں تھا بلکہ ایران کی قومی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کیونکہ بہت تھوڑی مدت میں پورے ایران نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ عربی زبان اپنی ساخت کے اعتبار سے فارسی سے مختلف تھی لیکن اس نے فارسی کو متاثر کیا۔ اس عربی نے بعض دوسرے علاقوں کو صرف متاثر ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہاں کی عام زبان بن گئی تھی۔ اس وقت ان اسباب کے تلاش کرنے کا موقع نہیں ہے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیبی ارتقا کی مختلف منزلوں میں ہونے کی وجہ سے زبانوں کے متاثر کرنے اور متاثر ہونے کا عمل یکساں طور پر نہیں ہوتا۔ چنانچہ فارسی جو ایک ترقی یافتہ تہذیب کی زبان تھی عربی کا اثر قبول کرکے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ یہی نہیں ہوا بلکہ عربی کو ایک مذہبی مقام دے کر فارسی عام اسلامی ممالک کی تہذیبی زبان بن گئی۔ ہندوستان میں جو مسلمان آئے وہ ترک، مغل، تاتاری، افغانی، ماوراء النہری، ایرانی، ہر قوم اور قبیلے کے تھے۔ لیکن بہت دنوں تک ہندوستان میں ان کی مشترکہ تہذیبی زبان فارسی ہی رہی اور چونکہ وہ سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ اس لیے یہاں کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کرتی رہی۔ مرہٹی، بنگالی، ہندوستانی اور گجراتی میں فارسی الفاظ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

تہذیبی اثرات کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ زبان کس طرح اپنا دائرہ وسیع کرتی جاتی ہے اس کی ایک مثال انگریزی زبان ہے۔ فتوحات، تجارتی تعلقات آبادکاری کے سلسلے سے انگریزی نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں غیر معمولی عروج حاصل کیا۔ یہاں تک کہ اسے آج تک ایک عالمی اور بین الاقوامی علمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے پردے میں مغربی تہذیب کے ان اثرات کی تاریخ بھی کارفرما ہے جسے ہم جدید سائنسی تہذیب کہتے ہیں۔ سولھویں صدی میں انگریزوں کی بڑی تعداد امریکہ پہنچی اور آباد ہوگئی۔ ایسا ہی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ ہوا۔ ان تینوں مقامات کی اصل آبادی غیر مہذب اور کمزور ہونے کی وجہ سے دبتی اور سکڑتی گئی اور عام تہذیبی ارتقا کے دھارے سے اتنی الگ تھلگ رہی کہ اس کا وجود عدم کا ہم

پلہ رہا اور امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں انگریزی زبان اور تہذیب نے مکمل تسلط حاصل کرلیا۔ زبان کے ذریعے سے کبھی کبھی ملاوٹ اور آمیزش کا عمل بھی ہوتا ہے۔ امریکہ میں بسنے والے فرانسیسی، جرمن، پول، ہسپانوی بھی تھے جہاں ان کی اکثریت برقرار نہ رہ سکی وہاں وہ انگریزی میں مدغم ہو گئے۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان اور تہذیب کا رشتہ بڑی گہری معنویت رکھتا ہے۔ دونوں میں جبر اور زبردستی کے بجائے ترغیب اور ضرورت کا عمل کارفرما ہو کر اس رشتہ کو مضبوط کرتا ہے۔ آج کل ماہر لسانیات زبان کے اس پہلو پر زیادہ زور دے رہے ہیں کہ انسان کے اعضا، خاص کر حلق، تالو، زبان، دانت اور ہونٹ کس طرح زبان اور اس کی آوازوں کی شکل متعین کرتے ہیں۔ یقیناً علمی زبان کے مطالعہ کے لیے یہ بات ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ الفاظ نے کس طرح انسانی دلوں اور دماغوں کو خاص قسم کے تہذیبی سانچوں میں ڈھالا ہے اور زبان میں اس کی کتنی قوت ہے کہ وہ ان کی زندگی کو استوار پائدار اور ترقی پذیر بنا سکے۔ عام آدمی کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہوتا کہ (ب)، (چ)، (غ)، یا (ف) کی آواز جب نکلتی ہے تو اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے۔ زبان کس حالت میں ہوتی ہے۔ تالو سے چھو جاتی ہے یا نہیں۔ ہونٹ بند رہتے ہیں یا کھلتے ہیں۔ آواز جھٹکے کے ساتھ نکلتی ہے یا نرمی سے، لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ جب ایک خاص لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کیا ہوتا ہے اور سننے والا اس لفظ سے وہی بات سمجھ رہا ہے یا نہیں جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ اس لیے اپنے روزمرہ کے استعمال کے لحاظ سے زبان کے یہ پہلو کہ اس سے کاروبار حیات استوار ہوتا ہے۔ سماج کے مخصوص گروہ میں اشتراک خیال و عمل پیدا ہوتا ہے۔ خیالوں اور تجربوں میں جان آتی ہے اور انسان اپنے کو پہچانتا ہے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ ان ہی وجوں سے زبان زندگی میں ایک گہرا بلند مقام حاصل کر لیتی ہے اور کوئی انسان اس بات پر رضامند نہیں ہوتا کہ وہ تہذیبی اقدار جن سے وہ پہچانا جاتا ہے، جن کے ذریعے سے وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے، اس سے چھین لی جائیں۔

سیاست کسی رخ پر جائے، لیکن تاریخ تمدن میں زبان کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بھی

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ عمل ساکن اور جامد نہیں ہوتا بلکہ تغیر پذیر اور ترقی پذیر ہوتا ہے اور انسانی ضروریات اور خواہشات کا تابع ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی زبانوں اور تہذیبوں میں نہ تبدیلی ہوتی نہ ترقی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زبانیں اور تہذیبیں دونوں کچھ چیزیں قبول کرتی اور کچھ چھوڑتی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنی ضروریات کے مطابق زندگی کی ہر منزل میں انسان کا ساتھ دینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔ جو شخص بھی زبان اور تہذیب کا الگ الگ یا ملا کر مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ زبان تہذیب کا تحفظ بھی کرتی ہے اور اس کی اشاعت میں بھی معین ہوتی ہے۔

اُردو کے لیے علمی اصطلاحات کا مسئلہ

اصطلاح کی ضرورت ایسی نہیں ہے جس سے لوگ آگاہ نہ ہوں۔ اگر اصطلاحیں نہ ہوتیں تو ہم علمی مطالب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ لکھنے والے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے سے حافظے پر زور پڑتا ہے۔ سہولت اسی میں ہے کہ ہر اصطلاح سے جو معنی مطلوب ہیں وہ تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے جائیں۔ مگر ایسا کرنے میں یہی دقت ہے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اور کاغذ کا صرفہ جدا ہوتا ہے۔ حافظہ پر بار پڑنے کی شکایت جو ان حضرات نے کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی علم یا فن کو سیکھنا چاہتا ہے بس اسی علم اور فن کی اصطلاحیں اسے یاد کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے یہ باز پرس نہیں کی جاتی کہ وہ تمام علوم و فنون کی اصطلاحیں کیوں نہیں جانتا۔ یورپ میں بھی جہاں تعلیم عام اور جبری ہے، کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو دنیا بھر کے

علوم وفنون کی اصطلاحیں از بر رکھتا ہو۔ ہر صاحب فن اپنے فن کی اصطلاحات اور اس فن کی معلومات سے آگاہ ہوتا ہے۔

اصطلاحات ہی پر کیا موقوف ہے، اگر آپ عام زبان پر غور کریں تو ہر لفظ ایک آوازی اشارہ ہے، جو خیالات کے ایک بڑے مجموعے کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ لفظوں کے بنانے کی ضرورت ہی اس بنا پر پیش آتی ہے کہ خیالات کے مجموعوں کو بول چال میں بار بار دہرانا پڑے تاکہ بولنے اور سننے والے کا وقت ضائع نہ ہو اور ایک شخص کا مافی الضمیر دوسرے شخص کے دل میں آسانی سے اتر جائے۔

ان آوازی اشاروں سے جن کے مجموعے کا نام زبان ہے۔ بلاشبہ حافظہ پر کس قدر بار پڑتا ہے مگر یہ تھوڑی تکلیف اس بڑی تکلیف سے بچنے کے لیے گوارا کی گئی ہے جو اعضائی اشاروں سے کام لینے میں برداشت کرنی پڑتی تھی۔ جب زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی تو آوازوں کی جگہ اعضائی اشاروں سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے دل کا مطلب دوسرے شخص کو سمجھانے کے لیے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتا تھا۔ یہ اشارے عجیب وغریب اور مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ پالن ایشیا کے جزائر میں بعض وحشی قومیں اب بھی موجود ہیں جو آوازوں کی جگہ ایسے اشاروں سے کام لیتی ہیں۔ بات چیت کرنے کے وقت ان سے عجیب وغریب حرکات ظہور میں آتی ہیں۔ جن جزائر کی وحشی قوموں میں کچھ آوازیں پیدا ہوگئی ہیں ان میں اشاروں کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ آوازوں یا لفظوں کی ترقی سے اعضائی اشارات بتدریج کم ہوتے گئے ہیں۔ جن قوموں کی زبان میں نسبتہً الفاظ زیادہ ہیں، وہ بمقابلہ ان قوموں کے جن کی زبان میں لفظوں کی کمی ہے، اعضائی اشارات کا استعمال بہت کم کرتی ہیں۔ چونکہ آوازی اشاروں میں اعضائی اشاروں کے نسبتہً بہت کم تکلیف ہے اس لیے الفاظ کی تعداد زبانوں میں رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ہے اور ان کے یاد رکھنے کی کوشش برابر ہوتی رہی ہے اس کا انجام یہ ہوا کہ الفاظ کے یاد رکھنے میں حافظہ پر جو بار پڑتا تھا وہ بھی متواتر یاد کرنے کی مشق سے کم ہوتا گیا اور خود حافظے بھی قوی ہوتے گئے۔ چنانچہ مورخوں نے بیان کیا ہے کہ دنیا کی وہ قدیم قومیں جو سنسکرت، لاطینی، یونانی اور عربی زبان بولتی تھیں ان کے حافظے بمقابلہ دیگر ہم عصر اقوام کے نہایت قوی تھے۔ یہ وہ زبانیں ہیں جن میں الفاظ کی تعداد بمقابلہ دیگر قدیم زبانوں کے بہت زیادہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ اس لیے ایجاد کیے گئے تھے کہ اعضائی اشاروں میں جو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اس سے بچیں۔ الفاظ کے یاد رکھنے میں بے شک حافظے پر زور پڑتا تھا مگر یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے کم تھی۔ اس لیے خوشی سے برداشت کی گئی۔ پھر لفظوں کے یاد رکھنے کی متواتر کوشش سے حافظہ کا بار بھی کم ہو گیا اور اس مشاقی سے خود حافظہ طاقتور ہو گیا۔ پس لفظوں کی افزائش سے حافظہ پر بار پڑنے کی شکایت کسی طرح معقول نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے بہت ہی کم ہے جو لفظوں کے نہ ہونے کی صورت میں ہم کو برداشت کرنی پڑتی۔ دوسرے موجودہ صورت میں خود حافظہ کی مشق اور اس کی تقویت متصور ہے۔

اس کے علاوہ ہم کو ایک اہم بات پر بھی غور کرنا چاہیے۔ الفاظ معلومات پر دلالت کرتے ہیں اور الفاظ کی بہتات معلومات کی بہتات پر دلالت کرتی ہے پس جس قوم کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے اس کی معلومات کا دائرہ بھی بمقابلہ اس قوم کے جس کی زبان میں الفاظ کی قلت ہے نہایت وسیع ہوگا۔ اس بنا پر پہلی قوم بمقابلہ دوسری قوم کے لازمی طور پر زیادہ مہذب ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حضرات الفاظ کی افزائش کے شاکی ہیں اور حافظے پر بار پڑنے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ گویا اپنی قوم کو تہذیب و تمدن سے بھگاتے اور وحشت و بربریت کی طرف گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ ابنائے جنس کی ترقی کو بلندی سے نیچے اتار کر تنزل کے غار میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں، ان حضرات کو سوچنا اور سمجھنا چاہیے کہ زندگی اور تمدن کی ضرورت ہی الفاظ کو عدم سے وجود میں لاتی ہے۔ گاؤں میں تمدن کی ضروریات بہت کم ہیں۔ اس لیے گاؤں کے رہنے والے کم وبیش دو سو الفاظ سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ مگر جب ان کو شہروں میں آنا پڑتا ہے اور شہریوں سے معاملہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ضرورتاً ان کے الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور اب تین چار سو الفاظ کے بغیر ان کا کام نہیں چلتا۔ گاؤں والوں کی نسبت شہر والوں کی ضروریات زندگی زیادہ ہیں اس لیے ان کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے اور گاؤں والوں کی زبان کو شہر والوں کی زبان سے کچھ نسبت نہیں۔ پھر بڑے شہروں دارالسلطنتوں، تجارتی منڈیوں، صنعتی کارخانوں، علمی مرکزوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی ضروریات تمدنی اور بھی زیادہ ہیں۔ ان کو لازمی طور پر الفاظ کا ذخیرہ اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا

پڑتا ہے۔ اگر یہ لوگ معترض حضرات کی طرح اپنے حافظے پر بار ڈالنا نہ چاہیں تو ان کو چاہیے کہ ان بڑے تمدنی مرکزوں سے بھاگیں اور عام شہروں میں زندگی بسر کریں۔ پھر اگر عام شہری باشندے حافظے پر بار ڈالنے سے بچنا چاہیں تو ان کو لازم ہے کہ وہ دیہات میں جا کر آباد ہوں۔ اسی طرح اگر دیہات کے باشندوں کے دماغ دو، تین سو الفاظ کے بوجھ کا بھی تحمل نہ کر سکیں تو پھر ان کے لیے پالن ایشیا کے جزیروں میں سکوت اختیار کرنا موزوں ہوگا جہاں آوازی اشاروں یعنی الفاظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر شائستہ اور مہذب قوموں کی صف میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم علوم وفنون حاصل کرنا زندگی کا اہم مقصد جانتے ہیں تو زبان میں جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافہ سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ ترقی کے لیے اس بوجھ کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

وضع اصطلاحات کے خلاف ایک نئی رائے:۔

بعض بزرگوار ہیں جو وضع اصطلاحات کی ضرورت تو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اصطلاح سازی کے خلاف ایک نئی رائے رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو الفاظ پہلے بن چکے اور پھیل کر مقبول ہو چکے ہیں، ان کے بنانے والوں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک صرف ایسے ہی الفاظ زبان میں داخل ہونے اور تسلیم کیے جانے کی قابلیت رکھتے ہیں جن کے وضع کرنے والوں کے نام معلوم نہ ہوں۔ اگر کوئی خاص آدمی کوئی نیا لفظ وضع کرے تو وہ لفظ زبان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ بزرگوار ذرا بھی تامل فرماتے تو یہ بات ان کے ذہنوں پر منکشف ہو جاتی کہ ہر زبان میں جو الفاظ بنائے جاتے ہیں ان کے بنانے کے وقت تمام قوم ایک جگہ مجتمع ہو کر ان الفاظ کو وضع نہیں کرتی۔ اول کوئی خاص آدمی کسی خاص لفظ کو وضع کرتا اور اس کو استعمال کرتا ہے۔ پھر اگر وہ لفظ اس معنی پر صاف اور روشن طور سے دلالت کرتا ہے جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہے اور قواعد زبان کے خلاف بھی نہیں ہے تو اور لوگ بھی رفتہ رفتہ اس کو قبول کر کے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ شخص واضع کی شخصیت سے عام لوگوں کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اس لیے عموماً اس کی شخصیت فراموش کر دی جاتی ہے اور کسی کو یاد نہیں رہتا کہ اس لفظ کو کس شخص نے اول وضع کیا تھا۔ عام لوگوں کی نظر صرف اس

ضرورت پر رہتی ہے جس کے لیے لفظ بنایا جاتا ہے۔ اگر وہ ضرورت لفظ موضوع سے پوری نہ ہوئی ہو اور وہ لفظ آسانی سے زبان پر نہ چلتا ہو تو اس کے رد کرنے میں دیر نہیں ہوتی۔ وہ یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ لفظ کا بنانے والا کون ہے اور اس تحقیقات کی ضرورت ان کو کبھی پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے عام الفاظ کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے اور جن کے وضع کرنے والوں کے نام بھی معلوم ہو سکتے ہیں اگر یہ بزرگوار ذرا سی تکلیف برداشت کریں اور ویبسٹر ڈکشنری کو ملاحظہ فرمائیں تو انگریزی زبان کے علمی الفاظ کی بہت سی ایسی مثالیں ان کو معلوم ہو جائیں گی۔ آج یورپ کے علما میں کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو ان علمی الفاظ کو جن کی تاریخ اور جن کے واضعوں کے نام معلوم ہیں قبول نہ کرتا ہو اور محض اس بنیاد پر رد کر دیتا ہو کہ ان کی تاریخ مجہول نہیں ہے۔

اردو زبان کو مسخ کرنے کی تجویز:۔

ان عجیب و غریب خیال رکھنے والے بزرگواروں سے جو اصطلاحات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں مگر اصطلاح سازی کے مخالف ہیں، پوچھا جاتا ہے کہ اصطلاحات کی ضرورت تو مسلم ہے مگر جدید الفاظ کا بنانا آپ کے نزدیک ممنوع ہے تو پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کی تدبیر کیا کی جائے؟ اس کا جواب حضرات مذکور یہ دیتے ہیں کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات قبول کر لینی چاہیے۔ پھر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے الفاظ ایسے کرخت اور ثقیل ہیں کہ ہماری زبانوں پر آسانی سے رواں نہیں ہو سکتے تو اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ تم ان الفاظ کو بازاریوں اور جاہلوں کے سامنے بولو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ ان الفاظ کو دہرائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ الفاظ مذکور کو بجنسہ نہیں بول سکتے پس ضرور ہے کہ ان میں تغیر و تبدل کریں اور ان کو اپنی زبان کی خراد پر چڑھائیں پھر جو تلفظ ان الفاظ کا وہ کریں ان کو سن کر محفوظ کر لو اور سمجھو کہ انگریزی زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کرنے کا یہی موزوں اور مناسب طریقہ ہے۔

اس موقع پر اگر میں یہ کہوں کہ یہ بزرگوار زبان کا صحیح ذوق نہیں رکھتے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ان بزرگواروں کو جاننا چاہیے کہ انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر اور جاہلوں کی زبان کو خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کر لیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خد و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔

ان حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر مہذب اور شائستہ زبان میں ایسے الفاظ جو اجنبی زبانوں سے لہجہ یا تلفظ کی تبدیلی یا حروف کی کمی بیشی کے ساتھ لیے جاتے ہیں بمقابلہ اس زبان کے اصلی الفاظ کے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس متمدن قوم کی زبان ان الفاظ کی کثرت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش وخراش کیوں نہ کی جائے، ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے۔ ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دے جائیں تو ان کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیا میٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے جن کے الفاظ کا کوئی جز گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلے میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے جرم کے مرتکب ہوں گے۔

وضع اصطلاحات کے متعلق عام فیصلہ:۔

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن کی اس جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق رکھنے والے لوگ شامل تھے یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کر دیا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلے میں اردو علمی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ اس بنا پر ان حضرات کے خیالات جو اصطلاح سازی کے مخالف ہیں اب زیادہ قابل توجہ اور لائق بحث نہیں رہے۔

اصطلاح سازی کے دو بڑے گروہ:۔

اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد یہ مہتم بالشان ضرورت پیش آتی ہے کہ اگر ہم اصطلاحیں بنائیں تو کس اصول کے مطابق بنائیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر اصطلاح سازوں کے دو بڑے گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اصطلاحی الفاظ عربی زبان سے بنانے چاہیے۔ دوسرے گروہ کی یہ رائے ہے کہ

اصطلاحات کے وضع کرنے میں ان تمام زبانوں کے لفظوں سے کام لینا چاہیے جو اردو زبان میں بطور عنصر کے شامل ہیں (یعنی عربی، فارسی، ہندی) اور ان لفظوں کی ترکیب میں اردو گرامر سے مدد لینی چاہیے۔

گروہ اول کے دلائل:۔

پہلا گروہ اپنے نظریے کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتا ہے (اول) عربی زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور اس سبب سے وہ تمام مسلمان قومیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ اس زبان سے یکساں طور پر مانوس ہیں۔ اگر اس زبان کے الفاظ سے اسی زبان کے قواعد کے مطابق علمی اصطلاحیں بنائی گئیں تو دنیا کے تمام مسلمان ان کو آسانی اور دلچسپی کے ساتھ قبول کرلیں گے اور جس طرح یورپ کی علمی زبان تمام ممالک یورپ کے لیے ایک بین قومی زبان ہے اسی طرح ہماری علمی زبان بھی تمام بلاد اسلامیہ کے لیے ایک بین الاقوامی زبان ہوگی۔ (دوم) عربی زبان پہلے سے علمی زبان ہے۔ مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے جو انھوں نے زمانۂ سابق میں سرانجام دیے تھے، اس زبان میں جمع ہیں۔ اگر جدید علمی اصطلاحیں بھی اس زبان کے الفاظ سے اور اسی زبان کے قواعد کے مطابق وضع کیے جائیں تو اس میں کافی قابلیت اس امر کی موجود ہے۔

پہلی دلیل بلاشبہ نہایت موثر اور مسلمانوں کے جذبات کو کھینچنے والی ہے۔ عربی زبان میں مذہبی تعلیم رائج ہونے کے سبب ہر ایک مسلمان قوم اور ہر ایک اسلامی ملک میں اس زبان کے جاننے والے موجود ہیں۔ محض اس لحاظ سے عربی زبان میں تمام مسلمان قوموں کی مشترک مذہبی زبان ہونے کی قابلیت بے شک موجود ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ زبان تمام مسلمانانِ عالم کی مشترک علمی زبان بھی بن سکے تو ہماری خوش قسمتی میں کوئی شبہ نہیں تھا اور اس صورت میں تمام علوم و فنون نہایت آسانی اور سہولت کے ساتھ مسلمانوں کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو سکتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔

لاطینی اور یونانی وہ علمی زبانیں ہیں جن کے لفظوں اور ترکیبوں سے اہل یورپ نے علمی اصطلاحات بنائی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں مگر عربی زبان اس

خاندان کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سامی خاندان سے ہے۔ آریائی اور سامی خاندانوں میں الفاظ کے بنانے کے جدا جدا قاعدے ہیں۔ آریائی خاندان کی زبانوں میں مرکب الفاظ بنانے اور ان الفاظ سے پھر نئے الفاظ مشق کرنے کے خاص قاعدے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی ضرورت علمی اصطلاحات میں پیش آتی ہے۔ سامی زبانوں میں یہ قاعدے نہیں ہیں اس لیے مرکب الفاظ اور ان کے مشتقات کو معرب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ یونانی زبان سے عربی زبان میں علمی کتابیں ترجمہ کی گئیں، علمی ذخیرہ بہت کم تھا اور مرکب الفاظ کی تعداد بہت کم تھی، تاہم ہزاروں الفاظ معرب کیے گئے اور اسی پر قناعت کر لی گئی۔ آج کل علوم کی تعداد یورپ میں بہت بڑھ گئی ہے اور ہر علم سے بہت سی شاخیں اور ان شاخوں سے بہت سی کونپلیں نکل آئی ہیں۔ اس تمام ذخیرے میں مرکب الفاظ اور ان کے مشتقات کی بھرمار اس قدر ہے کہ عربی زبان میں نہ تو یہ قابلیت ہے کہ ان سب کے مقابلے میں ویسے ہی الفاظ بنا سکے اور نہ اس کی فصاحت اس کا تحمل کر سکتی ہے کہ ایسے تمام الفاظ کو معرب کر کے داخلِ زبان کر لیا جائے۔

عربی زبان کی قدرتی بناوٹ پر غور کرنے والا آسانی سے اس نکتہ کو سمجھ جائے گا کہ اس زبان میں مفرد مادے تو کثرت سے ہیں مگر ترکیب کے لحاظ سے اس میں وہ لچک نہیں ہے جو یورپ کے علوم و فنون کو ان زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے کافی ہو۔ مصری اور شامی اور خود عرب ہماری نسبت اپنی زبان کے رموز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اسی وجہ سے کوئی ضابطہ وضع اصطلاحات کا قائم نہ کر سکے۔ اور عملاً یہ فیصلہ انھوں نے کر دیا کہ عربی زبان یورپ کی جدید علمی اصطلاحات کے مقابلے میں ویسی ہی علمی اصطلاحات بنانے کی قوت نہیں رکھتی اب ہم کو اس بات کی توقع رکھنے کا کیا حق ہے کہ اصطلاح سازی میں تنہا اس زبان کے الفاظ اور اس کے قواعد اشتقاق کافی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ لچک عربی زبان میں موجود ہوتی تو عربی زبان بولنے والے نہایت آسانی سے وضع اصطلاحات میں پیش قدمی کرتے۔

پہلی دلیل میں جو مثال لاطینی اور یونانی کی دی گئی ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ لاطینی اور یونانی وہ زبانیں ہیں جو یورپ کی تمام زبانوں کا سرچشمہ ہیں۔ یونانی اور

لاطینی کے بے شمار مادے یورپ کی زبانوں میں ادل بدل کر شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی بات یہ ہے کہ یورپ کی زبانوں اور لاطینی و یونانی زبان کی کمپیریٹو گرامر (نحو بالتقابلہ) ایک ہے۔ اس لیے یہ تمام زبانیں آریائی خاندان کی ذیل میں داخل کی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے ایران، افغانستان، ترکستان، چین، روس اور ملایا کے مسلمان جو فارسی، پشتو، چینی، ترکی، روسی اور ملائی زبانیں بولتے ہیں وہ اس خاندان السنہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں جس میں عربی زبان شامل ہے۔ ان زبانوں کی بناوٹ عربی زبان کی بناوٹ سے بالکل مختلف ہے اور عربی کی گرامر ان زبانوں کی گرامر سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ اس بنا پر جس طرح یونانی اور لاطینی تمام یورپ کے لیے ایک بین قومی علمی زبان بن گئی ہے اس طرح عربی زبان تمام بلاد اسلامیہ کے لیے مشترک علمی زبان نہیں بن سکتی، عراق، شام، عرب، مصر اور شمالی افریقہ میں البتہ عربی زبان یا اس سے نکلی ہوئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ صرف ان ملکوں کے لیے عربی زبان ایک مشترک علمی زبان بن سکتی ہے۔

دوسری دلیل میں جو اس بات کا اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانہ سابق میں علوم کی اصطلاحیں عربی سے لی گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ مگر ہمارے بزرگوں کا ایسا کرنا ایک خاص وجہ پر مبنی تھا اور اب وہ وجہ نہیں پائی جاتی۔ یونانی زبان سے علوم کا ترجمہ عربی زبان میں اس قوم نے کیا جو عربی ہی زبان میں بولتی اور تعلیم و تعلّم کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کے بعد جب یہ علوم ایران اور ہندوستان وغیرہ ملکوں میں آئے تو ذریعۂ تعلیم پھر بھی عربی زبان رہی۔ چنانچہ ہمارے عربی مدارس میں اب تک بھی یہی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ اس لحاظ سے تمام علمی اصطلاحات کا عربی زبان میں ہونا اور ان کا اس زبان کی ساخت اور گرامر کے مطابق ہونا ضروری اور مناسب تھا۔ مگر اب ہم اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا رہے ہیں اور اسی زبان میں یورپ کے تمام علوم و فنون کو منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جو نئی علمی اصطلاحات وضع کی جائیں وہ اردو زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق ہوں۔

غرضیکہ دونوں دلیلیں جو گروہ اوّل کے نظریہ کی حمایت میں پیش کی گئی ہیں وہ اگرچہ دل خوش کن ضرور ہیں۔ مگر عملاً بے کار ہیں۔

گروہ ثانی کے دلائل:۔

دوسرے نظریہ کی تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بطور اختصار کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

1۔ کسی زبان کی ترقی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس زبان میں غیر زبانوں کے بیشار الفاظ بجنسہ یا بعد تصرف کے داخل کر لیے جائیں۔ زبان کی ترقی اسی حالت میں ترقی کہلا سکتی ہے جب کہ وہ اکثر الفاظ جو اس میں بڑھائے جائیں اس زبان کی قدرتی ساخت اور اس کی اصلی گرامر کے مطابق بنائے گئے ہوں اور ان الفاظ کے مادے ان زبانوں سے لیے گئے ہوں جو اس زبان کی بناوٹ اور ترکیب میں قدرتی طور پر داخل رکھتی ہوں۔ پس اردو زبان میں علمی اصطلاحات وضع کرنا اسی حالت میں اس زبان کی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے جب کہ اس اصول پر عمل کیا جائے۔

2۔ عربی زبان میں بلا شبہ مفرد مادوں کی افراط ہے اور اس لحاظ سے یہ زبان ایک اعلیٰ درجہ کی زبان ہے مگر جب کہ اردو زبان کے قدرتی عنصر عربی، فارسی اور ہندی زبانیں ہیں تو ان میں سے کسی ایک زبان پر قناعت کر لینا اپنے لیے تنگیِ دامن پیدا کرنا اور ترقی کے دائرہ کو محدود کر دینا ہے۔ ہمارے لیے آسانی اور سہولت اسی میں ہے کہ ہم جو نئے الفاظ بنائیں ان کے مادے تینوں زبانوں سے لیں اور اپنی زبان کی ترقی کی اسی طبعی رفتار پر آگے بڑھنے دیں جس پر کہ وہ آج تک چلتی اور آگے بڑھتی رہی ہے۔

3۔ اردو زبان ہندوستان کے مختلف گروہوں نے مل کر بنائی ہے اور فہم و تفہیم کی آسانی کے لیے ہر گروہ نے اپنی زبان کے الفاظ اس زبان میں شامل کیے ہیں اور اس طرح یہ زبان ان تمام گروہوں کے لیے ذریعہ فہم و تفہیم بن گئی ہے۔ اگر ہم کسی ایک گروہ کی زبان مثلاً عربی کے الفاظ اس میں کثرت سے شامل کریں تو دوسرے گروہوں کے لیے وہ ذریعۂ فہم و تفہیم نہیں رہے گی اور اس زبان کی اس خاص

قابلیت میں خلل آ جائے گا جس کے سبب وہ تمام ہندوستان کے لیے مشترک زبان بن گئی ہے۔

4۔ ہندوستان میں مدت دراز سے دو زبانیں ذریعۂ تعلیم رہیں۔ ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی، اسی سبب سے دو مختلف قسم کی علمی اصطلاحیں اب تک اس ملک میں مستعمل ہوتی رہی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنی تعلیمی کتابوں میں سنسکرت کی اصطلاحیں درج کی ہیں اور اپنی قوم کے طلبا کو انھیں اصطلاحوں میں تعلیم دی ہے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے تمام علمی اصطلاحیں عربی زبان سے ماخوذ کی ہیں اور ذریعۂ تعلیم انھیں اصطلاحوں کو قرار دیا ہے۔ مگر اب ہم اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر نہ تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ سنسکرت کی اصطلاحوں سے اپنی زبان کو بوجھل کریں اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کریں اور نہ اس بات کو مناسب سمجھتے ہیں کہ تنہا عربی سے تمام اصطلاحیں لے کر ہندوستان کے دوسرے گروہوں کے لیے اپنی زبان کو نامانوس اور اجنبی ہونے دیں۔ ہمارے نزدیک مناسب طریقہ یہ ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے میں ان تمام زبانوں سے کام لیا جائے جو اس زبان کی ترکیب میں طبعی طور پر شامل ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم میں آسانی اور سہولت پیدا ہوگی۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی اس کمیٹی نے جس میں دونوں گروہ کے اصحاب الرّ ائے موجود تھے کافی غور اور مباحثہ کے بعد کثرتِ رائے سے دوسرے گروہ کے اس نظریے کو پاس کر دیا ہے کہ اردو زبان میں جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں اس کے لیے الفاظ عربی، فارسی اور ہندی سے بے تکلف لیے جائیں۔ مگر الفاظ ترکیب دیتے وقت صرف اردو زبان کی گرامر کا لحاظ رکھنا چاہیے اور کسی زبان کی گرامر کا نہیں۔ ارباب کمیٹی نے اپنے اس فیصلے میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر علمی الفاظ کسی خاص زبان مثلاً عربی یا فارسی یا ہندی زبان سے اسی زبان کی گرامر کے مطابق بنائے جائیں گے تو وہ اردو زبان کے الفاظ نہ ہوں گے۔ بلکہ عربی، فارسی یا ہندی زبان کے الفاظ ہوں گے۔ کسی زبان کے الفاظ بھی اردو زبان کے الفاظ

کہلانے کے مستحق نہیں ہیں جب تک کہ ان پر اردو گرامر کا سکہ لگانے کی قابلیت نہ ہو یا ان پر اردو گرامر کا سکہ نہ لگا دیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ جدید الفاظ اردو زبان میں خود اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق بنائے جائیں نہ کہ اور کسی اجنبی زبان کی بناوٹ اور قواعد کے مطابق۔

اُردو میں تلفظ کا مسئلہ

زبان میں بول چال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے معیار کی تلاش میں ابتدائی مرحلہ تلفظ کے معیار کا تعین ہے۔ زبان کے مسائل بڑے نازک ہوتے ہیں اور زبان میں تلفظ کا مسئلہ ان مسائل میں نازک ترین مسئلہ ہے۔ تلفظ کے سلسلے میں عام طور سے یہ سنا جاتا ہے کہ زبان تلفظ کے معاملے میں دن بدن انحطاط پذیر ہے۔ اور اس کے تلفظ کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ لیکن معیاری تلفظ کیا ہے؟ تلفظ میں معیار کی تعبیر و تشریح کرنا مشکل ہے۔ ایڈاسی وارڈ کے الفاظ میں زبان میں ''معیاری تلفظ'' جیسی کوئی چیز نہیں تاہم ہر کوئی یہ بھی جانتا ہے۔ کہ ہم انگریزی، اردو، مراٹھی، گجراتی یا دیگر زبانوں کے تلفظ میں معیار سے کیا مراد لیتے ہیں۔ انگلستان میں انگریزی زبان کی تدریس کے سلسلے میں جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کی صراحت کے مطابق معیاری تلفظ وہ ہے جو بازاری اور علاقائی اثرات سے پاک ہو۔

(One free from vulgarism and provincialism)

انگریزی میں معیاری تلفظ کے معنی وہ تلفظ ہے جو تعلیم یافتہ حضرات میں عام ہے اور جسے ذمہ دار جماعت (Authoritative body) کی قبولیت عام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ انگلستان میں جو ایک لسانی (Monolingual) ملک ہے ایک ہی علاقہ

(Country) کے دو اشخاص کی زبان ایک ہی انداز میں پرورش پانے کے باوجود یکساں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو نسلوں کی صوتی عادتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ خود یہاں پر دو مختلف اضلاع کے تعلیم یافتہ حضرات کے تلفظ میں فرق پایا جاتا ہے۔ انگریزی ماہر صوتیات ایڈا سی وارڈ نے لکھا ہے کہ شمالی انگلستان کا باشندہ grass اور dance میں (a) اور (–) مصوتہ استعمال کرتا ہے۔ برخلاف اس کے جنوب میں (a) زیادہ مستعمل ہے۔ مغربی انگلستان میں معکوسی (Retro flex) (r) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً form اور پورٹ (port) وغیرہ میں۔ لیکن کئی علاقوں میں (ر) مطلق استعمال نہیں ہوتا۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات پال گاروِن (Pal garvin) معیار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"standard is a codified form of language accepted by and serving as a model to a larger speech community"۔

بلوم فیلڈ جس کی کتاب Language جدید لسانیات میں الکتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان میں معیار کے بارے میں لکھتا ہے:

" The standard language is most definite and best observed in its written form, the literary language. The next step is popular education: children are taught in schools to write and possibly to speak in the form of the standard language."

میں زبان اور تلفظ میں معیار کو ایک تخمینی (approximate) لیبل سمجھتا ہوں اس قسم کے مسائل منطقی قیل وقال سے حل نہیں ہوتے اور دشواری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب یہ اور اسی قسم کے دیگر مسائل میں ہم ریاضی کی قطعیت تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ہماری زبان میں معیاری تلفظ کا مسئلہ دراصل اسی قطعیت کی تلاش کا مسئلہ ہے۔ اس قسم کے مسائل حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جدید لسانی قواعد کے پیش نظر اپنی زبان کا سائنسی تجزیہ کریں۔ اس کے اصوات کی صحیح تعداد متعین کریں۔ ہمارے طریقۂ تحریر (orthography) کی اصلاح بھی ضروری ہے کہ جس کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ میں عام طور سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اصلاح طریقۂ تحریر

(orthography) کی تحریک انجمن ترقی اردو کو اٹھانی چاہیے۔

زبان میں تلفظ کا مسئلہ جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں نازک ترین مسئلہ ہے۔ ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں جہاں بے شمار زبانیں اور بولیاں ہیں اور اردو ہمہ گیر زبان ہے، یہ مسئلہ بہت نازک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ مقامی بولیاں ہر علاقہ کے اردو بولنے والوں کے لہجہ پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ کلکتہ کی اردو بمبئی کی اردو، مدراس، سندھ اور پنجاب کی اردو صوتی عادتوں، لب ولہجہ، صرفی ونحوی خصوصیات اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے جہاں مقامی زبانوں کو متاثر کرتی رہی ہیں وہیں پر وہ مقامی بولیوں کے تابع بھی ہیں۔ ان حالات میں زبان کا معیار متعین کرنے اور اس کی صحیح تعلیم وتدریس کا انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔ جدید دور میں زبانوں کی تدریس کے سلسلے میں پرانا انداز فکر کہ صحیح تلفظ خود بخود آجاتا ہے (one can pick-up good pronuncition) بے تکی بات ثابت ہو چکا ہے زبان کا ایک اچھا معلم اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ زبان کی دیگر شاخوں، مثلاً قواعد، معنیات، کی طرح تلفظ بھی علمی (scientific) طریقے سے سیکھنا چاہیے۔ ہماری تلفظ کی مشق کی یہ کوششیں تلفظ میں معیار کے تخمینی لیبل تک پہنچنے میں ہماری مددگار ثابت ہوں گی ان کوششوں کے باوجود بھی ضروری نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ تلفظ میں مکمل طور پر ہم کسی معیار کو اپنالیں۔ معیار کے قریب قریب پہنچا جاسکتا ہے اسے پوری طرح پایا نہیں جاسکتا۔ علاقائی خصوصیات کا اثر کسی نہ کسی صورت سے ظاہر ہوتا رہے گا۔ بول چال کی زبان معیاری نہیں ہوتی اس لیے اسے colloquinal یا dialect کہا جاتا ہے۔ زبان بولی کے ضبط تحریر میں لانے کا نام ہے جہاں اسے معیار کی خراد پر کسا جاتا ہے۔ اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی، جرمن، فرانسیسی، عربی وغیرہ سب زبانیں علاقائی اعتبار سے الگ الگ بولیوں میں منقسم ہیں اور ضبط تحریر میں آنے کے بعد ان کا معیار متعین ہوا ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اردو کے اپنے لسانی ماحول میں علاقائی اثرات اس کے معیار پر اثر انداز ہوں گے۔ البتہ اگر زبان (vulger) یا (slang) ہو جائے تو یقیناً قابل گرفت ہے۔ صوتی اعتبار سے بول چال میں ''نوک پلک'' کی تلاش اور صحیح مخرج کی جستجو سے ہماری زبان کی ترقی رک سکتی ہے اور ہمارا یہ رویہ اردو کی تعلیم میں بددلی کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ فی زمانہ اردو زبان جن

نازک حالات سے دوچار ہے اس کے پیش نظر بھی ہمیں اپنے رویوں میں تبدیلی کرنی ہوگی۔ تلفظ کے سلسلے میں فی الوقت جو بھی ہمارے سوچنے سمجھنے کے طریقے ہیں وہ زیادہ تر جذباتی اور روایتی ہیں۔ ان پر سائنسی انداز سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

انگریزی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے لیکن بول چال کی حد تک علاقائی تلفظ اور لب ولہجہ کو نہ صرف برداشت کیا جاتا ہے بلکہ اس علاقائی فرق کے پیش نظر جو زبان کی مختلف بولیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اس قسم کے مطالعے انگریزی کے لسانیاتی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بولیوں کا فرق کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) کی اچھی مثال پیش کرتا ہے اور قومی ترقی میں اس کثرت میں وحدت (unity in Diversity) کی قابل قدر اہمیت ہے۔ خاص طور سے ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں لاتعداد زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہوں۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔ ہمارا تلفظ مقامی زبانوں کے تابع اور مادری زبانوں کی صوتی عادتوں (Phonetic habits) کے مطابق ہوتا ہے ہماری اردو میں اہل زبان اس سے بدکتے ہیں اور ثانوی حیثیت سے زبان حاصل کرنے والوں میں احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ اردو بولنے والوں کو ان جزوی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو بولنے والوں کی اس لسانی وحدت سے خوش ہونا چاہیے اور صحیح اور سائنسی تدریس کی کوشش کرنی چاہیے۔ تلفظ میں فرق کا یہ رجحان نئے نئے موضوعات بھی پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی لسانی خصوصیت اس کی ذولسانیت (Bilingualism) ہے۔ جو بڑے شہروں میں عام طور پر رائج ہے۔ اس سے مرہٹی اور اردو، گجراتی اور اردو، سندھی اور اردو، پنجابی اور اردو وغیرہ کے اختلاط زبان سے پیدا ہونے والے اثرات کا مطالعہ بھی ہوتا ہے۔ اور لسانی اعتبار سے ہم زیادہ روادار، وسیع القلب اور وسیع الذہن ہو جاتے ہیں۔ اردو ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر سارے ہندوستان میں لسانی معاملوں میں ہمارے ذہنوں میں افسوس ناک حد تک گرمی زیادہ اور روشنی کم ہے۔

مرہٹی ہندوستان کی زبانوں میں ادبی لحاظ سے ترقی یافتہ زبان ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ بھی متعدد بولیوں میں منقسم ہے اور ہر بولی اپنی خصوصیات کے لیے لسانی تجزیہ اور مطالعہ کا موضوع بن رہی ہے۔ دکن کالج پونا، اور بمبئی یونیورسٹی سے اس کی مختلف بولیوں کے مطالعہ کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ''ڈاکٹر گھاٹگے کی کتاب'''' کرناٹک کی کوکنی'' کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جسے حکومت مہاراشٹر نے شائع کیا ہے۔ تلفظ اور صرفی ونحوی خصوصیات کے لحاظ سے معیاری مرہٹی جو پونا میں بولی جاتی ہے اور ان بولیوں میں فرق ہے۔ اس قسم کے مطالعوں سے جو اہم کام لیا جاتا ہے وہ ان کے تقابلی مطالعہ سے ان کی اصل تک پہنچنے کی کوششیں ہیں۔ یہ تو مقامی بولیاں ہیں۔ زبانوں کی مقامی بولیوں کے علاوہ سماجی بولیاں (social dialects) اور ذاتی بولیاں (cast dialects) بھی ہوتی ہیں۔ ذاتی بولیاں مختلف ذاتوں سے مخصوص ہوتی ہیں۔ چنانچہ کولیوں کی مرہٹی، سناروا ڈول، پربھواور برہمن مرہٹی علاحدہ بولیاں ہیں۔ کولیوں کی بولی میں صفیری صوت ''س'' (s) (خ) (h) میں بدل جاتی ہے اور تالوئی 'چا، اور' چھا' سا، اور' شا، (sah) میں بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا ساہوکار (sahakar) 'ہاہوکار، (hahukar) اور چھتری (chatri) 'ستری، (satri) 'چور، (chor) 'سور (sour) ہو جاتے ہیں۔ اس طرح خود برہموں میں چتپاون برہموں، یجرویدی برہموں، یادکنی اور دیسی برہموں کی بولیوں میں بھی صوتی وصرفی ونحوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن کثرت میں وحدت کے پیش نظر ان اختلافات کو ان کے مخصوص حالات کے تابع سمجھتے ہوئے یہ سارے اختلافات لسانی مطالعوں کا موضوع ہیں۔ گجراتی زبان کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ خود بمبئی شہر میں گجراتی کی قریب پانچ بولیاں عام ہیں۔ مثلاً احمد آبادی گجراتی، سورتی گجراتی، پارسی گجراتی، بوہرہ گجراتی اور کچھی اور مارواڑی گجراتی۔ جن میں اول الذکر معیاری یا خالص (purest) گجراتی تسلیم کی جاتی ہے۔

اردو زبان کا بھی تقریباً یہی حال ہے اور مختلف حالات کے تحت اور مختلف ماحول میں زبان بولیوں میں تقسیم ہوتی رہی ہے۔ لیکن پونا کی مرہٹی اور احمد آباد کی گجراتی اور لندن (B.B.C) کی انگریزی جسے معیاری (R.P) (Received pronunciation) سمجھا جاتا ہے۔ اردو کے

لیے کون سی بولی کو معیاری سمجھا جائے۔ اگر دلی کی زبان کو معیاری زبان اور دلی کے تلفظ کو اردو کا R.P سمجھا جائے تو خود دلی کے تلفظ اور زبان میں بھی معیار نہیں ہے۔ دلی میں سادات، پنجابیوں، پٹھانوں اور کشمیریوں کی زبان میں اختلاف ہے۔ جس کی بنا پر انشاء اللہ خاں انشا نے ان بولیوں پر بھی سخت اعتراض کیے ہیں۔ دلّی کے مخصوص علاقوں کی بولیوں کے پیش نظر انشا نے ان علاقائی بولیوں کو "آدھا کتا اور آدھا ہرن" کہا ہے۔ بولیوں کے سلسلے میں یہ غیر روادارانہ برتاؤ اور مفرس اور معرّب اردو سے محبت کا جذبہ ناسخ اور ان کے معاصرین بحر، برق، قلق اور اسیر وغیرہ کے یہاں سب سے زیادہ اُبھرا ہوا ملتا ہے۔ قدما میں آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللغات" پر اپنی کتاب "نوادر الالفاظ" میں جو اعتراض کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ علاقائی خصوصیات کی تابع ہے اور اس لحاظ سے وہ زبان جو عبدالواسع نے پیش کی ہے جاہلوں کی زبان ہے۔ آرزو اسے "زبان جہال" کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ زبان اور بولیوں سے متعلق سوچنے سمجھنے کا یہ انداز رجب علی بیگ سرور اور ان کے معاصرین تک ہی نہیں بلکہ داغ تک ملتا ہے۔ جیسے دعویٰ ہے کہ جس نے دلی نہیں دیکھی وہ زبان داں نہیں ہو سکتا داغ کا شعر ہے۔

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی تو زباں داں یہ کہاں ہیں

زبان سے متعلق اس قسم کے سوچنے کا انداز چند ایک اور شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ تعلّی اور شاعری کے لحاظ سے تو اس قسم کے دعوے ٹھیک ہیں اور اگر داغ کا انداز سوچا سمجھا بھی رہا ہو تب بھی یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ اردو دلی سے زیادہ سے زیادہ یوپی کے اضلاع اور حیدرآباد تک محدود تھی یا جب اسے قلعۂ معلی کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کے حالات میں جبکہ اس نے ہندوستان گیر صورت اختیار کی ہے یا کم از کم جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو شرفا اور امرا کی محفلوں سے نکل کر عوام الناس کی زبان بنے اور شہری آبادی سے نکل کر دیہی علاقوں میں بھی مقبول ہو تلفظ اور زبان کا وہ انداز جیسے مذکورہ بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے خطرناک رجحان ہے۔ اس ضمن میں داغ اور اسی ذیل کے شعرا کو شاعر ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے انھیں ماہر لسانیات کا درجہ دینا صحیح نہیں ہوگا۔

جیسا کہ ماقبل السطور میں عرض کر چکا ہوں۔ دلی جو ہماری زبان کا مرکز ہے اس کا معیار بھی اختلافی رہا ہے۔ انشا نے دلی کے مختلف محلوں کی زبان پر اعتراض کیے ہیں۔ اور "ساقط المعیار" قرار دیا ہے۔ لیکن میر امن دلی ہی کی زبان کو معیار مانتے ہیں۔ چنانچہ "باغ و بہار" کے مقدمے میں دلی کی بربادی کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "ایکبارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں سینگ سمائے نکل گئے۔ جس ملک میں گئے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی گئے اور رہے وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزاریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں، سیر تماشہ اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

لیکن مرزا رجب علی بیگ سرور نے جو لکھنوی زبان بولتے تھے میر امن کی زبان کے معیاری ہونے پر اعتراض کیا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے الزام لگایا ہے کہ میر امن نے "دلی کے روڑے اٹکائے ہیں۔ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں"۔

تلفظ اور زبان کے اختلاف کی سب سے پہلی وجہ رسم الخط میں حروفِ علت کی غیر موجودگی ہے حروف کی مدد سے زبان کی صحیح تدریس کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری زبان میں زیر، زبر اور پیش جو مصوتوں کے قائم مقام ہیں۔ ہمیشہ زیر ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خواہ مادری زبان کا طالب علم ہو خواہ وہ اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے حاصل کر رہا ہو۔ اس زبان کے سیکھنے اور اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں لہٰذا تحریر میں اعراب کی نشاندہی ضروری ہے۔

تلفظ کے سلسلے میں اعراب (vowels) کی عدم موجودگی کی وجہ سے جو دقتیں پیش آتی ہیں اس سلسلے میں عام طور سے عربی و فارسی کی مثالیں دی جاتی ہیں کہ ان زبانوں میں اعراب کی پابندی کے بغیر کیونکر تلفظ کی صحت قائم رہتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عربی و فارسی میں بھی اعراب کی غیر موجودگی کی وجہ سے تلفظ میں وہی دقتیں پیدا ہوتی ہیں جن سے اردو والے دو چار ہیں۔ عام روایت کی بنا پر مورخین ابوالاسود دوئلی کو عربی قواعد کا جامع قرار دیتے ہیں جو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں عربی کا مشہور عالم ہو گزرا ہے۔ اس سلسلے میں دو واقعات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک شخص کو حضرت عمر فاروقؓ کے پاس لائے جو کہ آیت کریمہ "ان اللہ بری من المشرکین و رسولہٗ" میں رسولہ، کے لام پر بجائے پیش کے زیر پڑھتا تھا جس کے معنی بالترتیب "بے شک اللہ اور رسول مشرکوں سے بری ہیں" کے بجائے بے شک اللہ مشرکوں اور اپنے رسول سے بری ہیں۔" کے نکلتے تھے۔ زیر اور پیش کے فرق سے معنی میں جو فرق پیدا ہو گیا وہ ظاہر ہے۔ اس شخص سے جب اس فرق کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ مدینہ میں کسی شخص نے اسے اسی طرح سکھایا ہے۔ اس واقعے کے بعد ابوالاسود دوئلی سے قواعد مرتب کرنے کے لیے کہا گیا۔

اس سلسلے کا دوسرا واقعہ خلیفہ ولید بن عبدالملک سے متعلق ہے کہ جسے اعراب کی غلطی کی وجہ سے سخت ندامت اٹھانی پڑی تھی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ کو کسی اعرابی سے مجمع میں گفتگو کرنی پڑی جو حسب ذیل ہے۔

اعرابی نے خلیفہ سے اپنے داماد کی شکایت کی۔ خلیفہ نے کہا "ماشانک" (تجھ میں کیا برائی ہے) اعرابی نے کہا "اعوذ باللہ من الشین (میں برائی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں) یہ حال دیکھ کر ولید کے بھائی سلیمان نے کہا۔ خلیفہ کہتے ہیں "ماشانک" (تیرا کیا حال ہے) اعرابی نے کہا "ظلم علی ختنی" (میرے داماد نے مجھ پر ظلم کیا ہے) ولید بن عبدالملک نے کہا "من ختنک" (تیری ختنہ کس نے کی ہے) اعرابی نے جواب دیا۔ کسی حجام نے کی ہوگی۔ سلیمان نے پھر تصحیح کر کے کہا۔ "من ختنک (تیرا داماد کون ہے) اس واقعہ سے بھی اعراب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو عربی میں بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے اردو رسم الخط میں۔ اور اگر بالفرض عربی اور فارسی کے تعلق سے یہ

مان بھی لیا جائے کہ تلفظ میں اعراب کی غیر موجودگی سے وہ غلطی کے مرتکب نہیں ہوتے تو یہ تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ وہ ان کی مادری زبان ہونے کے علاوہ عرب اور ایران یک لسانی حکومتیں (Monolingual states) ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان (bilingual) بلکہ (multilingual) ملک ہے۔ لسانی اعتبار سے عرب و ہند کے مسائل علاحدہ علاحدہ نوعیت کے ہیں، عربی و فارسی کے لحاظ سے اہلِ ہند کے عربی و فارسی الفاظ کے صحیح تلفظ پر البتہ تعجب ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ان کی اپنی زبانیں نہیں ہیں۔

میں نے تلفظ کی صحت اور معیار کے بارے میں ماقبل السطور میں اعراب کے لکھے جانے پر اصرار کیا ہے۔ اس سلسلے میں دو ایک باتیں اور قابلِ غور ہیں۔ کسی بھی زبان کے لیے تلفظ کا مسئلہ ساری زبان کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ اس زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ میں سے چند فی صدی الفاظ کے تلفظ کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ اردو میں اعراب خاص طور سے ایسے الفاظ کے لیے سخت ضروری ہیں جو کہ اردو کا جز ہیں اور اعراب کی عدم موجودگی سے ان کے معنی بگڑ جاتے ہوں جیسے خُم اور خَم، گُل اور گِل۔ اس قسم کے (minimalpairs) میں جن میں زبر اور پیش معنی میں امتیاز کرتے ہیں۔ لیکن عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ کہ جن پر حرکت کی غیر موجودگی یا فرق سے اردو میں ان الفاظ کے معنوں میں فرق نہ ہوتا ہو تو ایسے الفاظ کے تلفظ کو دونوں طریقوں سے جائز رکھنا چاہیے جیسے مُسَرت اور مَسَرت، آتَش اور آتِش، آصِف اور آصَف وغیرہ۔ اِس لیے کہ زبان کے صوتی تجزیے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان میں کچھ آوازیں آزادانہ تغیر (freevariation) کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔[1]

تلفظ میں اختلاف کی سب سے بڑی وجہ عربی و فارسی کا ذخیرۂ الفاظ ہے۔ ہمارے یہاں یہ عام ذہنی رجحان ہے کہ ہم عربی اور فارسی الفاظ کا تلفظ عربی و فارسی کی صوتی عادتوں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ عربی سامی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے اور ہر زبان کی طرح اس کی اپنی لسانی خصوصیات

---

[1] چونکہ آزادانہ تغیر free variation کا اطلاق ساری زبان پر ہوتا ہے لہٰذا اس قسم کے مخصوص حالات میں محدود آزادانہ تغیر Limited free variation کہوں گا۔

ہیں۔فارسی گو ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر عربی کے واسطے اس نے اپنے لیے ایک مخصوص لسانی وصوتی نہج کو اپنالیا ہے۔لیکن ہمارے یہاں ابھی وہ لسانی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی ہے کہ جس کے واسطے سے عربی وفارسی میں صوتی لحاظ سے ایک خاص تعلق ہے۔لہٰذا ہماری یہ کوشش کہ ہم اردو عربی وفارسی صوتیات ہی کے مطابق بولیں۔لسانی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔وہ لوگ جو اردو کے طرز میں بولتے ہیں وہ کسی طرح لائق مذاق نہ بننے چاہیے۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔جس میں غیر اردو الفاظ کے تلفظ کے اردوا لینے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔یہ رجحان خاص طور سے مصمتی خوشوں (consonantal clusters) میں زیادہ نظر آتا ہے۔صوتی اعتبار سے اردو کا رجحان خوشوں (Clusters) کے خلاف ہے۔چونکہ اردو کی عنصری زبانوں میں سنسکرت،عربی،فارسی اور انگریزی کے الفاظ لاتعداد ہیں اور جن میں مصمتی خوشے لفظ کی ابتدا اور خاتمے پر عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ایسے مصمتی خوشوں والے الفاظ کے درمیان مصوتہ کے استعمال سے ان خوشوں کی ادائیگی کو سہل بنایا جاتا ہے۔اردو کی بولیاں خوشوں کو نہ لفظ کی ابتدا میں برداشت کرتی ہیں نہ لفظ کے خاتمے پر۔معیاری اردو تک میں اکثر اوقات ناخواندہ یا صحیح اردو کے لیے غیر تربیت یافتہ حضرات اسی صوتی رجحان کی پیروی کرتے ہیں۔لفظ کے ابتدائی خوشے جو سنسکرت،عربی،فارسی اور انگریزی الفاظ میں پائے جاتے ہیں۔اکثر اوقات تعلیم یافتہ حضرات کی گرفت میں بھی نہیں آتے۔سنسکرت اور انگریزی الفاظ کے ابتدائی مصمتی خوشے یوں تو عام ہندوستانی کی گرفت سے باہر ہیں۔تاہم کھڑی بولی کے علاقے میں ان کی ادائیگی اور بھی زیادہ مشکل ہوجاتی ہے۔ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

برہمن	/brahman/	بَرَہمن	/barahman/
پرجا	/praja/	پرجا	/paraja/
پریت	/pri:t/	پریت	/piri:t/
سکول	/sku:l/	اسکول	/iskuul/
سٹول	/stu:l/	اسٹول	/ist:al/
سٹیشن	/ste:n/	اسٹیشن	/istesan/

تلفظ و زبان کے سلسلے میں تاریخی لسانیات کی چند حقیقتوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان متعدد جدید ہند آریائی زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، پشتو، گجراتی، مرہٹی، بنگالی کا ملک ہے۔اردو کا تعلق بھی اس ہند آریائی زبان سے ہے جس سے جدید ہندوستانی زبان کے رنگ روپ نکھرتے ہیں۔ مذکورۂ بالا تمام زبانوں نے شورسینی، پراکرت، اپ بھرنش کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے جو اردو کی بھی ماں ہے اور اس لحاظ سے ان ساری زبانوں سے اردو کے گہرے رشتے، ناطے ہیں۔اگر اردو نے اپنی ان بہنوں کے گھروں میں آنا جانا بند کردیا تو نہ صرف یہ کہ اس کے ان تمام زبانوں کے رشتے کمزور ہوں گے بلکہ عملی اعتبار سے ان رشتوں کے ٹوٹنے کا خطرہ ہے اور اگر ایسا ہوا تو یہ اردو کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا جسے وہ برداشت نہ کرسکے گی۔زبان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرم سفر رہتی ہے۔لہٰذا اردو زبان کو بھی مکمل زبان سمجھنا غلط ہوگا۔عہد میرؔ سے لے کر آج تک ضروریات زمانہ کے اعتبار سے یہ بدلتی رہی ہے۔ذخیرۂ الفاظ میں بھی، لب و لہجہ اور صوتیاتی خصوصیات میں بھی۔قدیم اردو کے سی، سیں اور ستیں "سوں" سے "سے" تک کا سفر کر گئے ہیں۔کبھو اور کسو کا حال بھی آپ کو معلوم ہے۔اور کیجو، کیجئے میں بدل گیا ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ایسی اور لاتعداد مثالیں دنیا کی دیگر زبانوں سے پیش کی جاسکتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر میرؔ، مرزا مظہر جانجاناںؔ، قائمؔ، سوداؔ اور ہمارے دیگر قدیم شعرا دوبارہ جنم لیں تو انھیں آج کی زبان دیکھ کر ذہنی دھکا لگے گا اور تعجب نہیں ہوگا اگر وہ اس زبان کو 'زبان جہال' کے نام سے یاد کریں اور یہ دستار اردو والوں کے سر خود اردو علاقے میں باندھی جائے خاص طور سے اس وجہ سے کہ ہمارے یہاں عربی و فارسی کی تدریس کا معقول انتظام نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے عربی لغت کا عربی لحاظ سے تلفظ کیا جائے اور اگر بالفرض عربی و فارسی تعلیم کا معقول انتظام ہو تب بھی ہمارا سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کی تلفظ اردو صوتیات کے مطاق ہونا چاہیے نہ کہ سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی کی صوتیات کے مطابق البتہ بہ ضرورت اگر دخیل الفاظ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کی صوتی خصوصیات بھی اگر در آئیں تو ان سے بچنے پر کسمسانے کی ضرورت نہیں۔[1] اگر ان سے بچنا ناممکن ہو تو دونوں طریقوں کے تلفظ کو اردو کا صحیح تلفظ قرار دیا جائے۔

1- Languages in-contact- by Weinreact page (phonic-interference)

علاقائی اعتبار سے بدلتا ہوا اردو کا تلفظ ویسے ہی ہے۔ جیسا ہمارا انگریزی کا تلفظ ہے جس کی وجہ سے ہماری انگریزی "بابو انگلش" کہلائی اور دلچسپ چیز تو یہ ہے کہ ہم اپنی انگریزی کے تلفظ اور لب ولہجہ پر قطعاً سرمشار نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہم خود اپنی زبانوں کے تلفظ میں فرق پر کسمسانا شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ انگریزی کے تلفظ میں جو فرق ہم ہندوستانیوں میں یا اہل آسٹریلیا، کنیڈا اور امریکہ میں جن حالات یا ماحول میں پیدا ہوا ہے تقریباً وہی حالات دیسی زبانوں اور خاص طور سے اردو کے حالات ہیں۔

تمام زبانیں اپنے مقررہ اصول اصوات پر کام کرتی ہیں۔ ان مقررہ اصولوں کو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدا ہی سے اگر تدریس زبان کے سلسلے میں ان صوتی اصولوں سے مدد لی جائے تو زبان کی تدریس کا کام آسان ہو جائے گا۔ ساتھ ہی مصمتی خوشوں کی مشق کرانے سے تلفظ پر عبور حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہوگی۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے لہٰذا اس کے صوتیاتی نظام میں اس کی عنصری زبانوں میں ہندی، عربی، فارسی کی اصوات شامل ہیں / بھ، پھ / تھ، دھ / ٹھ، ڈھ / چھ، جھ / کھ، گھ / اور / ٹ / ڈ / ڑ / جو بالترتیب ہکار بندشی (aspirated stops) اور معکوسی (retroflex) آوازیں ہیں، خالص ہندوستانی یا ہند آریائی آوازیں ہیں //ز// ف// خ// غ// ق// اور// ژ// جو صفیری (fricatives) مسموع اور غیر مسموع آوازیں ہیں۔ عربی و فارسی سے آئی ہیں۔ جن میں /ق/ اور /ژ/ خالص عربی، فارسی ہیں یہی وجہ ہے کہ چند الفاظ کے علاوہ ہند آریائی آوازیں، عربی، فارسی آوازوں کے ساتھ نہیں آتیں۔

کسی زبان میں سب سے آسان تلفظ حرف علت کا ہوتا ہے۔ مصمتوں کا ادا کرنا نسبتاً مشکل ہے۔ چنانچہ زبانوں کے اسی مزاج کی وجہ سے مصوتے اور مصمتے الفاظ کی تشکیل میں عموماً ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسی زبانیں بھی موجود ہیں کہ جن میں دو سے لے کر پانچ تک مصمتے بغیر مصوتوں کا سہارا لیے بھی آسکتے ہیں۔ تلفظ کی عام پیچیدگیاں انھیں حالات میں شدت اختیار کر جاتی ہیں۔ کسی بھی مصمتے کا انفرادی طور پر ادا کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا اسے دوسرے مصمتے کے ساتھ ادا کرنا۔ کوئی لفظ اگر ایک مصوتے اور ایک مصمتے یا اسی ترتیب سے متعدد ارکان سے بنے

ہوں تو ایسے لفظ کو بہت آسانی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دو یا اس سے زائد مصمتوں کے خوشے ایک ساتھ آئیں تو ان کا تلفظ آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی زبان کی تدریس اگر وہ مادری زبان کے ہم مزاج نہ ہو تو تلفظ کے سلسلے میں کبھی مشکل اور کبھی ناممکن ہو جاتی ہے۔

انگریزی میں چار چار مصمتوں کے خوشے موجود ہیں اور چونکہ یہ ہماری زبان کے صوتی مزاج کے خلاف ہے، ہم نے ان انگریزی الفاظ کو مصوتوں کی مدد سے توڑ کر اردو بنالیا ہے۔ اردو کی دوسری عنصری زبانوں عربی، فارسی میں دو مصمتی خوشے ملتے ہیں۔ مثلاً:

در	:	غدر، بدر، صدر، قدر
رد	:	مرد، درد، سرد، گرد
ک ر	:	ذکر، فکر، شکر
رز	:	ارض، عرض، طرز، گرز
زم	:	عزم، بزم، رزم، نظم، ہضم

چنانچہ جس اصول کے تحت انگریزی کے مصمتی خوشے ایک عام اردو کے طالب علم کے لیے صوتی اعتبار سے اپنی ادائیگی میں مشکل ہیں۔ اسی اصول کے تحت عربی و فارسی بلکہ سنسکرت تک کے مصمتی جوڑوں کا تلفظ بھی مشکل ہے۔ تسہیل اردو کا مزاج ہے جو اسے پراکرتوں سے ملا ہے۔ انگریزی الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی الفاظ میں تسہیل کے اس رجحان کو اپنانا ہوگا۔ دخیل الفاظ (Loan words) خواہ کسی زبان کے ہوں انھیں ایک ہی صوتی اصول پر پرکھنا چاہیے۔ سنسکرت اور ہندی میں مصمتی خوشے (Consonantal clusters) الفاظ کی ابتدائی اور آخری دونوں حالتوں میں آتے ہیں لیکن اردو جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے پراکرتوں اور اپ بھرنشوں سے زیادہ متاثر ہے اور کھڑی بولی کی جدید صورت ہے۔ جس میں ''تت سم'' الفاظ کو ''تدبھو'' بنانے کا رجحان عام ہے۔ چنانچہ یہ رجحان مجموعی طور سے اردو میں زیادہ قوی ہے۔ اردو میں مصمتی خوشے عام طور سے صفیری آوازوں /س/ش/خ/ اور /ف/ اور نوکیلی بندشی غیر مسموع آواز /ر کے ساتھ مروج ہیں۔ مثلاً:

س ت	:	دوست، ست

ش ت : دشت، بہشت

خ ت : سخت، تخت

ف ت : مفت

یہ چند مثالیں ہیں۔ ممکن ہے کہ اردو کے تجزیاتی مطالعہ سے چند اور مصمتی خوشے بھی ملیں۔ تاہم اندازہ ہے کہ اردو میں ان کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ نہ ہوگی تو بہتر یہ ہے کہ ہمارا تلفظ بجائے سنسکرت، عربی، فارسی یا انگریزی زبان کے صوتیاتی اصولوں کی پابندی کرنے کے اردو صوتیات کے مطابق ہو۔ اگر ہم جذباتی لحاظ سے عربی و فارسی صوتیات کی پابندی ہی کرنا چاہیں (جس کے لیے کوئی سائنسی وجہ نہیں ہے) تو ہمیں اپنے تعلیم و تدریس کے طریقۂ کار میں بنیادی فرق پیدا کرنا ہوگا اور اپنی جذباتیت کو صوتی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی۔ محنت سے میری مراد یہ ہے کہ ہمیں صوتی تجزیے کے بعد اردو کی تدریس کے لیے، ابتدائی کلاسوں کے لیے ایسے مفید مطلب اسباق تیار کرنے ہوں گے جنھیں سخت محنت سے مشق کے ذریعے طلبا تک پہنچایا جاسکے۔ ہم ادب کی ترقی و تدوین کرتے رہتے ہیں۔ ابھی اردو زبان کی ترقی کے لیے ہم نے مثبت کام نہیں کیے۔ چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ جدید لسانی اصولوں پر اپنی زبان کے لیے کام کریں۔ یہ کام کسی فرد واحد کا نہیں ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو کو تحریک کے طور پر اٹھانا چاہیے اور ہمارے تحقیقی اداروں کو عملی طور پر اس کار نیک میں انجمن کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اسکولوں اور کالج کے اساتذہ کو صوتیات اور جدید لسانیات میں تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ تاکہ علمی اصولوں کے تحت زبان کی تدریس ہوسکے اور ہم زبان اور تلفظ میں کسی قابلِ قبول عام معیار پر آسکیں۔ ہمارے مدرسوں میں زبان کی تدریس کو سب سے آسان کام سمجھا جاتا ہے اور اس لیے زبان کے معلم کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ اکثر اوقات ہمارے سماجی، معاشی اور تعلیمی مسائل کے پیش نظر جب یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور سائنس کے مضامین نہیں پڑھا سکتا تو اردو کی تدریس کو سب سے آسان سمجھ کر یہ کام اس کے ذمّے کیا جاتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زبان و تلفظ کی صحیح تعلیم نہیں ہو پاتی۔

زبان کی تعلیم کے سلسلے میں دوسری اہم کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم مختلف لسانی علاقوں کی مناسبت سے علاحدہ علاحدہ نصاب مرتب کریں یا کم از کم الگ الگ اصول مرتب کریں۔ زبان کی تدریس کا کل ہندو پاک طریقہ مفید نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مرہٹی، بنگالی، گجراتی، سندھی، پنجابی، کشمیری، اڑیا وغیرہ غرض کہ ہر زبان کے لحاظ سے یا جن جن ریاستوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے وہاں کی علاقائی زبانوں کے لحاظ سے اردو اور ان علاقائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے طریقۂ تدریس اپنانا ہوگا۔ اور اس کام میں اردو کے ساتھ علاقائی زبان جاننے والے حضرات کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔

ہمارے یہاں ایسی کوئی لغت نہیں ہے جسے The Oxford English Dictionary کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے جو انگریزی زبان کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہے۔ نہ ہی کوئی ایسی لغت ہے جو اردو میں Danial jones کی معروف ڈکشنری (An English pronouncing Dictionary) کا کام دے اور اردو تلفظ کی صحت کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کر سکے۔

گریسن نے قواعد کی ترتیب کے متعلق بڑی خوبصورت بات کہی تھی کہ:

The language can not be made to fit the grammer, but the grammer must be made to fit the language. It is a false purism which condemns the use of an apt expression because although born of the soil, it has not been used by former writers.

یہی بات اردو کے صوتیات اور تلفظ کے بارے میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔

جونس نے اپنی تلفظ کی لغت کی ترتیب میں تلفظ کا مصلح بننے کی بجائے اپنے مشاہدوں کو پیش کیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فی الواقع لوگ کس طرح بولتے ہیں۔ ہمیں بھی چاہیے کہ مختلف النوع لسانیاتی ماحول میں اردو گھری ہونے کی وجہ سے تلفظ کے معیار کے سلسلے میں ذاتی پسند و ناپسند اور نظریوں کے بجائے حقیقتوں کے پیش نظر اپنا راستہ

1- Teaching urdu to Bengali speakers--by Afia Dil: pakistan Linguistics(1962)

متعین کریں اور ایسے تلفظ کو مروج کرنے کی کوشش کریں جو لسانی بصیرت کے ساتھ ہی ساتھ عام اردو بولنے والے طبقہ میں مشترک اور قابل قبول بھی ہو۔ حسب ضرورت ایک سے زائد تلفظ بھی رائج کیے جا سکتے ہیں۔

صحتِ زبان کے لسانیاتی پہلو

انسان کی علمی اور عملی زندگی میں زبان جن جن حیثیتوں سے داخل ہوئی ہے اس کا ادراک بیک وقت آسان نہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے بغیر کام کر ہی نہیں سکتا۔ مسائل کے سیکھنے، سمجھنے اور انھیں عملی شکل دینے میں زبان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ چاہے تھوڑا بہت کام اشاروں، نقشوں، تصویروں اور حرفوں سے چل جاتا ہو لیکن عملاً ہر منزل پر زبان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ زبان ہر وقت ہماری مدد کے لیے اس طرح موجود ہوتی ہے کہ اس کی اہمیت اور پیچیدگی کا خیال بھی نہیں آتا۔ علمائے لسانیات اور نفسیات کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ جب کوئی ان پڑھ، گنوار یہ کہتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے اور سننے والا اس کی بات کو سمجھ کر اس کی بھوک مٹا دینے کا انتظام کر دیتا ہے تو اتنی دیر میں جسمانی اور ذہنی عمل کی کتنی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ عام حالات میں ان الجھی باتوں کو جاننے کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی لیکن کسی نہ کسی منزل پر ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ہم بولتے کس طرح ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی کیسے کہتے ہیں۔ سننے والا کیسے سنتا ہے اور کس طرح ہماری بات سمجھتا ہے۔ ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر آواز نکالنا اور سننا محض ایک جسمانی عمل ہے تو اپنے دل کی بات کہنا اور دوسرے شخص کا اس بات کو سمجھ لینا ذہنی کیفیت ہے۔ جن میں تال میل پیدا ہونا ہی کہنے سننے

والے کے درمیان کوئی رابطہ قائم کرسکتا ہے ۔ میں اگر بے معنی آوازیں نکالوں یا کوئی ایسی زبان استعمال کروں جو میرا مخاطب جانتا ہی نہیں تو زبان کا اصل مقصد جسے ترسیل یا ابلاغ کہہ سکتے ہیں پورا ہی نہ ہوگا ۔ یہاں جسمانی عمل ہو رہا ہے ۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں ، سننے والا سن رہا ہے ۔ لیکن چونکہ میرا کہنا سننے والے کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بناتا ، کوئی نقش نہیں ابھارتا ، اس لیے چاہے میں نے کچھ سمجھ کر آوازیں نکالی ہو، لیکن مخاطب میرے مفہوم سے بالکل بے خبر رہے گا ۔ ان باتوں پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ زبان آوازوں کا ایک ایسا نظام عمل ہے جس کو کوئی سماجی گروہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس گروہ کے لوگ اسے سمجھ سکیں اور اس کے مطابق اپنا ردّ عمل ظاہر کرسکیں ۔ زبان کا یہی بنیادی مقصد ہے اور اسی دائرے میں معمولی اظہار خیال سے لے کر شاعری اور فلسفہ تک آجاتے ہیں ۔

ابتدا زبان کس طرح بنی اور اس کی ابتدائی ساخت کیا تھی ۔ یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا ہے ۔ علما نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں لیکن اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کا خیال قطعی نہیں ہے ۔ جو زبانیں دنیا میں رائج ہیں جن کی قدیم شکلوں کا علم ہوگیا ہے ان سے بھی ابتدا کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تاہم اتنا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بہت دنوں تک ایک حالت پر قائم نہیں رہتی ۔ اس میں صوتی ، لسانیاتی ، معنوی اور صوری تغیرات ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کی ابتدا اور آخری شکل میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہونے لگتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ جدید زبان کے قواعد اور لغات سے واقفیت رکھنے والا اس کی قدیم شکل سے بھی واقف ہو ۔ زبان کی اس ارتقائی اور بتدریج بدلتی ہوئی صورت کا مطالعہ تاریخی اور تقابلی لسانیات کی روشنی ہی میں کیا جاسکتا ہے ۔ تاریخی اور سیاسی ، تہذیبی اور تجارتی اثرات کے ماتحت دوسری زبانوں سے الفاظ کا لین ، دینی تعلیم اور تربیت کے ماتحت لسانی تبدیلی ، قواعد کی پابندی ، ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے استحکام معیار اور عوامی ضروریات کے زیر اثر تلفظ میں تبدیلی نئے الفاظ اور تراکیب کا وجود میں آنا ۔ قواعد نویسوں اور علم لغت کے ماہروں کی سخت گیری ۔ یہ ساری چیزیں زبان کے ڈھانچے میں تبدیلیاں پیدا کرتی رہتی ہیں اور تھوڑے دنوں کے بعد ہر دور اپنی ضروریات اور محرکات کے زیر اثر اپنی زبان کا معیار بدل دیتا ہے ۔ جس وقت یہ تبدیلیاں ہوتی ہیں تمام ثقہ اور معیار پرست لوگ ان

تبدیلیوں لی صرف مخالفت ہی نہیں کرتے بلکہ انھیں غلط قرار دیتے ہیں ۔ زبان کی خرابی سے تعبیر کرتے ہیں اور جہالت سے موسوم کرتے ہیں لیکن زبان کا دھارا بہتا رہتا ہے۔ جب آٹھویں نویں صدی عیسوی میں ہندستان کے مختلف علاقوں میں عہدِ وسطی کی آریائی پراکرتوں میں زبردست تبدیلیاں ہونے لگیں اور عوام قواعد کے سانچے میں ڈھالی ہوئی علمی اور ادبی زبان سے گھبرا کر اپنے فطری جذبات کے ماتحت نئے الفاظ بنانے اور بولنے لگے۔ قواعد کے قوانین کو توڑ کر نئی زبان استعمال کرنے لگے تو علما اور قواعد داں چیخ اٹھے اور انھوں نے کہا زبان خراب ہو رہی ہے۔ انھوں نے اس تبدیل شدہ زبان کا نام ''اپ بھرنش'' رکھا جس کے معنی ہیں گرا پڑا۔ افتادہ بگڑا ہوا، لیکن اس بگڑی ہوئی حالت نے بھی شاعر اور ادیب پیدا کیے اور چند صدیوں کے اندر انھیں اپ بھرنشوں کے بطن سے جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوئیں۔ قدیم پراکرتوں اور اب بھرنشوں کی تاریخی حیثیت رہ گئی، ان کا رواج جاتا رہا اور ان کے قائم کیے ہوئے لسانی معیار ختم ہو گئے۔ ایسا ہی اس سے پہلے اس وقت بھی ہو چکا تھا جب گوتم بدھ کے زمانے میں سنسکرت کے مقابلے میں عام بول چال کی زبانوں کو علمی اور مذہبی زبان قرار دیا گیا۔ شیکسپیئر کا کلام جب اس کے مرنے کے بعد چھپا تو بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ اسے انگریزی زبان پر عبور نہ تھا۔ چنانچہ بعد میں کئی ایسے ایڈیشن شائع کیے گئے جن میں شیکسپیئر کی اصلاح کردی گئی تھی۔ اس کا سبب یہی تھا کہ دونوں ادوار کی زبانوں میں اتنا فرق ہو گیا تھا کہ جدید معیار قدیم کو غلط قرار دیتا تھا۔ اس ساری گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ زبان کے تغیر کو غلطی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی صحت کا اصل معیار رواج ہے جو امتداد زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اگر قدیم اردو کے دکنی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو صرف موجودہ عہد کی زبان جاننے والوں کو ہر قدم پر حیرت ہوگی۔ اس وقت اردو زبان تشکیل اور ارتقا کی اس منزل میں تھی جب اظہار خیال کی ضرورت قواعد سے بے نیاز ہو کر الفاظ بناتی ان کی شکلیں بدلتی اور جملوں کو توڑتی ہے۔ زبان اپنے بننے میں قواعد کا انتظار نہیں کرتی نہ علما اور زبان دانوں کی تلاش میں رہتی ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قواعد کی سخت گیری سے زبان کی باڑھ رک جاتی ہے۔ دکنیوں نے سنسکرت چتر سے چترنا (تصویر بنانا) عربی فہم سے فہمنا = فامنا۔ فارسی اندیشے سے اندیشا، ہندی رنج سے رنجانا

بنانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ وہ لفظ کی صوتی شکل کو تحریری شکل دینے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ ان کے یہاں صبح کی جگہ صُبا، ملتمع کی جگہ ملتا وضع کی جگہ وضا ملتا ہے۔ وہ ایک ہی لفظ کو اپنے شعری ضروریات کے لیے کئی طرح استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ایک ہی شاعر کے یہاں سورج (اصل سنسکرت لفظ سوریہ) سور، سوریج، سرج اور سورج چار شکلوں میں ملے گا۔ وہ پھلواری کی جگہ گل واڑی، مجلس آرا کی جگہ مجلس سنگار، سایۂ رب کی جگہ رب چھاؤں لکھنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ان باتوں پر کوئی معترض نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ زبان کا معیار تھا۔ شمالی ہند میں بھی آگرہ کے دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے دہلی کی اردو کھڑی بولی پر گوالیار، آگرہ، متھرا کی برج بھاشا کا ایسا اثر پڑا تھا کہ اٹھارھویں صدی میں خان آرزو نے ''زبان گوالیری'' سے سندلی اور دلی کی بول چال کے مقابلے میں اسے فصیح قرار دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد جب فارسی سے متاثر اردو شعرا اور محققین نے زبان کا معیار بدلنے کے لیے برج بھاشا سے زبان کو پاک کیا اور متروکات کی وہ لے شروع ہوئی جس نے بہت سے خوبصورت، مناسب اور ضروری الفاظ سے زبان کو محروم کرنا چاہا تو ایک نیا لسانی معیار وجود میں آیا جس کی پابندی دہلی اسکول کے شعرا کرنے لگے۔ دہلی کے یہی شعرا لکھنؤ پہنچے تو تھوڑے ہی دنوں کے اندر لسانی معیار پھر بدلا اور زبان کی مرکزیت کے متعلق ایسی بحثیں شروع ہوگئیں کہ دہلی کی زبان زیادہ فصیح ہے یا لکھنؤ کی۔ جس طرح دہلی والے بولتے ہیں وہ صحیح ہے یا وہ جو لکھنؤ میں مستعمل ہے۔ ان بحثوں میں لوگ محض وقتی معیار کو سامنے رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ قدما کے یہاں سندیں تلاش کر لیتے ہیں۔ بہت آگے بڑھتے ہیں تو قواعد اور لغت کی کتابیں کھولتے اور فیصلے کرتے ہیں۔ کیا یہ کافی ہے؟

جیسا کہ کہا گیا ہے زبان کا اصل مقصد ترسیل خیال ہے۔ میں کچھ کہوں اور دوسرا سمجھ جائے تو میرے کہنے کا مقصد پورا ہوگیا۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکالا گیا ہے کہ زبان کے لیے صحیح اور غلط الفاظ استعمال کرنا درست نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ قابل فہم ہے یا نا قابل فہم یہی زبان کی صحت کا معیار ہے چنانچہ بعض ماہرین لسانیات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ایک بہت ہی اہم جرمن عالم کا خیال ہے کہ صحتِ زبان کے مسئلہ پر تین نوعیتوں سے بحث ہو سکتی ہے اول یہ کہ ادبی تاریخی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے اور قدیم عہد کے ادیبوں کی زبان

کی مطابقت ضروری قرار دی جائے۔ تغیر لسانی کے نقطۂ نظر سے یہ طریق کار زیادہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ زبانوں کی تاریخ ہر قدم پر تبدیلیوں کا پتہ دیتی ہے دوم یہ کہ جو کچھ بولا جاتا ہے اسے صحیح سمجھ لیا جائے۔ ہر شخص کے پاس قوت گویائی ہے اور وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہی کہتا ہے۔ سوم یہ کہ جو بات آسانی سے کہی اور آسانی سے سمجھی جاسکے وہی سب سے زیادہ صحیح ہے۔ زبان کی سب سے بڑی عدالت کسی لفظ، جملے یا محاورے کا عموی استعمال ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہے۔ یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف کہنے والے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سمجھ کر بات کہے وہاں سننے والے کی پرکھ بھی ضروری ہے۔ یہ اضافی معیار عام گفتگو کے لیے تو تقریباً درست ہے۔ لیکن جب یہ بات چیت کسی اہم پیچیدہ اور فلسفیانہ موضوع پر ہوگی اس وقت سامع کی اہلیت اور صلاحیت پر نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ بہر حال کوئی معیار قطعی اور یقینی نہیں معلوم ہوتا۔ ایک دوسری نوعیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحتِ زبان کے جانچنے کے لیے کئی اور معیار استعمال میں لائے گئے ہیں مثلاً 1۔ اہم ادیبوں اور عالموں کی سند، 2۔ جغرافیائی معیار جیسے مختلف مرکزوں کی زبان سے سند حاصل کرنا، 3۔ ادبی معیار، 4۔ اونچے طبقے کے لوگوں، شریفوں اور بعض اہم خاندانوں کی زبان کو مستند قرار دینا، 5۔ جمہوری اور عموی معیار، یعنی عوام کی بولی کو درست سمجھنا، 6۔ منطقی معیار یعنی یہ دیکھنا کہ کوئی لفظ یا جملہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے یا نہیں، کیونکہ قواعد سے معنوی صحت کا فیصلہ بعض اوقات نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ چاند نیلا ہے یا قطب مینار پانچ انچ کا ہے تو قواعد کے اعتبار سے میرے جملوں میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت اور معنی کے اعتبار سے دونوں باتیں غلط ہیں، 7۔ جمالیاتی معیار یعنی جو کہنے اور سننے میں اچھا معلوم ہوتا ہے وہی صحیح ہے۔

ان معیاروں کے منطقی اور عملی پہلوؤں پر الگ الگ بحث کی جائے تو ایک ہی نتیجہ نکلے گا کہ ان میں سے کوئی معیار فیصلہ کن نہیں ہے۔ کچھ کے اثرات کسی مختصر علاقے تک محدود ہیں کچھ کے کسی خاص گروہ تک اور کچھ کے کسی خاص عہد تک۔ ہر معیار ہمیں الگ الگ منزلوں تک لے جاتا ہے اور بہت سی نئی بحثوں کے دروازے کھولتا ہے۔

زبانوں کے سلسلے میں عام رجحان یہ رہا ہے کہ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر مختلف شاخوں میں بٹتی رہی ہیں۔ بظاہر رجحان فطری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس انسانوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کی جائے۔ چنانچہ بار بار اس کی کوششیں ہوئی ہیں۔ اور مذہب، سیاست، یا ملک گیری کی خواہش نے ان جذبات کو برابر ہوا دی ہے۔ موجودہ زمانہ چونکہ جمہوری سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ کوشش محض عوامی بہبودی کے نام پر کی جا رہی ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کی زبان ایک ہو جائے۔ ابھی اس میں کامیابی بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ دنیا کا ہر خطہ جس کے پاس اس کی قومی زبان موجود ہے اس کی حفاظت بڑی قوت اور شدت سے کرنے پر آمادہ ہے۔ ہر گروہ اپنے طور پر اس میں اصلاح کرنے پر تیار ہے لیکن اپنی زبان کو چھوڑ نا نہیں چاہتا اس لیے کسی ایک ملک یا گروہ کی خواہش کہ اس کے تمام بولنے والے ایک معیاری زبان بولنے اور استعمال کرنے لگیں دل خوش فہمی پر مبنی ہے۔ اوپر مختلف قسم کی سندوں کا ذکر آ چکا ہے۔ ان میں بڑا انتشار ہے۔ ایک ہی شاعر اور ادیب کبھی صحیح لکھتا ہے کبھی غلط، کبھی شاعرانہ جواز کے پردے میں عام روایت سے انحراف کرتا ہے۔ میر انیس تک بعض الفاظ اور محاورات کے لیے یہ کہنے پر مجبور ہوتے تھے کہ صاحبو! یہ میرے گھر کی زبان ہے اور ان کی عظمت اور عزت کے پیش نظر لوگ خاموش رہ جاتے ہیں۔

اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ زبان کے معیار اور زبان کے صحت کو عام بول چال اور افہام و تفہیم کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور اسے ایسی کال کوٹھری میں بند کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ جس سے اس کا دم گھٹنے لگے۔ ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے۔ تلفظ میں فرق ہوتا ہے بعض محاورات لفظوں کی تذکیر و تانیث اور روزمرہ کی علاقائی زندگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان پر پابندیاں عائد کرنا درست نہیں کیونکہ ہر علاقے میں لسانی ارتقا یکساں نہیں ہوتا۔ دہلی اور لکھنؤ حکومت کے مرکز بنے، ادیب، شاعر، علما، شرفا اور امرا وہیں اکٹھا ہوئے اور زبان منجھ کر صاف ہوئی۔ اس لیے وہ لوگ جو ان مرکزوں تک نہیں پہنچ سکے ان کی بول چال کا ارتقا ایک دوسرے ماحول میں ہوا۔ ان کے لیے صحت اور غلطی کا وہ معیار نہیں ہو سکتا جو دوسرے ادبی مرکزوں میں رائج ہے۔ اس لیے زبان کی صحت کے معاملے میں ہمیں اس سخت گیری سے بچنا

چاہیے جو ہر شخص کو کسی مخصوص لہجہ کا پابند بناتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یکسانیت زیادہ سے زیادہ قرب پیدا کرتی ہے اور معنی کے تعین میں مدد دیتی ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان کے صوری اور لغوی حیثیت کے مقابلے میں اس کی جذباتی اور صوتی حیثیتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ تلفظ کے معنی لغت سے نہیں معلوم ہوتے۔ استعمال سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی استعمال کی بنیاد پر لغت میں جگہ پاتے ہیں۔ منطق، فلسفہ اور لسانیات کی بحثوں میں ایک جدید علم پیدا ہوگیا ہے جسے Semantics یعنی علم المعنانی کہا جاتا ہے۔ سطحی طور پر اس علم میں لفظ کے معنی اور اس کی مختلف تعبیرات سے بحث کی جاتی ہے لیکن اس بات میں بھی اب یہ کوشش ناکام ہوتی نظر آتی ہے کہ سقراط کی طرح ہر لفظ کے معنی معین کر لیے جائیں، پھر بحث ہو بلکہ کہا جاتا ہے کہ ہر لفظ اپنے محل استعمال سے تحریک پیدا کرنے کی قوت سے اردو بولنے والے کے مفہوم تک پہنچانے کے لحاظ سے اپنے معنی کا پتہ دیتا ہے۔ لفظ میں زندگی اسی وقت آتی ہے جب وہ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کو استعمال کرنے والے کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اگر درحقیقت اس لفظ سے اس کے مفہوم تک رسائی نہ ہو تو اسے رد کر دینا چاہیے۔

یہ بحث بہت طویل اور الجھی ہوئی ہے کیونکہ زبانیں ہمیشہ تشکیلی منزل سے گزرتی رہتی ہیں۔ ان میں ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ زبان کی صحت کو قواعد اور لغت کے تابع رکھنا چاہیے یا بولنے اور لکھنے والے کے مافی الضمیر کی ترسیل کے یہ بحث عام بول چال میں بھی اٹھ سکتی ہے اور نہ کرنے کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور کسی نہ کسی کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرا شاعری کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق تو اکثر نقاد متفق الرائے ہیں کہ وہاں خیال زبان کا تابع نہیں۔ زبان خیال اور کیفیت کے تابع ہوتی ہے اور شاعر زبان کا تخلیقی استعمال کرتا ہے۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں الفاظ نئی معنویت اختیار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ لفظ ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' بن جاتے ہیں اور دشنہ و خنجر کے پردے میں جنبشِ ابرو اور ناز و غمزے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن علمی اور معلوماتی زبان میں اتنی آزادی نہیں ہوتی۔ اس لیے مختلف قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ لکھنے والے نے زبان سے کیا کام لیا ہے۔

ان چند سطروں سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ میں زبان کے معاملہ میں مزاج یالا قانونیت کا حامی ہوں۔ مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ جب ہم صحیح اور غلط کے متعلق فیصلہ صادر کریں تو محض لغت اور قواعد کو سامنے رکھیں بلکہ بہت سے ان پہلوؤں کا جائزہ بھی لیں جو زبان کا معیار بنانے اور بدلنے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ زبان بنی بنائی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بننے کا عمل ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔ چاہے ہم اسے محسوس کریں یا نہ کریں۔ یہ عمل کبھی صوتی شکل اختیار کرتا ہے کبھی معنوی۔ دونوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

پانچواں باب: صوت و شعر

- i ابتدائیہ
- ii مطالعہ شاعر: صوتیاتی نقطۂ نظر سے
- iii اصوات اور شاعری
- iv کلام غالبؔ کے قوافی و ردیف کا صوتی آہنگ

ابتدائیہ

اسلوبیات (Stylistics) لسانیات کی اس شاخ کا نام ہے جس میں زبان کے مختلف اسالیب اور ان کے مختلف استعمال کا مطالعہ پیش کیا جائے۔ زبان کا ہر استعمال اپنا ایک اسلوب رکھتا ہے۔ ہر شاعر یا ادیب کا مخصوص لہجہ ہوتا ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ اپنے لہجہ میں بات چیت کرتے ہوئے یا اپنے اسلوب میں لکھتے ہوئے وہ چند مخصوص الفاظ اور اصوات کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہے اور اس انتخاب الفاظ اور انتخاب اصوات سے وہ ایک مخصوص قسم کا تاثر اپنے قاری یا سامع کے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ ابلاغ و ترسیل میں لفظ اور آوازوں کے اس مخصوص استعمال کو screening (عکاسی) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں جب کوئی پیام (message) خفیہ زبان (Encode) میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ چند لسانی عناصر (Linguistic Elements) کو اشارے (Signals) میں تبدیل کر دیتا ہے اور باقی کو روک دیتا ہے۔ اسلوبیات کے طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اس کی توجیہہ کرے کہ صرف چند لسانی عناصر ہی کیوں اشاروں میں تبدیل ہوئے اور باقی عناصر اشاروں میں کیوں تبدیل نہ ہو سکے۔ اسلوبیات میں ان سارے نتائج کو معلوم کرنے کے لیے عکاسی (Screening) کے اس عمل کو چار منزلوں میں تقسیم کیا جاتا۔ 1۔ 2 Phonological screening۔

لغوی عکاسی Lexical Screening۔3 (صرفی ونحوی عکاسی) Grammatical screening، Radundancy screening۔4 (حشوی عکاسی) مختصراً یہ کہ اسلوبیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی فن پارے کو خوش نما اور خوش آہنگ بنانے کے لیے سپاٹ نثر کے مقابلے میں کیا کیا تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ یورپ میں اسلوبیات لسانیات کی شاخ ہے۔ لیکن امریکہ میں ابھی تک اس کا لسانیات میں شمار نہیں کیا گیا تھا۔

اس حصے میں جو مضامین شامل ہیں وہ سب صوتی عکاسی (Phonological Screening) سے تعلق رکھتے ہیں جس میں اصوات، املا، رموز واوقاف اور شعری بحور سے بحث کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہندوستان میں شاید تنہا ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مقالے مطالعۂ شعر اور غالبؔ کے قوافی و ردیف کا صوتی آہنگ تو موصوف کے علم اور بصیرت پر دال ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقالہ "اصوات اور شاعری" بھی نہ صرف اردو اسلوبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی محنت و تلاش کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

مطالعہ شاعر: صوتیاتی نقطۂ نظر سے

لسانیاتی مطالعہ شعر اور اصل شعریات کا جدید ہیئتی نقطۂ نظر ہے۔ لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ اس لیے کہ یہ شعری حقیقت کا کُلی تصور پیش کرتا ہے۔ ہیئت اور موضوع کی قدیم بحث اس نقطۂ نظر سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ کلاسیکی نقد ادب کے اُصولوں کی تجدید کرتا ہے۔ اور قدما کے مشاہدات اور اصطلاحات ادب کو سائنسی بنیاد عطا کرتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر صوتیات کی سطح سے اُبھرتا ہے اور ارتقائی صوتیات، تشکیلیات، صرف ونحو اور معنیات کی پر پیچ وادیوں سے گزرتا ہوا ''اسلوبیات'' پر ختم ہوتا ہے۔ ''اسلوبیات'' کو ابھی تک ماہرین لسانیات علم اللسان کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ گو فرانسیسی زبان کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی ہو چکا ہے اور اس کے جمالیاتی استعمال کو لسانیات کی اصطلاحات میں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں ہو چکی ہیں۔ ان ذہنی کاوشوں نے تنقید شعر کا ایک نیا لسانیاتی (سائنسی) رُخ متعین کر دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ توقع بھی ہے کہ زبان کے تخلیقی استعمال کو علم بہت جلد اپنی گرفت میں لا سکے گا۔

جدید تنقید، بوجوہ سماجی علوم کا بہت زیادہ سہارا لیے ہوئے ہے، اس سے مکمل چھٹکارا تو کسی خیال پرست کا محض تصور ہوگا۔ لیکن جہاں تک فن شعر کا تعلق ہے، بہتیرے نابلدِ فن بھی سماجی علوم کے فارمولوں کے ذریعے نقادِ شعر ہونے کا دم بھرنے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان

ایک سماجی مظہر ہے لیکن بحیثیت ایک مظہر کے یہ سماج کے اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیوں کے تابع اس طور پر نہیں ہوتی جیسا کہ انقلابِ روس کے بعد کے روسی ماہرین لسانیات نے ثابت کرنا چاہا تھا۔ سماج کے دیگر نظاموں اور اداروں کی طرح زبان اس کے اقتصادی اساس کی اوپری پرت نہیں ہوتی کہ طبقاتی انقلاب اس کی نوعیت کو یک لخت بدل دے۔ یہ سماج کا ایک محکم اور پائدار نظام ہوتی ہے۔ اسی طرح شعر انفرادی ذہن کی تخلیق ہونے کی حیثیت سے حرف صوت کی تہہ میں انفرادیت کی توانائی کو محفوظ رکھتا ہے اس لیے مارکس بھی اس مشاہدے پر مجبور تھا کہ فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ ترقی کے بعض ادوار کا سماج کے عام ارتقا یا اس کی مادی اساس اور تنظیمی ساخت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ انفرادی زندگی قطعی طور پر سماجی زندگی سے مربوط ہے۔ بعینہٖ جس طرح ہم سماجی زندگی کو طبعی ماحول سے مربوط دیکھتے ہیں۔ لیکن حیات اپنے ارتقا کی ہر سطح پر نئی ترکیب اور نئی ٹیکنک ڈھالتی ہے۔ یہی ترکیب وہ محکم قدر ہوئی ہے جس کو سمجھنا اور سمجھانا اس سطح کے محقق کا اصل کام ہے۔

شعر انفرادی ذہن کے طلسم کا گنجینۂ معنی ہوتا ہے۔ اور اس نوعیت میں معاشرہ کی مخصوص جمالیاتی قدر اور سطح بھی۔ اس سطح پر کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نقاد شعر اسے خود اُسی کے معیار پر پرکھے۔ یہ معیار جمالیاتی عمل کے ان دائروں سے بنتا ہے جو ذہن شاعر اور لسانیاتی مواد کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سماجی علوم کے تصورات نے ادبی تنقید کو اس کے اصل محور سے دور کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمرانی تنقید سے اس کو ایک فلسفیانہ پس منظر ملتا ہے لیکن اس پس منظر میں فن پارہ اکثر غائب ہو جاتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر میں نہ تو فن کار کا اصول اہم ہوتا ہے اور نہ خود اس کی ذات۔ اہمیت دراصل ہوتی ہے اس فن پارے کی جس کی راہ ہم اس کے خالق کی ذات اور ماحول میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

صوتیات، لسانیات کی پہلی سطح ہے جس پر ناقد شعر کا عمل شروع ہونا چاہیے۔ اس کا احساس قدیم زمانہ سے ناقدین شعر کو رہا ہے۔ مفرد آوازوں کے خوش آہنگ، یا بدآہنگ ہونے کا تذکرہ بار ہا ملتا ہے۔ صوت اور معنی میں جو باہمی رشتہ ہوتا ہے اس کا بھی ذکر مغربی تنقید اور اس کی پیروی میں کبھی کبھی اردو تنقید میں بھی مل جاتا ہے لیکن یہ تمام تنقیدی کاوشیں کسی مربوط

نقطۂ نظر کے تحت نہیں ملتیں، اس کی نوعیت عام طور پر تاثراتی یا ذوقی ہے اس لیے کے ناقدین کو اپنے مشاہدات کی علمی بنیاد کا علم نہیں۔

اس علمی بنیاد کے لیے آوازوں کے مخرج، ان کی ادائیگی اور باہمی ربط پر نظر رکھنی پڑے گی۔ زبان کی بنیادی آوازوں کے باہمی آہنگ ہی سے شعر و نغمہ کے تار و پود تیار ہوتے ہیں اس لیے موسیقی کی طرح کسی زبان کی غنائی شاعری کا بھی ایک قومی مزاج ہوتا ہے۔ یہ قومی مزاج ہم آہنگ یا متضاد یا متوازی آوازوں اور اس زبان کے مخصوص نظام صوت سے ملتا ہے۔ اس لیے جب ہم ایک غیر زبان کی شاعری سنتے ہیں تو اپنی صوتیاتی عادتیں یا پسند اور ناپسند کو اس زبان کے نظام صوت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اور اس کے اسی حصے کو لائق تحسین سمجھتے ہیں جس کا آہنگ ہمارے کانوں میں پہلے ہی سے رچا ہوا ہے۔

ادب کی دوسری اصناف کے مقابلے میں شعر کا صوتی مطالعہ تاثراتی اور ذوقی تنقید کی اکثر اصطلاحوں کو ایک علمی اساس بخشتا ہے۔ اس لیے کہ شعر نہ صرف پڑھنے کی چیز ہے بلکہ سننے اور گانے کی بھی، تنقید شعر میں اکثر ''لہجہ'' کا (بلکہ لب و لہجہ کا) ذکر ملتا ہے، مدھم یا ''پنچم'' سروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ''لے'' اور ''نغمگی'' ''روانی'' اور ''ربط'' پر زور دیا جاتا ہے۔ تاثراتی تنقید کے یہ احساسات عام طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ لسانی مطالعۂ شعر ان کلمات کی سائنسی بنیاد تلاش کرتا ہے اور اس کوشش میں کل زبان کے صوتیاتی نظام کا تجزیہ کرتا ہے۔

اردو کے نظام صوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ حروف علت: جو تعداد میں دس ہیں۔

2۔ حروف صحیح: صوتی (نہ کہ تحریری) نقطۂ نظر سے جن کی تعداد 37 ہے

چونکہ حروف صحیح آواز کے بہاؤ میں وہ چوٹیاں ہیں جن پر حروف علت کا نغمہ رقص کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی ادائیگی اور مخرج کے بارے میں تفصیل سے جاننا ضروری ہے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے ان آوازوں کو حسب ذیل طریقہ پر ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

حروف صحیح

		لہاتی (کوّے کی)	غشائی (نرم تالو)	حنکی (تالو کی)	کوزی (زبان الٹ کر)	لثوی (دانتوں کی جڑ)	دندانی	لبی دندانی	دولبی	
بندشی آوازیں	غیر مسموع — غیر ہکار	ق	ک	چ	ٹ		ت	•	پ	
	غیر مسموع — ہکار		کھ	چھ	ٹھ		تھ	•	پھ	
	مسموع — غیر ہکار		گ	ج	ڈ			•	ب	
	مسموع — ہکار		گھ	جھ	ڈھ			•	بھ	
مسلسل	غنہ مسموع						ن		م	
	غیر مسموع	ہ	خ	ش		س				
	مسموع		غ	ژ		ز		ف		
	تھپک دار		•			ر				
	تھپک دار (کوزی)				ڑ ڑھ					
	پہلوئی					ل				
	نیم حروف علت			ی				و		

مذکورہ بالا جدول میں افقی تقسیم مخرج کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے اور عمودی تقسیم انداز ادائیگی کے نقطۂ نظر سے۔ اردو کے حروف صحیح کا تجزیہ کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ خالص ہندی آوازوں کے ساتھ ساتھ اس میں خالص عربی، فارسی آوازیں بھی شامل ہیں۔ چونکہ ہماری شاعری کی صوتی

روایت فارسی اور عربی سے بہت زیادہ متاثر ہے۔اس لیے اردو کے حروف صحیح کا حسب ذیل تجزیہ لائق توجہ ہے۔

1۔ خالص ہندی آوازیں:۔ٹ،ڈ،ڑ
کھ، چھ، تھ، ٹھ، پھ، گھ، جھ، ڈھ، دھ، بھ، ڑھ

2۔ خالص عربی آواز:۔ق

3۔ خالص فارسی آواز:۔ژ

4۔ عربی فارسی مشترک آوازیں:۔خ، غ، ف، ز

5۔ فارسی ہندی مشترک آوازیں:۔ک، چ، ت، پ، گ، ج، د، ب، ن، م، ش، س، ر، ل، و، ہ، ی

6۔ عربی ہندی مشترک آوازیں:۔ب، ت، ج، د، ر، س، ش، ک، ل، و، ہ، ی

7۔ ہندی ، عربی ، فارسی مشترک آوازیں:۔ ب، ت، ج، د، س، ش، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

اُردو شاعری کا تمام تر صوتی نظام مذکورہ بالا آوازوں کے تار و پود پر قائم ہے۔حروف صحیح کے ان سنگ پاروں کو اردو کے دس حروف علت[1] سے جوڑا جاتا ہے۔جن میں سے چار (ِ، ی، اِ ے، اَے) منہ کے اگلے حصے سے برآمد ہوتے ہیں۔اور پانچ (اَ، اُ، اُو، اُو، اَو) منہ کے پچھلے حصے سے اور ایک (ً) درمیانی حصہ سے۔

اردو ، خالص صوتیاتی نقطۂ نظر سے بھی ایک ہندوستانی زبان ہے لیکن ہمارا شعری آہنگ بہت کچھ فارسی شعر گوئی کی روایات پر مبنی ہے۔اردو شاعری کا سابقہ خاص طور پر ہندی کی کوز (ٹ، ڈ، ڑ) اور ہائے مخلوط والی آوازوں (کھ، چھ، دھ، وغیرہ) سے پڑا۔تاریخ صوتیات شعر تمام تر ان آوازوں کو ہضم کرنے کی داستان ہے۔یہ داستان مرزا معز موسوی خان فطرت کی۔

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم پری ہے
درخانۂ آئینہ گھٹا جوم پری ہے

1۔ اَ، آ، اِ، ای

سے شروع ہوتی ہے اور میر و نظیر کے کوز آوازیں رکھنے والے الفاظ (ڈاگ) ڈانس، ڈول، ڈھنڈ، ڈھیر، ڈھینڈس، لنڈھا، ڈھب، بھڑک، اور رنگامٹ) سے گزرتی ہوئی غالب و اقبال کے فارسی صوتی آہنگ پر ختم ہوتی ہے۔ جب کبھی ہندیت اور ہندی لہجہ غالب آجاتا ہے تو اس کا یہ ٹھاٹھ ہوتا ہے۔ ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اور جب غالب اردو کے لہجے پر چھا جاتے ہیں۔ تو یہ فردوسِ گوش بن جاتا ہے۔ صفحے کے صفحے اُلٹتے چلے جایئے ٹ، ڈ، ڑ کی آوازیں اردو شاعری کے مقدس یعنی دیوان غالب میں نہیں ملتیں۔ یہی حال اقبال کا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ (کوز آوازیں) بذات خود ناہنجار اور بدآہنگ ہوتی ہیں۔ ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ یہ تصور ایرانی، عربی، فرانسیسی یا اطالوی ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کی آریائی زبان کا شعری ادب ان آوازوں سے مملو ہے۔ اور اس کی جڑیں ہندوستانی موسیقی میں طبلے اور ڈھول کے رشتے سے پیوست ہیں۔ ان کے ناہنجار ہونے کا تصور دراصل پیدا ہوتا ہے اس ایرانی شعری روایت کی بدولت جو آج بھی ہماری شاعری پر سایہ فگن ہے اور جو کوز آوازوں کو حسب ذیل انداز میں ملائم بناتی ہے۔

کڑوڑ کا کرور

ساڑی کا ساری

پھلواڑی کا پھلواری

لیکن اس اساس اور غالب اور اقبال کے باوجود، کوز آوازوں کو اردو شاعری کے نازک ترین دماغوں (میر) نے قبول کیا ہے اور فارسی کی روایت کے ساتھ اس طرح گُل، گُل، گلاب، بنادیا ہے کہ کوز آوازوں کی کوزیت ہمارے شعری آہنگ کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ ع

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

کوز آوازوں کے صوتی آہنگ ہی میں میر نے اپنے پھوڑوں کا ذکر کیا ہے۔ نظیر نے عوامی زبان کا ٹھاٹھ باندھا ہے۔ اور سودا اور انشا نے ظرافت کی کلیاں چٹکائی ہیں۔ مزاح

کی یہ روایت جعفر زٹلی کی زٹلیات سے شروع ہوتی ہے اور سوداؔ کی شعری ''بھیڑ بھاڑ'' سے ہوتی ''دھرام'' سے انشاؔ تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے اکبرؔ کی ''ڈانٹ ڈپٹ'' اور ''رپٹ'' میں نمودار ہوتی ہے۔ کوز آوازوں سے مرکب الفاظ جب قافیہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ تو ان سے عام طور پر کسی نہ کسی مضحک پہلو کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ چکبستؔ کی حضرت کرزن سے جھپٹ کسے از بر نہیں۔

آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منہ پھٹ!

ہندی کی ہائے مخلوط رکھنے والی آوازیں (کھ، دھ، بھ وغیرہ) کوز آوازوں کی بہ نسبت اردو، شعری روایت میں زیادہ بہتر طریقے پر کھپ سکتی ہیں۔ اس کی صوتیاتی وجہ یہ ہے کہ یہ آوازیں بذات خود زیادہ وقت طلب نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان سے مرکب الفاظ کی تعداد اردو زبان میں بہت زیادہ بھی ہے۔ یہ آوازیں نہ صرف درمیان شعر میں واقع ہوئی ہیں بلکہ قوافی اور ردیف میں بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ لائی گئی ہیں۔ گو ان میں وہ روانی نہیں ملتی جو حروف علت (ا) یا (ی) (ں) یا (م) سے مرکب قوافی اور ردیف میں ملتی ہیں۔ تاہم دیکھئے میرؔ کے مدھم لہجہ میں اس سے کیا نغمہ برآمد ہوتا ہے۔

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ
تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ
دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا ، جی بھی گیا
شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل و غمِ ہجر و خیالِ رُخِ دوست
مرگیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

میرؔ تو تائے ہندی (ٹ) کی ردیف تک میں غزل لکھتے ہیں۔ اور مزاح سے پہلو بچا کر ایسا جلا بُھنا شعر کہہ لیتے ہیں۔

دل ہے جدھر کو اودھر کچھ آگ سی لگی ہے
اُس پہلو ہم جو لیٹے جل جل گئی ہے کروٹ

لیکن غالب اور اقبال ہائے مخلوط والی آوازوں کو بھی ردیف کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ میر کی آہ وزاری کی واردات کھ، چھ، تھ، پھ کے صوتی آہنگ میں کامیابی کے ساتھ آ ہیں بھرتی اُبھرتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی کثرت ان کے اشعار کی روانی کو کم بھی کر دیتی ہے۔ لیکن جذبہ کا لہو اس کی رنگینی کو سنبھالتا ہے۔ اقبال کی فکر پرستی اور غالب کی حیات پرستی کا آہنگ ان سے بالکل مختلف حروف صحیح کا سہارا لیتا ہے۔ نہ وہ اس قدر منہ پھٹ ہے۔ جیسے کہ نظیر یا انشا کا اور نہ اس قدر ہائے بھرا جس قدر کہ میر یا فانی کا۔

دل فانی کی تباہی کو نہ پوچھ
الم لا متناہی کو نہ پوچھ
زندگی جادۂ بے منزل ہے
مسلک رہرو و راہی کو نہ پوچھ
غلط انداز نگاہوں کو سنبھال
میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ
منع ہے لذت غم بھی فانی
ہمہ گیری نواہی کو نہ پوچھ

اردو حروف صحیح، مسموع اور غیر مسموع آوازوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ تمام حروف علت مسموع آوازیں ہیں اور موسیقی کی جان ہیں۔ ان کے علاوہ گ، گھ، ج، جھ، ڈ، ڈھ، د، دھ، ب، بھ، ن، م، غ، ژ، ز، ڑ، ڑھ، ر، ق، ی، ل، و۔ مسموع حروف صحیح ہیں، یعنی اردو شاعری کے تانوں بانوں میں کل دس حروف علت + بائیس حروف صحیح، کل بتیس مسموع آوازیں ہیں۔ غیر مسموع آوازیں تعداد میں کل پندرہ ہیں۔ ک، کھ، چ، چھ، ٹ، ٹھ، ت، تھ، پ، پھ، خ، ش، س، ف، ہ۔

ان آوازوں سے ہماری شاعری میں صوتی وادیاں بنتی ہیں۔ کیونکہ موسیقی کی بنیاد مسموع آوازوں بالخصوص حروف علت پر ہوتی ہے۔ گلے کے پردوں کے زیر و بم میں تمام راگوں کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غنائی شاعری کی حیثیت سے غزل موسیقی سے قریب

ترین ہے۔اس لیے منزل میں جس قدر غنائیت ہوگی۔اُسی قدر اس کے الفاظ میں حروف علت کی بہتات ہوگی۔حروف علت کے بعد ترجیح مسموع حروف صحیح کو دی جائے گی۔اور وہ غیر مسموع آوازوں کا تناسب عام طور پر 1/3 سے زیادہ نہیں ہوگا۔مثال کے طور پر میر یا غالب کی مشہور نغمہ ریز غزلوں کا جائزہ لیجیے۔

1۔ع۔اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔

2۔ع۔نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

تو حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ہر صورت میں حروف علت کی تعداد سب سے زیادہ ملتی ہے۔اس کے بعد مسموع حروف صحیح آتے ہیں۔اور سب سے آخر میں غیر مسموع دو غیر مسموع آوازوں کا اتصال بہ مشکل ملے گا، جب کہ مسموع مرکب بھی آتے ہیں۔ عام طور پر غنائی ردیفیں ا۔و۔ی سے مرکب ہوتی ہیں۔ یا 'ز'، اور 'ل'، سے غیر مسموع حروف صحیح کی ردیفوں میں اساتذہ نے کہا ضرور ہے۔مثلاً:۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ

اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

مگر ''ز'' کے ارتقا ''س'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے رواں نہیں ہوتیں۔حروف علت والی ردیفوں میں یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ انھیں موسیقی کی ضرورت کے مطابق کھینچ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عام طور سے ہمارے اساتذۂ غزل نے اچھا اور زیادہ ا۔و۔اور ی کی ردیفوں ہی میں کہا ہے۔

حروف علت کی کمی بیشی شعر کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔چھوٹی یا طویل بحروں میں حزن و یاس کی کامیاب ترجمانی کا انحصار بہت کچھ حروف علت کی کثرت پر ہوتا ہے۔غالب کی دونوں مشہور غزلوں میں

1۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

2۔ کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

حروفِ علّت اور صحیح کا تناسب 50 فی صدی کا ہے۔ اِس کے برعکس ان کی فکریہ غزل۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میں حروف کا تناسب گھٹ کر 40 فی صدی رہ جاتا ہے۔ مذکورہ بالا غزلوں کا صوتیاتی تجزیہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جب جذبہ دل کی آنچ بن کر برآمد ہوتا ہے تو وہ حروف صحیح کی رکاوٹوں کو کم سے کم قبول کرتا ہے اور حروفِ علّت کی گزرگاہوں کو پسند کرتا ہے۔ موجودہ تنقید میں اس قسم کی تاثراتی اصطلاحات اور تراکیب کا جواز کہ میؔر کی شاعری کا لہجہ مدھم ہے یا غالبؔ بلند بانگ انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ میؔر طویل حروفِ علّت (ا۔و۔ی) بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اس درجہ کے کوز آوازوں کے روڑے تک ان کے آہنگ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس غالبؔ کوز آوازوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ وہ فارسی صوتیاتی آہنگ کے چلتے سُروں میں گاتے ہیں۔ چلتے سُروں کی صوتیاتی توجیہہ یہ ہے کہ وہ عربی وفارسی چستانی آوازوں (رگڑ کے ساتھ پیدا ہونے والی آوازیں۔ مثلاً خ۔ش۔ف۔ز۔وغیرہ) سے اپنا صوتی آہنگ تیار کرتے ہیں۔ اور بیشتر انھیں ن۔م۔ کی انفی موسیقی کا پس منظر عطا کرتے ہیں۔ یہی آہنگ اقبالؔ کا ہے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے میؔر کے انداز کی ناتمام توسیع فراقؔ کے کلام میں ملتی ہے۔ جو صوتیات اور آہنگ دونوں کی سطح پر بے شمار ''پیوند'' پیش کرتی ہے۔

اردو شاعری کے صوتی تار و پود میں ق۔خ۔اور غ بہت کم اثر انداز ہوئے ہیں۔ ق کی صوتی قدر سے اردوداں طبقہ کا بڑا حصہ (مغربی پاکستان بہ استثنٰی سرحد) بے بہرہ ہے۔ خ اور غ بھی لہاتی یا غشائی چستانی آوازیں ہونے کی حیثیت سے ہندی آوازوں سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں۔ میؔر کے دل کی تپش اور اقبالؔ کے فکر کی روشنی بھی صوت کی ان اکائیوں کو فردوسِ گوش نہ بنا سکیں

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
تم اور ہم سے محبت تمہیں خلاف خلاف
ہم اور الفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ
کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میرؔ سے تو
وہ اور اس کو کسو پر نظر دروغ دروغ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہو زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق (اقبالؔ)

ان غزلوں پر اعتراض معنوی حیثیت سے صرف صوتی حیثیت سے عائد ہوتا ہے بلکہ جب یہ خیال آتا ہے کہ خود اقبالؔ کے کانوں میں 'ق، کا نغمۂ ک، کی شکل میں نمودار ہوا ہوگا تو لہاتی منہ بند آواز (ق) کی حلقیت ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی بجائے غشائی منہ بند آواز 'ک، کا نغمہ سنائی دیتا ہے جس سے ہمارے کان آشنا ہیں

اردو شاعری کے صوتیاتی تجزیے سے تنقیدِ شعر کی بعض اصطلاحوں کا بھی علمی جواز مل جاتا ہے۔ جنھیں اساتذہ نے قدیم زمانے سے استعمال کیا ہے۔ ان میں قابلِ ذکر تنافرِ لفظی اور نقصِ روانی ہیں۔ عیبِ تنافر کے زیرِ عنوان حسرتؔ موہانی ''معائبِ سخن'' میں لکھتے ہیں:

''جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آجاتے ہیں۔ جن میں سے پہلے لفظ کا حرفِ آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرفِ اوّل ہوتا ہے تو ان دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک خاص قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام عیبِ تنافر ہے۔

مثالیں:۔ ع آنکھوں میں عالم سارا سیاہ ہے اب (سیاہ ہے) میرؔ
ع اس کی چشم سیہ ہے وہ جس نے (سیہ ہے) میرؔ
ع میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے (خلق کو) غالبؔ
ع اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں (اشک کو)
ع اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت (عشق کو)
ع اے ذوقؔ دیکھ! دختر رز کو نہ منہ لگا (دختر رز)
ع اس کی تمکینِ ناز سے مجروح (تمکین ناز)
ع مخمور مجھے بادۂ سرخوش سے چھکایا (سرخوش سے)

قدیم تنقید میں حرف اور لفظ دونوں کا تصور غلط ہے اس لیے کہ عیب تنافر صوتیات کا مسئلہ ہے، نہ کہ رسم الخط اور صرف کا۔ اوپر تنافر کی جس قدر مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کے صوتیاتی اصول ذیل میں مرتب کیے جاتے ہیں۔

1۔ ایک ہی آواز، بالخصوص منہ بند آوازوں کی علی الترتیب ادائیگی مشکل ہوتی ہے۔ ع اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں (ک۔ک) اس کی عضویاتی وجہ ظاہر ہے۔

2۔ ہم مخرج آوازوں مثلاً ک، گ، س، ز، وغیرہ کی علی الترتیب ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلی غیر مسموع ہیں۔ اور دوسری (گ۔ز) مسموع ہیں۔ ایسی صورت میں لازماً ادغام کا عمل پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے پہلی غیر مسموع آواز آنے والی مسموع آواز کے زیر اثر مسموع بن جاتی ہے۔ یہ تبدیلیاں عام طور پر حسب ذیل انداز میں ہوتی ہیں اور ان کا قدیم سنسکرت کے قواعد نویسوں نے بالتفصیل ''سندھی'' کے نام سے مطالعہ کیا۔

غیر مسموع	مسموع	تبدیل شدہ شکل	
پ	ب	ب	
ت	د	د	ع۔ دلے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی (غالبؔ)
تھ	د	د	ع۔ خو نے تیری افسردہ کیا وحشتِ دل کو (غالبؔ)
ٹ	ڈ	ڈ	

ٹھ	ڈ	ڈ
ک	گ	گ
چ	ج	ج
ف	و	و
س	ز	ز
خ	غ	غ

یہ عمل اُلٹا بھی ہوسکتا ہے۔ اگر لفظ میں آواز پہلے اور غیر مسموع بعد کو واقع ہو۔ مثلاً

غیر مسموع	مسموع	تبدیل شدہ شکل
ب	پ	پ
د	ت	ت
ز	س	س۔ ع۔ اس کی تمکین ناز[14] سے مجروح
گ	ک	ک۔ ع۔ مدد اے مرگ[15]! کہ گھیرا ہے قضا نے ہم کو
غ	خ	خ۔ ع۔ اے داغ[16]! خاک پائے رسولِ خدا ہیں ہم

3۔ قریب المخرج آوازوں میں تنافر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ادائیگی کے وقت روانی میں مخرج قریب ہونے کی وجہ سے وہی عضویاتی دقت پڑتی ہے جو ایک ہی آواز کو علی الترتیب ادا کرنے میں ہوتی ہے۔

ع:۔ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

یہاں 'ق' حلقی ہے اور 'ک' غشائی

ع:۔ مخمور مجھے بادۂ سرخوش سے چھکایا

یہاں 'ش' اور 'س' قریب المخرج چستانی تلفظ کی آوازیں ہیں۔ 'ش' تالو کی آواز ہے۔ اور 'س' دانتوں کے پیچھے سے برآمد ہوتا ہے۔ 'س' کی 'ش' میں تبدیلی تاریخی صوتیات کا ایک دلچسپ مظہر بھی ہے۔

اصوات اور شاعری

شاعری اور موسیقی فن کارانہ اظہار کے وہ ابتدائی طریقے ہیں جن سے زمانہ قدیم کے انسان نے اپنے جذبات کے نکاس اور ان کی بازیابی کا کام لیا۔ یہ دونوں فنون اپنی تخلیقی نوعیت میں بنیادی طور پر اصوات سے تعلق رکھتے اور حسن سماعت کو متوجہ کرتے ہیں۔ تحریر کی ایجاد اور موجودہ زمانے میں طباعت کی سہولتوں نے شاعری کو مطالعہ کی چیز بنا دیا ہے۔ اب شعر کے محاسن اور معائب میں اس کے بعض صوری خصوصیات بھی شامل ہوگئی ہیں۔ اردو اور فارسی شاعری میں بعض ایسی صفتیں ملتی ہیں جن کا تعلق صرف رسم خط سے ہے۔ مثلاً ایک صنعت جسے ''عاطلہ'' کہتے ہیں یہ ہے کہ شعر یا عبارت میں کوئی نقطہ دار حرف نہ آنے پائے۔ اس طرح صنعت ''تحتانیہ'' اور صنعت ''فوقیانہ'' بھی ہیں۔ ان صنعتوں میں علی الترتیب صرف نیچے اور صرف اوپر نقطے رکھنے والے حروف لائے جاتے ہیں۔ ایک اور صنعت موصل ہے جس میں تمام الفاظ ایسے لائے جاتے ہیں جن کے حروف تحریر میں متصل رہتے ہیں۔ شعر کے نظری مطالعہ سے بعض ایسی خوبیاں (بالخصوص اس کا آہنگ اور نغمگی) نظر انداز ہو جاتی ہیں جن کو بلند آواز سے پڑھ کر یا سن کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے اور لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کل یورپ اور امریکہ کے مدارس میں شعر خوانی کے صحیح طور پر زور دیا جا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں علمی صوتیات سے مدد لی جا رہی

ہے۔ چند نقاد شاعری کے صوتی اور سماعی پہلو پر یہاں تک زور دیتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے شاعری مسلسل اصوات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ بعض نفسیات دانوں کے نزدیک شاعری الفاظ کے ذریعے باطنی یا حسی نکاس ہے جس میں خوش آہنگ الفاظ منہ میں گھولے اور چوسے جاتے ہیں۔ بچہ ابتدائی جنسی لذت ماں کی چھاتی سے حاصل کرتا ہے بعد میں ایسی ہی لذت کی تلاش دوسرے مفروضات میں جاری رہتی ہے۔ شاعری کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ وہ قاری کا اپنا ذہنی تجربہ ہے۔ آئی اے رچرڈ نے اس تعریف سے پیدا ہونے والے التباس سے بچنے کے لیے ''صحیح قسم کے'' قاری کی تخصیص کردی ہے۔ اس کے برخلاف یہ نقطۂ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ہم جو شعر سنتے ہیں وہ خود شاعر کا اپنا تجربہ ہوتا ہے Warren اور Wellek نے اپنی کتاب Theory of literature میں ان مختلف نظریوں سے تفصیلی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حقیقی نظم نہ تو چھپے ہوئے کاغذ پر ہوتی ہے اور نہ قاری کی زبان پر۔ وہ نہ تو انفرادی تجربہ ہے اور نہ تجربات کا مجموعہ۔ بلکہ وہ تجربات کا ایک امکانی سبب ہے۔ حقیقی نظم (norms) سے مرکب ہوتی ہے جو بے شمار قاریوں کے اپنے تجربے میں محض جزوی طور پر گرفت میں آتے ہیں۔ شعر کی صوتی کیفیت اور سماعی تاثر کو انھیں حدود میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

شعر کو محض مسلسل اصوات کا مجموعہ قرار دینا ایک مہمل سی بات ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کی ہیئت میں اصوات کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ شعر کی خارجی موسیقی اصوات ہی کی مخصوص ترتیب سے تشکیل پاتی ہے۔ شاعر اصوات کے بامعنی مجموعوں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور ہم ان آوازوں کو سن کر شعر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق لکھے ہوئے شعر پر بھی ہوتا ہے۔ حروف محض اصوات کی علامتیں ہیں۔ جب ہماری نظر لکھے ہوئے لفظ پر پڑتی ہے تو وہ ہمارے کانوں میں بج اٹھتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی فن پارے کا جائزہ موضوع کو علاحدہ کر کے نہیں لیا جا سکتا۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعر وادب میں موضوع کا اس کے لسانیاتی طبق زیریں (Substratum) سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے جمالیاتی نقطۂ نظر سے ضروری ہو جاتا ہے کہ شاعری کا مطالعہ صرف موضوع اور مفہوم تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ اس کے ناقابل علاحدگی اجزا ''ہیئت'' اور آہنگ کا

جائزہ بھی لیا جائے ۔'' ہر ادب پارہ سب سے پہلے اصوات کا سلسلہ ہوتا ہے ۔ جن سے معنی ابھرتے ہیں ۔ شعر میں جہاں غنائیت اور معانی ایک ہو جاتے ہیں زبان اپنی غایت تکمیل کو پالیتی ہے ۔ زبان کا شعری حسن بڑی حد تک اس کی غنائی خصوصیت پر مبنی ہوتا ہے ۔ شعر کی غنائیت کی تشکیل میں صوتی کیفیات تکرار اصوات ، بحر کا آہنگ اور ردیف وقوافی اجتماعی طور پر حصہ لیتے ہیں ۔ اس طرح '' شاعری زبان ہی میں اپنی جڑیں رکھتی ہے ، جس طرح سے کہ پھل ، پھول میں اپنا وجود رکھتا ہے ۔'' زبان کے غنائی وصف اور شاعری سے اس کے گہرے تعلق کے پیش نظر شاعری کے صوتی آہنگ کا مطالعہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے ۔

صوتیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ شعر کوئی نیا میلان نہیں ہے ۔ ہر زبان کی کتب بلاغت میں ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے اس نقطۂ نظر کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے ۔ بہت سی لفظی اور معنوی صنعتوں کی بنیاد اصوات کی تکرار اور ترتیب پر قائم ہے ۔ محاسن اور معائب شعر کے ضمن میں بھی صوتی آہنگ اور صوتی تنافر کی بحثیں ملتی ہیں ۔ جدید لسانیاتی اور معنیاتی نقطۂ نظر انھیں مشاہدات پر مبنی ہے لیکن چونکہ صوت ، مخارج صوت ، آلۂ صوت کے بارے میں اب علم زیادہ ہو گیا ہے اس لیے ان مشاہدات کی نئی اور زیادہ آسان توجیہات کی جا سکتی ہیں ۔

ہم اس نقطۂ نظر کی حدود سے واقف ہیں ۔ اس لیے تخلیق شعر ایک عمل ہے جس میں صوت کے علاوہ زبان کی دوسری مسلمات جو صرف ، نحو ، اسلوبیات اور معنیات سے عبارت ہیں ۔ بہت گہرے انداز میں پیوست ہوتی ہیں ۔ اور شعر میں جہاں '' چیزے دگر ہست '' کا عنصر شامل رہتا ہے محض لسانی توجیہات اس کی ترجمانی نہیں کر سکتیں ۔ شعر صرف اصوات کی بازیگری نہیں ہے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ قدما کے مشاہدات '' حرف '' کے تصور پر مبنی ہیں ۔ جبکہ شعر میں '' صوت '' مقدم ہے ۔

اردو شاعری کے آہنگ کا صوتیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کے لیے اردو زبان کے صوتی نظام کو نظر میں رکھنا ضروری ہوگا ۔ اردو ایک ریختہ زبان ہے جس کی بنیاد میں ہند آریائی اصوات کا نظام ہے ۔ لیکن اس پر عربی فارسی کے لسانی اثرات اتنے شدید ہیں کہ ان کا نفوذ اصوات تک پہنچ گیا ہے ۔ لیکن خالص عربی صوت '' ق '' اور خالص فارسی صوت '' ژ '' کے علاوہ عربی فارسی کے

مشترک اصوات رف/ رز/، رخ/ اور رغ/ بھی اس کے صوتی نظام میں شامل ہوگئی ہیں۔ اس وجہ سے اردو کا صوتی نظام ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں کے صوتی نظام سے قدرے مختلف ہے۔

کسی زبان کا نظامِ اصوات دو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔

1۔ مصمتے　　　2۔ مصوتے۔

اردو زبان کے رسم خط میں مصمتوں کی جملہ 49 شکلیں ملتی ہیں۔ (ہکار مصمتوں کو ملا کر) لیکن صوتی نقطۂ نظر سے ان کی تعداد صرف 41 ہے۔ اردو میں صوتی اعتبار سے:

1۔ رت/ اور رط/ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگرچہ عربی میں ان کے مخارج الگ ہیں۔ اور ادائیگی کے طریقوں میں بھی فرق ہے۔

2۔ رث/ رص/ اور رس/

3۔ رذ/، رز/، رض/ اور رظ/ کی بھی یہی صورت ہے۔ مصوتہ رع/ کا تلفظ رء/ کی طرح کیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض علاقوں میں رخ/ اور رق/ کا فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ دو علاحدہ مصمتے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

مصمتوں کی گروہ بندی دو طرح سے کی جاسکتی ہے۔

1۔ بہ اعتبار مخارج

2۔ بہ اعتبار ادائیگی۔ مخارج کے اعتبار سے اردو مصمتوں کی دس اقسام ہیں۔

1۔ دولبی (Bi-Labial) رپ/ رپھ/ رب/ ربھ/ رم/ اور رمھ/۔ ان کے ادا کرنے میں دونوں ہونٹ ملتے ہیں۔

2۔ لب دندانی (Labrio-Dental) رف/، رو/ اور روھ/۔ یہ اوپر کے دانتوں اور نیچے کے ہونٹ کی مدد سے ادا ہوتے ہیں۔

3۔ دندانی (Dental) رت/، رتھ/، رد/، ردھ/۔ ان کی ادائیگی میں زبان کی نوک اوپر کے دانتوں سے ٹکراتی ہے۔

4۔ لثوی (Alveoral) رن/، رنھ/، رل/، رلھ/ رر/، رس/، رز/، ان کے ادا کرنے میں زبان کی نوک اوپر کے مسوڑھوں یا دانتوں کے پیچھے لگتی ہے۔

۔۔۔

5۔ کوز (retroflex) رٹ ر، رٹھ ر، رڈ ر، رڈھ ر، رڑ ر، رڑھ ران آوازوں کو نکالنے میں زبان کی نوک تالو کی طرف مڑتی ہے۔ رڑ راور رڑھ رکی ادائگی میں زبان کی نوک تالو سے مس کھا کر نیچے گر جاتی ہے۔

6۔ حنکی (Palatal) رچ ر، رچھ ر رج ر، رجھ ر، رش ر، رژ ر، ری ر۔ ان کے اصوات کے نکالنے میں زبان کا اگلا حصہ تالو سے ملتا ہے۔

7۔ غشائی (Velar) رک ر، رکھ ر، رگ ر، رگھ ران کے ادا کرنے میں زبان کا پچھلا حصہ تالو کے، پیچھے لگتا ہے۔

8۔ لہاتی (Uvular) رق ریہ صوت کوے یا لہات کے پاس سے نکلتی ہے۔

9۔ حجروی (Pheryngeal) رخ ر، رغ ریہ آوازیں حجرے سے نکلتی ہیں۔

10۔ حلقی (Glottal) ره ریہ حلق سے ادا ہوتی ہے۔

ادائیگی کے اعتبار سے اردو مصمتوں کی گروہ بندی بطور ذیل کی جاسکتی ہے۔

1۔ بندشی (Plosive) رپ ر، رپھ ر، رب ر، ربھ ر، رت ر، رتھ ر، رد ر، ردھ ر، رٹ ر، رٹھ ر، رڈ ر، رڈھ ر، رچ ر، رچھ ر، رج ر، رجھ ر، رک ر، رکھ ر، رگ ر، رگھ ر، رق ر

ان مصمتوں کو ادا کرنے میں ہوا منہ سے اس انداز سے خارج ہوتی ہے کہ صوت تنتریوں (Vocal cords) یا زبان یا لبوں کے عمل سے ہوا کسی ایک مقام پر روک لی جاتی ہے اور پھر فوراً رکاوٹ دور کی جاتی ہے اور آواز ہلکے سے دھماکے کے ساتھ نکلتی ہے۔ ان آوازوں کے ادا کرنے میں ایک طرح کی رکاوٹ اور شکست نفس ہوتی ہے۔ یا صوتی جھٹکا پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر شعر کے مجموعی صوتی آہنگ پر پڑتا ہے۔ بندشی مصوتوں کی صوتی کیفیت اور موسیقیت مخارج کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی گئی ہے۔ وہ آوازیں زیادہ سبک ہوتی ہیں جو منہ کے اگلے حصے سے نکلتی ہیں۔ یا جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک آزادانہ جنبش کرتی ہے۔ بندشی اصوات ٹھوس اور بجتی آوازیں ہیں۔ اور اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اردگرد کی اصوات کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان اصوات کی بندشی کیفیت سے شاعروں نے ایمائی اور محاکاتی تاثرات پیدا کرنے میں مدد لی ہے۔ مثلاً:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

صفیری آوازوں کی چیخ ، میں اس شعر کا کلیدی لفظ ''سنگ'' ہے۔شاعر نے مصمتہ رگ رکی بندشیت سے کس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔اس کی توضیح آثر لکھنوی کی زبانی سنئے:

''اس شعر میں لفظ ''سنگ'' ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پابہ زنجیر دیوانے نے جو ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے ہے پہلا مصرعہ پڑھا اور دانت بھینچ کر، آنکھیں بند کر کے پتھر سے سر پھوڑ لیا ہے اور لہو میں نہا گیا۔ حالانکہ شعر میں ان امور کا ذکر نہیں ہے۔''

انفی مصمتے = رم ر، رمھ ر، رن ر اور رنھ ر ان کے ادا کرنے میں ہوا کا کچھ حصہ ناک سے بھی خارج کیا جاتا ہے۔ یہ غنائی آوازیں نغمگی اور کبھی غم واندوہ کی کیفیات صوت پیدا کرنے میں مد ہوتی ہیں۔تقریباً تمام اچھے شاعروں نے ان سے یہ کام لیا ہے۔اس کی عمدہ مثال اقبالؔ کے یہ اشعار ہیں:

من کی دنیا، من کی دنیا، سوز ومستی، جذب وشوق
تن کی دنیا ، تن کی دنیا ، سود و سودا مکر وفن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

2۔ پہلوی مصمتہ (lateral) رل رکی ادائیگی میں زبان کی نوک اوپر کے مسوڑھوں (دانتوں کے پچھلے حصے) سے پیوست ہوکر جھٹکے کے ساتھ جدا ہوتی ہے اور ہوا سامنے کے علاوہ

پہلوؤں سے بھی خارج ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں بندشیت کے ساتھ کسی قدر صفیریت بھی جاتی ہے اور اس کا نغمہ جو کبھی پانی کی آواز سے مشابہ ہوتا ہے۔ ایک خاص نشاطیہ کیفیت رکھتا ہے۔

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا
(میرؔ)

3۔ تھپک دار (کوز) مصمتے (Flapped) رڑ/ر، رڑھ/ر کے مخارج کے سلسلے میں ان مصمتوں کی ادائیگی کا طریقہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ آوازیں زور، جوش، سختی، تشدد اور بعض کیفیات کے اظہار میں معاون ہوتی ہیں۔ نظیرؔ، انیسؔ، دبیرؔ، حالیؔ، اکبرؔ بعض متاخرین اور جدید شعرا نے ان اصوات کی رمزیت سے خاص طور سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انیسؔ کی شاعری کے صوتی آہنگ میں ان اصوات کی تکرار کافی نمایاں ہے۔ اور ان سے انیس نے رزم نگاری اور ڈرامائی کیفیات پیدا کرنے میں مدد لی ہے۔ مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ ہوں۔

گھوڑا کبھی نہ پھول کی جس پر چھڑی پڑی
کھولی گرہ وہ تیغ نے جب گل چھڑی پڑی
ضرب اس کی جو پڑی وہ زرہ پر کڑی پڑی
فوجوں میں شور تھا کہ لڑائی بڑی پڑی
قوت علیؓ کے ہاتھ کی تھی اس دلیر کی
کیوں کر بچائیں صید کو پنجے سے شیر کی

گرنے لگی صفوں پہ جھڑا جھڑ اِدھر اُدھر
ہر قصرِ تن گرا ہے دھڑا دھڑ اِدھر اُدھر
بے سرطیاں ہر ایک کا تھا دھڑ اِدھر اُدھر
ہلچل تھی قلب فوج میں بھاگڑ اِدھر اُدھر
برپا تھا حشر چار طرف رزم گاہ میں
تھی ابتری یزید کی جنگی سپاہ میں

اب حالی کی شاعری میں ان اصوات کی رزم آفرینی دیکھتے جایے۔

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہوگئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑگڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اس کی باری
بن بن کے یونہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

4۔ ارتعاشی مصمتہ (Rolled) ر/ر/ کی ادائیگی میں زبان کی نوک ہوا میں تھرتھراتی ہے۔ یہ آواز عام طور پر تسلسل، حرکت اور تکرار کے اظہار میں معاون ہوتی ہے۔ اس صوتی رمزیت سے اقبال نے بیش از بیش فائدہ اُٹھایا ہے۔

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شررفشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

5۔ صفیری مصمتے (Fricative) /ف/، /س/، /ز/، /ش/، /ژ/، /خ/، /غ/، /ہ/ ان کی ادائیگی کے وقت ہوا رگڑ کے ساتھ باہر نکلتی ہے۔ بندشی مصمتوں کے برخلاف ان میں ایک صوتی تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ اصوات شعر کے آہنگ پر جداگانہ اثر ڈالتی ہیں۔ اور شاعری میں مخصوص قسم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً تسلسل (جذباتی یا صوتی) جذبات کی شدت اور ان کا صوتی نکاس وغیرہ مناظر فطرت کی بعض کیفیات بھی ان اصوات کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے۔ جیسے /س/ اور /ش/ کی تکرار سے اقبال نے اپنی ایک نظم ''ایک شام دریائے نیکر کے کنارے'' میں خاموشی کا سماں باندھا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوافروش خاموش
کہسار کے سبزہ پوش خاموش

صفیری اور حلقی مصمتے رہ رکی نفسی کیفیت سے اکثر شاعروں نے حزن و یاس اور آہ کے اظہار میں مدد لی ہے۔ جیسے۔

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

ادائیگی کے اعتبار سے مصمتوں کو مسموع اور غیر مسموع میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مصمتے تنتریوں یا پردوں کے ارتعاش کی کیفیت سے بنتے ہیں۔ مسموع مصمتوں کی ادائیگی میں صوتی تنتریوں یا پردوں میں ارتعاش زیادہ ہوتا ہے اور غیر مسموع میں بہت کم۔ بیشتر زبانوں کے مصوتے مسموع ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر زبان میں مسموع آوازوں کی تعداد غیر مسموع کے مقابلے میں بہت زیادہ اور عام طور پر جملہ اصوات کا تقریباً 2/3 حصہ ہوتی ہے۔ اردو میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے۔ اردو میں جملہ مسموع اصوات 16 ہیں۔ اور صرف ان مصمتوں پر مشتمل ہیں۔

پ،، پھ،، ت،، تھ،، ٹ،، ٹھ،، چ،، چھ،ک،، کھ،، ق،، ف،، س،، ش،، خ،، ہ،، مسموع اور غیر مسموع اصوات کا رشتہ پہاڑ کی چوٹیوں اور وادیوں کا سا ہے۔ اگر کسی زبان میں غیر مسموع (وادیاں) زیادہ ہوں تو بیشتر اوقات جملے کی سماعت میں دقتیں ہوں گی۔ لیکن شاعری میں اکثر اوقات جب شاعر کا نا پھوسی یا خود کلامی یا دھیمی آواز اور تاسفی لہجہ کا اظہار چاہتا ہے تو غیر مسموع آوازوں کی تعداد لاشعوری طور پر بڑھا دیتا ہے۔

اردو چونکہ بنیادی طور پر ایک ہند آریائی زبان ہے۔ اس لیے عام ہند آریائی زبانوں (بمقابلہ دراوڑی) کی طرح مسموع اور غیر مسموع دونوں قسم کی ہکاری اصوات پائی جاتی ہیں۔ کوز آوازوں کی طرح یہ بھی عربی اور فارسی پڑھنے والوں کے لیے مکمل اجنبیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا تکرر (Frequency) بمقابلہ کوز آوازوں کے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ زیادہ بہتر طور پر اردو شاعری کے صوتی نظام میں ہم آہنگ ہو چکی ہیں۔ چونکہ ان کا مجموعی تاثر

ایک قسم کی کشیدگی تنفس یا نفس کی جانب ہوتا ہے۔ اس لیے حزن و یاس اور آہ وزاری کی کیفیات کے ساتھ یہ مدغم کی جا سکتی ہیں۔ ان کا ایک اور میلان بے ساختگی، جذبات کی جانب بھی ہوتا ہے۔ اور یہ آہ کے علاوہ 'واہ' کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ ہکار مصوتوں میں رڈھ رکی صوت اردو الفاظ کے آخر میں ہکار مصمتہ ر پھ رکبھی نہیں آتا۔ یہ مشاہدہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اردو میں بہت کم الفاظ ایسے ہیں جو غیر مسموع بندشی مصمتے سے شروع اور غیر مسموع ہنکار بندشی مصمتے پر ختم ہوتے ہیں۔

مصمتوں کی طرح مصوتے بھی اپنے مخارج اور ادائیگی کے طرز کے فرق کے ساتھ جداگانہ کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی رمزی کیفیت، جذبات و احساسات کے اظہار و ابلاغ میں معاون ہوتی ہے۔ مصوتوں کی ادائیگی کے وقت منہ کے کھلنے اور زبان کے نیچے رہنے یا اوپر اُٹھنے کی حالتیں مختلف رہتی ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ مصوتوں کی کیفیت بدلتی جاتی ہے۔ زبان کے اگلے اور پچھلے حصوں کے اوپر اُٹھنے اور منہ کے کھلنے کے مدارج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مصوتوں کی گروہ بندی ذیل کے طریقوں پر کی جا سکتی ہے۔

1۔ اگلے مصوتے۔ پست، اونچا (ِ i) اونچا (ی= اُ) متوسط (ے =e)
جڑوان (َ ے=ai)

2۔ درمیانی مصوتہ:۔ متوسط (َ =a)

3۔ پچھلے مصوتے:۔ پست اونچا گو (و=ں) اونچا گول (وٓ=:ں)
متوسط۔ گول __ و=ہ

پست (α = i)، جڑواں __ و۔ ∂u

مخرج کے علاوہ صوتی نقطۂ نظر سے ان مصوتوں کا طول یا اختصار شعری آہنگ کے تار و پود میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اردو کے دس مصوتوں کو حسب ذیل انداز میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

چھوٹے مصمتے:۔ ِ(i)´(∂)´(ŭ)

اِس سلسلے میں اُردو عروضیوں کے یہ مشاہدات بھی قابلِ غور ہیں جن پر ہمارے اساتذہ

نے عمل کیا ہے۔

۱۔ چھوٹے مصوتوں کا حذف جائز ہے۔

2۔ لانبے مصوتوں والے الفاظ میں

الف ۔ ہندی الفاظ کی الف ۔ واؤ اور ''یا'' کا گرادینا جائز ہے۔ مثلاً

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے

اپنا (مومن)

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات

ہندی

اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

(غالب)

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

(غالب)

زخم نصیب تھا جگر زخم جگر سے کیا کہیں

ان کی نظر نے کیا کیا ان کی نظر سے کیا کہیں

(فانی)

ب:۔ عربی فارسی الفاظ میں ان اصوات کا حذف جائز نہیں ہے۔ صرف ایسے مستثنیات میں جائز ہے جو اساتذۂ فارسی کرتے آئے ہیں۔ اس کی وجہ صوتیاتی نہیں ہے بلکہ سماجی ہے۔ یعنی عربی اور فارسی الفاظ کی پاسداری اور لحاظ اردو کے دکنی دور کو چھوڑ کر ہر زمانے میں کیا گیا۔ اردو کی ساری تحریکات اصلاح زبان (مظہر جان جاناں اور امام بخش ناسخ کی تحریکات) اسی رجحان کی غماز ہیں۔

ج:۔ عربی فارسی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو اس کا گرانا جائز ہے۔ کیونکہ اردو

میں یہ مصوتہ آ (a) کے برابر ہے اور ''الف'' کے قاعدے کا اطلاق اس کے ہائے مختفی پر بھی کیا جائے گا۔

اے دیدہ! شرط گریہ ہے ابر بہار ہے (مصحفی)

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کا کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
(ذوق)

شعر میں جہاں حروف اس طرح دبتے یا گرتے ہیں تو ہوتا دراصل یہ ہے کہ لانبے مصوتے کی جگہ ہم مخرج یا قریب المخرج یا ادائیگی میں مماثلت رکھنے والا چھوٹا مصوتہ لے لیتا ہے۔

3۔کسرے کو کھینچ کر پڑھنا جائز ہے،جس سے یائے تحتانی پیدا ہوتا ہے۔

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ (غالب)

اس ضمن میں ے (e) کی صوتی لمبائی کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کی مختصر آواز کو ظاہر کرنے کے لیے حرکتِ زیر (ِ) سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسے ایک=اِک جب کہ یہی حرکت چھوٹے مصوتے (i) کی نمایندہ ہے=بِل ،دِل)

مصوتوں کے طول اور اختصار کے سلسلے میں یہ مشاہدہ اہمیت رکھتا ہے کہ مسموع مصوتوں کے بعد مصوتہ کسی قدر طویل ہو جاتا ہے۔اور غیر مسموع مصمتوں کے بعد نسبتہً مختصر ہو جاتا ہے۔مثلاً ۔با۔پا۔جا۔چا۔گا۔کا کی ادائیگی میں /ب/ج/ اور /گ/ کے ساتھ مصوتہ /آ/ کی لمبائی بڑھ جاتی ہے۔

اُردو کا عروض عربی الاصل ہے جسے فارسی والوں نے اپنایا۔ فارسی عربی کے لسانی اثرات کے ساتھ اردو شاعری نے اس عروضی نظام کو بھی قبول کرلیا۔عربی فارسی عروض کے بعض قاعدے اردو زبان کے لہجے میں موسیقیت کے مطابق نہیں تھے۔اس لیے ہمارے شاعروں کو ان میں مناسب ردوبدل کی ضرورت محسوس ہوئی اور زحافات کا اضافہ کر دیا گیا۔

صوتی رمزیت اور موسیقیت:۔

زبان کی صوتی رمزیت نقادوں ،شاعروں اور ماہرین لسانیات کی توجہ کا مرکز رہی

ہے۔زبان کے آغاز کا ایک نظریہ یہ ہے کہ الفاظ فطری اصوات کی نقلیں ہیں۔[1]

بچے مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازیں سنتے ہیں تو ان کی طرف اشارہ کرنے کے لیے انھیں آوازوں کی نقل کرتے ہیں۔اس مشاہدے سے یہ قیاس کیا گیا کہ زبانوں کا آغاز بھی اسی طریقہ سے ہوا ہوگا۔لفظ سازی کے اس طریقے سے آج بھی کام لیا جاتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ہر زبان میں چند الفاظ ایسے مل جاتے ہیں جنھیں اس نظریے کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور یہ نظریہ ہے کہ خارجی مظاہر سے انسان کے دل میں جو جذبات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ موزوں آوازوں کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔اس کی مثال ہر زبان کے فجایئے ہیں۔[2]

ان نظریات کے خلاف بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔لیکن اس حد تک قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اکثر زبانوں میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو تقلید صوت کے طریقے سے فجائی اظہار کے طور پر وجود میں آئے ۔ یہ نظریے ہماری توجہ زبان کی صوتی رمزیت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔اس نقطۂ نظر سے جب ہم زبان کی اصوات کا جاۂ لیتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض الفاظ کا سماعی تاثر معانی سے پیدا ہونے والی کیفیات سے مطابقت رکھتا ہے۔چنانچہ بلوم فیلڈ (Bloomfield) کا خیال ہے کہ انگریزی میں لاحقہ ''ash'' کی آواز ایک سریع اور پُر تشدد حرکت کو ظاہر کرتی ہے۔اردو میں مماثل کیفیت بعض ہندی الفاظ میں ڑ/ رکی مختتم صورت سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے توڑ، پھوڑ، اکھاڑ پچھاڑ، موڑ، دوڑ، ماردھاڑ، چیر پھاڑ، وغیرہ۔فرانسیسی شاعر Rimbaud نے اپنی ایک نظم 'Lesvoylles' میں ہر مصوتے کو ایک الگ رنگ سے تعبیر کیا ہے۔

You vowels, "A" The Black white"E", Grean"u" Blue"o"

some Day will i Reveal your Hid Nativities

یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ مختلف مصوتوں کا سماعی تاثر باہم ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ان میں جداگانہ صوتی رمزیت ہوتی ہے جس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر شاعر

1- Bou-Bau Theory

2- Poahpoah Theory

استفادہ کرتے ہیں۔ Reme Etimble کے خیال میں سماعی تجربات سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مصوتے رe/ر(اے)اور رiر(ی) بنیادی طور پر لطیف، تیز، واضح اور روشن معروضات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس بیان کو کلیہ کے طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ پچھلے گول مصوتوں کے مقابلے میں یہ مصوتے خوشی اور مسرت کے اظہار میں منہ سے نکلنے والی آوازوں کا تاثر اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان مصوتوں کے ادا کرتے وقت عضویاتی حالت ہنسی یا ہلکے قہقہے کے وقت کی عضویاتی حالت کے مشابہ ہوتی ہے۔ پچھلے گول مصوتوں بالخصوص ان کی انفیائی ہوئی آوازوں کے ادا کرنے میں عضویاتی حالت مختلف ہوتی ہے اور کسی حد تک رونے اور منہ بسورنے کی عضویاتی حالت سے مماثلت رکھتی ہے۔

صوتی رمزیت کا انحصار ایک طرف کسی زبان کے بولنے والوں کی تہذیبی روایات، ان کے ماحول، معاشرت، مزاج اور عادات و اطوار پر ہوتا ہے جن کی متابعت میں الفاظ کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی اصوات سے خاص کیفیات کی باز آفرینی کریں۔ دوسری طرف ان کیفیات سے اثر قبول کرنے کا دارومدار شاعر اور قاری کی شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوتی رموز عالم گیر زبان نہیں بن سکتے۔ مثال کے طور پر اردو کو کوز آوازوں کا آہنگ فارسی یا عربی (جن کی اصوات سے پیوندکاری کی گئی ہے) بنیادی طور پر مختلف ہے۔ کئی صدیوں کے تجربات کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب کہیں جا کر یہ اصوات اردو شاعری میں رچ بس گئے ہیں اور ان کی موجودگی اردو بولنے والوں کی نفسیات کو کسی طرح کا دھکا نہیں پہنچاتی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا تکرار اردو شاعری میں اب بھی بہت کم ہے۔ فطری ہوتے ہوئے بھی اردو شاعر ان سے اجتناب کرتا ہے اور یہیں سے انتخاب فرہنگ شعر کی بحث آ جاتی ہے۔

کسی زبان کی صوتیاتی ہیئت اس کی غنائی صلاحیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اصواتِ شعر میں بنیادی ربط مفہوم کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ وہیں ان کے اجتماع سے خاص آہنگ تشکیل پاتا ہے۔ جو شاعر کے جذباتی آہنگ کا صوتی عکس ہوتا ہے۔ بہترین الفاظ کے بہترین استعمال کا نام شاعری ہے۔

اس تعریف میں بہترین کا اطلاق صوتی ہیئت پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ لفظ کے

مفہوم پر۔اسی وجہ سے فنِ شعر میں صوتی اعتبار سے الفاظ کے انتخاب اوران کی تنظیم کواہمیت دی جاتی ہے۔ ہرزبان کی شاعری میں ایسی بہت سی صفتیں ملتی ہیں جن کا مقصد صوتی ہیئت کو بہتر بنانا اور غنائیت پیدا کرنا ہے۔ انگریزی میں سہ حرفی صنعت Allitration اور تجنیس صوتی Assonemce ایسی ہی صنعتیں ہیں۔سہ حرفی صنعت میں مختلف الفاظ ایک ہی صوت سے شروع ہوتے ہیں۔تجنیس صوتی کی بنیادہم آوازی اور قافیہ بندی پر ہے۔ان صنائع سے شعر میں اصوات کی تکرار ہوتی ہے اور شعر کی غنائیت میں اضافہ ہوتا ہے۔خاص خاص اصوات کی تکرار سے کبھی صوتی رمزیت اور ایمائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انگریزی میں ٹینسن Tenniyson اور کیٹس Keats نے اپنے شعری آہنگ میں تکرار اصوات سے خاص طور پر کام لیا ہے۔اردو میں بہت سی لفظی اور معنوی صنعتوں کا تعلق اصوات کی تکرار اور تنظیم سے ہے مثلاً ردالعجز علی الصدر تجنیس، عکس، قلب، تکریر وغیرہ۔

بحور واوزان:۔

مصوّتوں اور مصمتوں کی باہم ترتیب و تنظیم سے بحور واوزان وجود میں آتے ہیں۔ ہر بحر کی اپنی ایک موسیقی ہوتی ہے۔ جو جذبے کی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کر شعر کی تاثیر کو دوبالا کر دیتی ہے۔مخصوص جذبات کے اظہار کے لیے مناسب بحریں اختیار نہ کی جائیں تو گا کر بین کرنے یا منہ بسور کر ہنسنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض بحروں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ متضاد قسم کے جذبات سے مطابقت پیدا کر لیتی ہیں۔دیکھا جائے تو ہر بڑے شاعر کی کامیاب اور مشہور غزلیں چند خاص بحروں ہی میں ملیں گی جو اس شاعر کے جذباتی مزاج سے توافق رکھتی ہیں۔اسی وجہ سے کبھی یہ بحریں یا اوزان ان شاعروں کے نام سے منسوب ہو جاتے ہیں۔مثلاً

متقارب مثمن اثرم دو چند میں ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا'' والی غزل کی مقبولیت کی بنا پر یہ بحر میرؔ کے نام کا مضاف بن گئی۔اور ہم جب بحر کامل مثمن سالم میں کسی شاعر کی غزل پڑھتے یا سنتے ہیں تو سراجؔ کی یہ غزل یاد آ جاتی ہے۔''خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔'' بعض بحور اور اوزان مخصوص جذبات و کیفیات سے زیادہ موانست رکھنے کی بنا پر چند

خاص خاص مضامین اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیے جاتے ہیں۔ تو آگے چل کر یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان اوزان میں شعر کہتے ہوئے از خود ویسے ہی خیالات وارد ہونے لگتے ہیں۔ اس خیال کی تصدیق اقبال کی غزل۔ "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں" سے ہوتی ہے جو سراجؔ کی متذکرہ غزل کی بحر میں کہی گئی ہے۔

شاعر کے اسلوب اور لہجہ پر بحور اور اوزان کا ایک بالواسطہ اثر یوں پڑتا ہے کہ وہ کبھی شاعر کے انتخاب الفاظ کی آزادی میں مانع ہو جاتے ہیں۔ بحر شعر میں لفظ کا تعین کرتی ہے لیکن بعض اوقات جملے کی ساخت یا کبھی محاورہ یا مرکب کا جزو ہونے کی بنا پر فصاحت کلام کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ شعر میں لفظ کی نشست کسی اور مقام پر ہو اور تعقید، تنافر یا دوسرے عیوب سے بچنے کے لیے شاعر اس لفظ کو ترک کر کے کسی اور لفظ کا انتخاب کرتا ہے۔ اور چونکہ اکثر صورتوں میں متبدلہ لفظ کی صوتی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وزن کی کمی یا بیشی کو دور کرنے کے لیے دوسرے الفاظ بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ مثلاً میرؔ کے اس شعر میں:

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

"شراب" کی جگہ مئے باندھنا چاہیں تو شعر کو از سر نو لکھنا ہوگا۔ نہ صرف وزن کی تکمیل بلکہ فصاحتِ کلام باقی رکھنے کے لیے بھی دوسرے الفاظ میں رد و بدل کرنا ہوگا۔ ایسی تبدیلیاں شعر کے صوتی آہنگ پر لازماً اثر انداز ہوتی ہیں۔

صوتی نقطہ نظر سے فارسی اور اردو، بحور کی موسیقی ان چار اجزا پر مشتمل ہوتی ہے:

1۔ لانبے مصوتوں کی زیادہ سے زیادہ گنجائش
2۔ چھوٹے مصوتوں کی ناگزیر کم سے کم تعداد
3۔ چھوٹے اور لانبے مصوتوں کی ترتیب
4۔ مصوتوں اور مصمتوں کا تناسب

شاعر کسی بحر میں شعر کہتے ہوئے لبے مصوتوں کی جگہ چھوٹے مصوتے لا سکتا ہے ایسی صورت میں جتنے لبے مصوتے کم ہوں گے مصمتوں کی تعداد اتنی ہی بڑھ جائے گی لیکن

مصوتوں اور مصمتوں کی مجموعی تعداد بحر کی فراہم کردہ گنجائش سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ صوتی مقدار ہر صورت میں یکساں رہے گی۔ اس اصول کو ریاضی کی زبان میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ بحر کی صوتی مقدار = 2 (لمبے مصوتے + جڑواں مصوتے) + (چھوٹے مصوتے + مصمتے + (بطور حرف صحیح)۔1

ہر بحر کا ایک معیاری صوتی آہنگ ہوتا ہے جو ارکان کی تکرار سے تشکیل پاتا ہے۔ لیکن بہت کم اشعار میں یہ معیاری صوتی آہنگ برقرار رہ سکتا ہے۔ شاعر کے انتخاب الفاظ کی وجہ سے مصوتوں اور مصمتوں کا تناسب بدل جاتا ہے۔ کسی شعر کے الفاظ کی نوعیت کا دار ومدار کسی حد تک ردیف اور قافیہ پر بھی ہوتا ہے۔ جن سے شاعر کے ذہن میں خیال کے مختلف تلازمے اُبھارے جاتے ہیں۔ غزل میں ردیف اور روی کی تکرار مقررہ صوتی وقفوں کے ساتھ واقع ہوتی ہے اور وہ ایک طرف بحر کے صوتی آہنگ میں اپنی لے بڑھا دیتے ہیں تو دوسری طرف مصمتوں اور مصوتوں کی فراہم کردہ گنجائش کو محدود کردیتے ہیں۔ بحر اور ردیف وقوافی کا مجموعی صوتی انضباط شاعر کے لہجے اور انتخاب الفاظ پر کس طرح اثر ڈالتا ہے، اس کا اندازہ مختلف شاعروں کے چند ہم زمیں اشعار کے تقابلی مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ ناسخ کی ایک غزل، بحر ہزج مثمن سالم میں ہے:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس زمین میں آتش، غالب، ذوق، امیر، تسلیم، اور بعض دوسرے شاعروں نے بھی غزلیں کہی ہیں۔

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

(آتش)

---

1 صوتیاتی اعتبار سے مصوتہ ہے۔ یہاں صرف صوتی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ کے آغاز میں اسے بطور حرف صحیح شمار کرنا ہوگا۔ جیسے "اب" "جب" کا ہم وزن ہے۔ "اب" میں ایک چھوٹا سا مصوتہ اور ایک مصمتہ ہے۔ جبکہ "جب" میں ایک چھوٹا سا مصوتہ اور مصمتے ہیں۔ اس لیے مساوات کو برقرار رکھنے کے لیے اکو ایک بار بطور مصوتہ اور ایک بار بطور حرف صحیح گننا ہوگا۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
(غالبؔ)

لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کے مژگاں کا
نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
(ذوقؔ)

نہیں سودا فقط یوسف کو اس کے دردو درماں کا
..............................چاک گریباں کا
(امیرؔ)

لکھا ہے یک قلم مضمون صفت ہائے یزداں کا
جواب دفتر کن ہر ورق ہے اپنے دیواں کا
(تسلیمؔ)

عیاں ہر حرف سے ہے دائرہ مہر درخشاں کا
ہے رشکِ مطلع خورشید مطلع میرے دیواں کا
(فانیؔ)

یہ بحر ہر مصرے میں چار چھوٹے اور بارہ لمبے مصوتوں، اس طرح جملہ سولہ کی گنجائش فراہم کرتی ہے۔ یہ سولہ مصوتے تمام چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن لمبے مصوتے کسی مصرع میں بارہ سے زیادہ نہیں لائے جا سکتے۔ مصموں کی تعداد کم سے کم سو اور زیادہ سے زیادہ اٹھائیس ہوگی۔ اِس بحر میں جو بھی شعر کہا جائے گا۔ ہر مصرع کا صوتی اُتار چڑھاؤ ان حدود کے تابع رہے گا۔

مندرجہ بالا مطلعوں میں ردیف اور قافیہ کی وجہ سے دو لمبے انفی اور دو لمبے غیر انفی مصوتوں کا اندراج لازمی ہو گیا ہے۔ اس طرح چھوٹے مصوتے مجموعی طور پر کسی مطلع میں اٹھائیس سے زیادہ نہیں لائے جا سکتے۔ ناسخؔ، آتشؔ، غالبؔ، ذوقؔ، امیرؔ، تسلیمؔ، اور فاروقیؔ کے

مطلعوں میں لمبے جڑواں اور چھوٹے مصوتوں کا تناسب بہ صراحت ذیل ہے:

	لمبے اور جڑواں مصوتے	چھوٹے مصوتے	مصمتے	بطور حرف صحیح
ناسخؔ	18	14	36	2
آتشؔ	17	15	38	1
غالبؔ	12	20	41	3
ذوقؔ	19	13	36	1
امیرؔ	20	12	33	3
تسلیمؔ	13	19	40	3
فانیؔ	16	16	37	3

اس جدول پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لمبے مصوتے سب سے زیادہ امیرؔ اور ذوقؔ نے اور سب سے کم غالبؔ اور تسلیمؔ نے استعمال کیے ہیں۔ اس طرح مصمتوں کی تعداد سب سے زیادہ غالبؔ اور تسلیمؔ کے پاس اور سب سے کم امیرؔ اور ذوقؔ کے مطلعوں میں ہے۔ تسلیم کے مطلع میں مسموع مصمتے غیر مسموع مصمتوں کے دو چند سے بھی زیادہ ہیں۔ دوسرے شاعروں کے پاس ان کا تناسب قریب قریب مساوی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مقالے میں غالبؔ کے صوتی آہنگ کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ فارسی صوتیاتی آہنگ کے جلتے سروں میں گاتے ہیں۔ جلتے سُروں کی صوتیاتی توجیہہ یہ ہے کہ وہ عربی و فارسی صفیری آوازوں (رگڑ کے ساتھ پیدا ہونے والی آوازیں مثلاً /خ/، /ش/، /ف/، /ز/، وغیرہ) سے اپنا صوتیاتی آہنگ تیار کرتے ہیں۔ اور بیشتر انھیں /ن/، /م/، کی انفی موسیقی کا پس منظر عطا کرتے ہیں۔" غالبؔ کے آہنگ کی یہ خصوصیت ان کے زیر نظر مطلع میں نمایاں ہے۔ سب سے زیادہ صفیری آواز /ہ/ اور ارتعاشی آواز /ر/ کا اندراج ایک قدر مشترک ہے۔ غشائی آوازیں /ک/، /گ/، /گھ/، اور /خ/ آتشؔ کے مطلع میں زیادہ ہیں۔ اس طرح ذوقؔ اور تسلیمؔ اور امیرؔ کے مطلعوں میں علی الترتیب /ک/، /ن/ اور /ہ/ کی آوازیں الگ الگ صوتی تاثر پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن تمام مطلعے چونکہ ایک ہی زمین میں ہیں۔

اسی لیے ان کا آہنگ کچھ تو تال کی یکسانیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہے اور اس کے علاوہ ہر مطلع کی صوتی مقدار ہمارے اخذ کردہ ضابطے کے مطابق بحر کی صوتی مقدار کے مساوی ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم کی صوتی مقدار 88 ہوتی ہے اور یہی مقدار ہر مطلع کی ہے۔

ناسخ	(1+17)2	+	=(2+36+14)	88
آتش	(2+15)2	+	=(1+38+15)	88
غالب	(1+11)2	+	=(3+41+20)	88
ذوق	(3+16)2	+	=(1+36+13)	88
تسلیم	(2+11)2	+	=(3+40+19)	88
امیر	(3+17)2	+	=(3+33+12)	88
فانی	(1+15)2	+	=(3+37+16)	88

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا لہجہ بحر اور ردیف وقوافی کے فراہم کردہ صوتی آہنگ کے نظام کے تابع ہوتا ہے۔ شاعر کو اس قدر آزادی رہتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو لمبے مصوتے کی جگہ ایک چھوٹا مصوتہ اور ایک مصمتہ یا دو چھوٹے مصوتے استعمال کرے۔ اس طرح بحر کے صوتی نظام میں شاعر کو اپنا لہجہ شامل کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس طرح شعر میں ایک نیا آہنگ ابھرتا ہے جو بحر کا آہنگ نہیں ہوتا۔

شعر میں لمبے مصوتوں کی زیادتی ہی روانی پیدا کرنے کی ضامن نہیں ہوتی بلکہ الفاظ کا صوتی اعتبار سے انتخاب اور مناسب مقام پر ان کا استعمال بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ لمبے مصوتوں کی جگہ چھوٹے اور چھوٹے مصوتوں کی جگہ لمبے مصوتے لائے جائیں یا ساکن مصوتوں کو متحرک اور متحرک کو اس طرح ساکن کر دیں کہ شعر کا مفہوم لفظ کی ادائیگی میں جس لہجہ کا طالب ہو وہ لہجہ قائم نہ رہ سکے تو مذاق سلیم اسے گوارا نہ کرے گا اور شعر کی حقیقی موسیقیت بھی مجروح ہوگی۔ لمبے مصوتے کے مقام پر چھوٹا مصوتہ یا چھوٹے مصوتے کی جگہ ساکن مصمتہ آئے اور اس کے ماقبل یا مابعد کو لمبا مصوتہ یا صفیری مصمتہ ہو تو زیادہ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ قرأت میں ماقبل کے مصوتے کو کسی قدر زیادہ کھینچ کر پڑھنے سے چھوٹے مصوتے کو زیادہ کھینچ کر پڑھنے کی

ضرورت نہ ہوگی۔ یا ساکن مصمتہ ساکن ہی رہے گا۔ مثال کے طور پر اقبال کے مصرع:

اے ہمالہ ! اے فصیل کشور ہندوستا ں !

میں ''فصیل'' اور ''کشور'' ''فصیلے'' اور ''کشورے'' پڑھے جائیں گے۔ لیکن ''فصی'' اور ''کش'' کو ادا کرنے میں زیادہ وقت لیں تو ان اضافتوں کو کھینچ کر پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ ردیف اور قوافی بحر میں مصوتوں اور مصمتوں کی گنجائش سے اپنا حصہ پہلے ہی لے لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بالواسطہ طور پر بھی شعر کے صوتی آہنگ کو متاثر کرتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ردیف وقوافی نہ صرف انتخاب الفاظ میں شاعر کی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ اس کے انتخاب کو مشروط اور محدود بھی بنا دیتے ہیں۔ شعر میں دوسرے کلموں کی صرفی حیثیت اور نحوی اعتبار سے جملوں کی ساخت کا انحصار بڑی حد تک ردیف وقوافی پر ہوتا ہے۔ ناسخ کے ہم زمین مطلعوں کی متذکرہ مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ردیف حروف اضافت سے ہونے کی وجہ سے تمام قافیے مضاف الیہ ہیں اور ہر شعر میں ان کے مضاف اسماء واحد مذکر آئے ہیں۔ ان مطلعوں میں اسماء صفات کی کثرت، فعل ناقص کا استعمال اور بیانیہ انداز ردیف وقوافی کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ردیف وقافیہ بحر کے آہنگ کو زیادہ متعین کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب دو مختلف مزاج شاعر ایک ہی زمین میں طبع آزمائی کرتے ہیں تو ان کے اشعار کے آہنگ اور انداز بیان میں کسی قدر مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

شعر میں لے، نغمگی، روانی اور خاص سماعی کیفیات پیدا کرنے میں مصوتے اہم حصہ لیتے ہیں۔ شعر کی روانی اور غنائیت کا انحصار بڑی حد تک مصمتوں کے مقابلے میں مصوتوں (بالخصوص لمبے مصوتوں) کی کثرت پر ہوتا ہے۔ اردو میں جو بحریں رائج ہیں۔ ان میں بہت سی بحروں میں اس کی گنجائش ہے کہ مصوتے مصمتوں سے زیادہ لائے جائیں اور طویل مصوتوں کا تناسب بھی چھوٹے مصوتوں کے مقابلے میں لمبے مصوتوں کے اندراج کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ بحروں میں لمبے مصوتوں کی گنجائش ارکان کی نوعیت اور تعداد کے ساتھ کم یا زیادہ ہوتی گئی ہے۔ مثلاً بحر رمل کے آٹھ رکنی سالم (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، دوبار) میں جو بیس لمبے مصوتے

لائے جاسکتے ہیں۔ اب وزن متدارک مخبون مضاعف (فعلن ،فعلن ،فعلن ،فعلن دوبار) کو لیجیے۔ اس وزن میں صرف آٹھ لمبے مصوتے لائے جاسکتے ہیں جب کہ چھوٹے مصوتوں کی تعداد کم سے کم سولہ ہوگی ۔ اس وزن میں اگر شعر کہا جائے تو اس کا آہنگ بہت ہی مرتعش ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مخصوص جذبات و کیفیات کے اظہار کے لیے یہ آہنگ مفید اور موزوں ثابت ہوسکتا ہے اور شعر کا سامعی تاثر بھی خوشگوار ہوسکتا ہے لیکن یہ وزن ہر طرح کے جذبات اور لہجوں کو سہار نہیں سکتا۔

ردیف وقوافی :۔

پابند شاعری بالخصوص غزل کی موسیقیت کو بڑھانے میں ردیف وقوافی اہم حصہ لیتے ہیں۔ ردیف وقوافی میں مسموع اصوات جتنی زیادہ ہوں گی غزل کا نغمہ اتنا ہی خوشگوار ہوگا۔ نغمگی کے اعتبار سے شعر کی صوتِ آخر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عام طور پر جو ردیفیں لمبے مصوتوں پر ختم ہوتی ہیں ان میں زیادہ غنائیت ہوتی ہے۔ غزل اگر غیر معروف ہوتو قافیہ کی مختتم صوت پر اس اصول کا اطلاق ہوگا۔ قافیہ یا ردیف کی مختتم صوت رم،ر،رن،ر،رر،ر یا رل رجیسے بجتے ہوئے مصمتے ہوں تو ردیف وقوافی زیادہ خوش آہنگ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیر مسموع مصمتوں سے ردیف وقوافی کی غنائیت مجروح ہوجاتی ہے، ہکار مصمتے ،کوز مصمتے اور بعض بندشی مصمتے صوتِ مختتم کے طور پر آکر ردیف وقوافی میں غنائیت پیدا کرنے کی بجائے انھیں بدآہنگ بنادیتے ہیں ۔ قدما نے تختی کے حروف کی ترتیب کے ساتھ ردیف وار دیوان کی تکمیل کے لیے ان اصوات پر ختم ہونے والی ردیفیں بھی باندھی ہیں ۔لیکن ایسی غزلیں صرف دیوان کی زینت بن کر رہ گئیں اور مقبول نہ ہوسکیں۔

ردیف وقوافی کا آہنگ جو اندرونی صوتی تنظیم سے ترتیب پاتا ہے، بحر کے آہنگ کا جزو ہوتا ہے۔ بحر کی صوتی مقدار میں سے کچھ حصہ پر ردیف وقوافی متصرف رہتے ہیں، اور ان کا کچھ حصہ ان اصوات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جن کی تکرار نہیں ہوتی اور جو کسی خیال کو متواتر نہیں دوہراتیں ۔شعر کی تاثیر کے لیے جو معنویت اور نغمگی کے امتزاج سے ابھرتی ہے اس کے دونوں اجزا میں توازن ضروری ہے۔ اسی لیے ردیف وقوافی کے آہنگ کا جائزہ لیتے ہوئے ان

بحروں اور اوزان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں وہ مندرج ہوتے ہیں۔

ردیف و قوانی کے تعین اور ان کے صوتی آہنگ کے تجزیے میں مروجہ علم قافیہ ہماری مدد نہیں کرتا۔ قدیم علم قافیہ کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں لانبے غیر انفی اور انفی مصوتوں کو حروف صحیح کا مقام دیا جاتا ہے۔ اور ان کے ماقبل حرکت متصور کر کے مختلف قاعدوں کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً جس طرح قافیوں ''یار'' اور ''بار'' میں مصمتے ر ر کو حرف روی اور ماقبل کے مصوتے ا =(ā) کو ردیف مانا جاتا ہے۔ اُسی طرح قافیوں ''انسان'' اور ''سلطان'' میں بھی غنہ کی علامت ''ں'' کو حرف روی قرار دے کر ان کے ماقبل غیر انفی مصوتہ ا=ā متصور کیا جاتا ہے اور اسے ردیف ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح ''شناخت'' اور ''تاخت'' کی رخ رکے مقابل ''چاند'' اور ''ماند'' میں غنہ کی علامت کو بھی ردیف اور روی کے درمیان مستقل حرف مان کر اسے ''ردف زائد'' کہا جاتا ہے۔ قافیے کی بحث میں حرف اصلی اور حرف زائد کا فرق ملحوظ رکھنا اور ایطائے، خفی اور تضمین وغیرہ کو عیوب قافیہ قرار دینا بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قافیہ مستقل کلمہ نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد محض تکرار اصوات پر قائم ہے۔

قدیم علم قافیہ میں قافیہ دو ساکن پر منحصر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے درمیان متحرک حروف کی تعداد کی تبدیلی سے قافیہ کی مختلف صورتیں قرار دی جاتی ہیں جیسے مترادف = جس میں دو ساکن فصل کے بغیر آئیں۔ مثلاً خان۔ جان۔ دور، طور، متواتر جس میں دو حروف ساکن کے درمیان ایک متحرک حرف ہو۔ جیسے نشتر، دلبر، اسی طور پر درمیانی حرف متحرک کے اضافے سے قافیے کی دیگر قسمیں، متدارک، متراکب، متکادس وغیرہ وجود میں آئی ہیں۔ دراصل یہاں بھی لانبے مصوتوں کے تعلق سے وہی مغالطہ ہوا ہے کہ وہ مصمتوں کی طرف ساکن یا متحرک ہوتے ہیں۔ قافیے کے لیے دو ساکن کا لزوم رکھنے پر ''ملا''، ''اُٹھا''، ''سُنا'' جیسے الفاظ ہم قافیہ نہیں رہیں گے۔ اس لیے قافیے کا تعین صوتی نقطہ نظر سے کیا جانا چاہئے۔ صوتی اعتبار سے قافیے کی اکائی ایک طویل مصوتہ ہوگا۔ جو کسی مصمتے کے بعد آئے جیسے ''بُرا'' اور ''بھلا'' کا اختتامی مصوتہ اَ=a یا ایک چھوٹا مصوتہ + ساکن مصوتہ جیسے منصب، غضب، میں (ً + ِ) مصوتوں اور مصمتوں کی کمی، زیادتی اور باہمی ترکیب سے مختلف آہنگ کے قافیے بنتے چلے جاتے ہیں۔ مصوتوں اور مصمتوں کی تکرار و

ترکیب کے اعتبار سے قافیوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

مص = کہیں، کہیں

مص مصم = بل، دل

مص مصم مص = سفینہ، مہینہ

مص مصم مص مصم = چمن، دمن

مص مصم مصم = غرق، فرق

مص مصم مصم مص = سوختہ، دوختہ

مص مص = کئی، گئی

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری زبان کی اصوات ان کی ترتیب اور تکرر کو ملحوظ رکھتے ہوئے صوتیاتی نقطۂ نظر سے علم بلاغت، علم بدیع، عروض اور علم قافیہ کو از سر نو مدوّن کیا جائے۔ اس کی وجہ سے فن اور بیان کے بہت سے جھگڑے از خود رفع ہو جائیں گے۔ ہمارا فن شاعری جو تقلیدی اور روایتی ہونے کی وجہ سے از کار رفتہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر سائنٹفک بنایا جائے تو وہ ہیئت اور آہنگ کے نئے تجربوں میں بھی ہماری رہ نمائی کر سکے گا۔

کلامِ غالبؔ کے قوافی و ردیف کا صوتی آہنگ

یہ مختصر سا مقالہ اردو کلامِ غالب کے قافیوں اور ردیفوں کے صوتی آہنگ کا مطالعہ اور تجزیہ ہے۔ اس سلسلے میں مواد کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہ متداول دیوانِ غالبؔ کی غیر ردیفی اور منتخب غزلیں ہیں۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے صنفِ غزل کا مطالعہ یوں بھی ایک اہم موضوع ہے لیکن اس صنفِ مختصر میں قواعد، روزمرہ اور صوتی نقطۂ نظر سے سب سے اہم مقام قافیہ اور ردیف کا نقطۂ اتصال ہے۔ قافیے اور ردیف کی چولیں بٹھانے میں اچھے اچھوں سے بعض اوقات فروگزاشت ہو جاتی ہے۔ ہر ردیف ہر قافیہ سے تال میل نہیں رکھتی۔ اس لیے شاعر کا ذہن ردّ و قبول کی ایک سخت آزمائش سے گزرتا ہے جب کہ قافیے میں تنوع کی گنجائش رہتی ہے۔ ردیف کی مقررہ شکل میں تکرار ضروری ہے۔ جس طرح ردیف میں جان پڑتی ہے قافیہ کے انتخاب سے شاعر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقررہ ردیف سے ہم آہنگ قافیے لائے۔

قافیے کا تا حال مطالعہ 'حرف' کے تصور کے تحت ہوتا آیا ہے چنانچہ قافیے کو چند حروفِ معینہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ان حروف کی تعداد نو بتائی جاتی ہے۔ یعنی حرفِ روی (جو قافیہ کی اصل اور اساس ہوتا ہے) اس سے چار حرف پیشتر آ سکتے ہیں اور چار بعد کو۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے حرف کے اس تصور کو باطل قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے قافیے کے اجزائے ترکیبی کی نئی تعبیر ضروری

ہو جاتی ہے۔ قافیہ کا اس نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ ضروری ہے لیکن پیش نظر تجزیے میں بحث کو محدود رکھا گیا۔ صرف اس صوتی گرہ تک جو قافیے اور ردیف میں لگائی جاتی ہے۔

اس مطالعہ کا طریقہ کار قیاسی نہیں بلکہ مشاہداتی ہے یعنی جس مختصر مواد کا پہلے تذکرہ کیا گیا ہے اس کے تمام قافیوں اور ردیفوں کے اعداد و شمار تیار کیے گئے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے بعض دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ان نتائج سے غالبؔ کے صوتی آہنگ کے طریق کار پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے شاعر کی صوتیاتی جولان گاہ کیا ہے۔ غالب بنیادی طور پر صوتی آہنگ کے شاعر نہیں۔ لیکن چند مقامات سے قطع نظر وہ اتنے بے سُرے بھی نہیں۔ ان کی شاعرانہ توجہ کا مرکز صوتی آہنگ سے زیادہ ندرت الفاظ اور معنی آفرینی ہے۔ صوتی آہنگ ان کے یہاں شعوری طور پر نہیں ایک آمد کی رو میں برآمد ہوتا ہے اور ان غزلوں کے مزاج اور کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ردیف کی موسیقیت سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان میں ردیف دار غزلیں صرف گنتی کی ہیں۔ ردیف کی تکرار اور پابندی سے غزل میں جو شدت تاثر اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے اس سے انھوں نے بھرپور کام لیا ہے اور قافیے اور ردیف کے درمیان عام طور پر صوتی گرہ کامیابی کے ساتھ لگائی ہے۔

اس سلسلے میں صوتیاتی تجزیے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ غالبؔ اس رمز سے واقف ہیں کہ مصوتے (Vowels) قافیوں کے اختتام پر لائے جائیں تو صوتی گرہ زیادہ کامیابی سے لگائی جا سکتی ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ یہ ردیف کا پہلا جزو ہوں۔

ان کے کلام میں مصوتوں پر ختم ہونے والے قافیوں کی تعداد 48 ہے۔ اور مصوتوں سے شروع ہونے والی ردیفوں کی تعداد کل 7 ہے۔ ان 48 قافیوں میں سب سے زیادہ /ا/ مصوتے (یعنی الف پر) ختم ہونے والے قافیے ہیں یعنی بائیس۔ ان بائیس میں سے 11 قافیوں میں /ا/ مصوتہ ہونے کی حیثیت سے مسموع (voiceless) آواز /ک/ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ /ا/ مصوتہ ہونے کی حیثیت سے مسموع ہے۔ لہٰذا مسموع کا غیر مسموع سے اتصال اور دونوں کا ایک دوسرے کو عمل انضمام سے متاثر کر کے آہنگ پیدا کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ان کی بعض مقبول

عام غزلیں اسی صوتی ترکیب سے مزیّن ہیں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
غنچۂ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
کہوں جو حال تو کہتے ہو مدّعا کہیے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جب کہ مسموع مصوتے کی گرہ غیر مسموع مصمتے کے ساتھ اچھی طرح لگتی ہے، ایک مصوتے کی گرہ دوسرے مصوتے کے ساتھ نہیں لگتی۔ غالبؔ نے اس قسم کی ناکام کوشش صرف چار جگہ کی ہے اور ثقالتِ صوتی کا شکار ہو گئے ہیں:

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا۔1 (ا/آ)
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن۔2 (ی/اے)
کوئی دن گر زندگانی اور ہے (ی/او)
حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے (ی/آ)

اس ثقالتِ صوتی کو غالبؔ نے بعض مقامات پر غنّہ کے استعمال سے دور کیا ہے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا (اں/ا)
ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں گماں اور (اں/او)

---

1 دوسرا مصرع
1 ''دن'' سے عیب چھپ گیا ہے/ن/ صوتی مصلح کا کام دیتا ہے

مصوتے کی گرہ نہ صرف مصوتے سے نہیں لگتی اگر اس کو مسموع مصمون (Voiced consonants) کے ساتھ لایا جائے تب بھی ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔ ان غزلوں میں قافیے اور ردیف کی بندش کو دیکھیے۔

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں

یہاں نہ صرف 'ہا' مخلِ نظر ہے بلکہ (اا ب) بھی۔ یہ اتصال جب قافیے اور ردیف میں اُلٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اور زیادہ گراں گزرتا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

(دراَ) ''دٗ'' کو ''ت'' بنا کر پڑھنا پڑتا ہے۔

(ا) کے بعد غالب کی سب سے زیادہ غزلیں ری/راور رے/ر پر ختم ہونے والے قافیوں میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی ہر اک میں دس، دس، یہاں ہم ایک بڑی دل چسپ بحث سے دوچار ہوتے ہیں جو پھر ''حرف'' کے تصور سے پیدا ہوتی ہے یعنی یائے مجہول اور یائے معروف کی بحث اور فرق۔ یہ فرق دراصل فارسی زبان کے لحاظ سے با معنی ہے لیکن اردو زبان کے نقطۂ نظر سے محض مہمل ہے۔ اس لیے کہ ری/راور رے/ر اردو کے دو علاحدہ حیثیت رکھنے والے مصوتے ہیں اور ان میں سے ایک کا گرنا یا دبا دینا جائز قرار دینا اور دوسرے کا ناجائز ایک غیر زبان کے اصولوں کا اردو پر اطلاق کرنا ہے۔ غالب نے رے/ر پر ختم ہونے والے قافیوں میں اس مصوتے کو گرانے یا دبانے کی کوشش صرف ایک دو جگہ کی ہے۔ عام طور پر انھوں نے اس کا اس طرح احترام کیا ہے جس طرح ری/رکا۔ جہاں تک واو مجہول اور واو معروف کا تعلق ہے۔ غالب نے روایت شعری کے مطابق ایک دو جگہ انحراف کیا ہے جو یقیناً اردو دانوں کے لیے اب تک غیر ہضم شدہ اتصال صوت ہے۔

کہتے تو ہو تم سب کہ ''بتِ غالیہ مو آئے''
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ''دو آئے''
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے — ٥(راو)
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشنبہ کی بو آئے — ٥(راوٗ)

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جوآئے o(راو)
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھوآئے o(او)

غالبؔ نے قوافی ردیف کے صوتی اتصال میں غنے کا کامیابی سے تجربہ کیا ہے۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے غنہ دراصل مصوتوں کی انفی شکل ہے۔غنے سے مرکب انیس غزلوں کے قافیوں سے صرف ایک ایک /ō/ u/ آ/ پر مشتمل ہیں۔باقی سولہ غزلوں کے قافیے /a) کی انفی شکل یعنی /ã/ رکھتے ہیں۔غنے کی سب سے زیادہ ترکیب /ک/ اور /o/ غیر مسموع مصمتوں سے کی گئی ہے جہاں غنہ نون یا میم سے مرکب کردیا ہے۔وہاں پوری غزل گنگنا اٹھی ہے۔صوتی آہنگ کے لحاظ سے غالبؔ کی سب سے کامیاب غزلیں یہی ہیں۔

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے مراد مرا امتحاں نہیں (اں/ن)

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا (اں/ن)

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے (اں/ن)

مصمتوں کے نقطۂ نظر سے غالبؔ کی محبوب ترین آواز جو وہ بائیس غزلوں کے قافیوں میں لائے ہیں۔ارتعاشی مصمتہ /ر/ ہے۔/ر/ زبان کی نوک تھرتھرا کر پیدا کی جاتی ہے اور اس لحاظ سے یقیناً سرعت اور رفتار کی حامل ہے۔یہ دیگر مصمتوں کے ساتھ مرکب بھی بآسانی ہوجاتی ہے۔اس اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کی اردو میں واحد آواز ہے۔ان بائیس غزلوں میں سب سے زیادہ مرکب کی گئی ہے /ک/ ر کے ساتھ یعنی چھ بار اور پھر /ن/ ر کے ساتھ یعنی چار بار۔

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی

مجھے /ر/ سے مرکب قافیے کی کسی غزل میں ثقل صوت کا احساس نہیں ہوا۔سوائے

دیوان غالبؔ کی پہلی غزل کے دو مصرعوں کے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　(ر/ر/ک)

لیکن اگلے مصرعوں میں جا کر یہ ثقالت دور ہو جاتی ہے۔ زنجیر کا، شیر کا، تصویر کا، پھر تکرار صوت کی ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔ اس مصرع میں

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا　　　(ر/ر)

اختصار کی خاطر فی الحال ہم ایسی اصوات کے اعداد و شمار دینے سے اجتناب کر رہے ہیں۔ جن کا استعمال صرف چند بار کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی ترکیب صوتی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ ایک مجموعی حکم لگایا جائے۔ غالبؔ نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے ردیف اور قافیوں کے بعض نہایت ہی "فردوس گوش" مرکبات تخلیق کیے ہیں۔ مثلاً:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے　　　(م/ن)

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا　　　(ں/ن)

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا　　　(ن/ہ)

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں　　　(ن/م)

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں　　　(ن/ں)

اور غالبؔ سے اس صوتی مرکبات کی ترکیب میں بعض اوقات بھول بھی ہوئی ہے۔ مثلاً ان کی یہ معرکتہ الآرا غزل جس کے کم از کم تین شعر ضرب المثل بن چکے ہیں۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو　　　(ہ/ہ)

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا (د/تھ)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک (ت/ت)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے (ت/چ)

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے (ک/ہ)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی (ت/ہ)

آخری غزل غالب کی کامیاب ترین غزلوں میں شمار کی جاسکتی ہے لیکن قافیے اور ردیف کا اتصال اور ''ہی سہی'' ردیف کی ثقالت نے ایک ایسا اندازِ تکلم پیدا کردیا ہے جو چبا چبا کر باتیں کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

غزل شناسی میں صوتی پسِ منظر کی بہت اہمیت ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر شعر کی زبان میں بمقابلہ نثر صوتی سانچوں کی تکرار زیادہ ہوتی ہے اس لیے یکسانیت سے بچنے کے لیے ان میں تنوع سے کام ہر اچھے فن کار کا فرض ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آمدِ شعر میں شاعر کا ذہنی ارتکاز لفظ اور ترکیب پر زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب تک یہ سانچے اس کے شعری وجدان کا جزو بن جائیں ان میں تنافر پیدا ہونے کا امکان قائم رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں صوتی سطح تخلیق کے وقت زبان کی دیگر سطحوں کے مقابلے میں زیادہ تہ نشین رہتی ہے اور اس میں ارادی عمل کی کم سے کم دست اندازی ہوتی ہے۔ اس صوتی سطح کی جانب سے بے حسی دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک تو مشاعرہ بازی سے جہاں ترنم اور موسیقی کی تانوں سے صوتی کم آہنگی کو اکثر چھپا لیا جاتا ہے اور دوسرے شعر کے خاموش مطالعے سے جس کی وجہ تکلم کو مختلف اصوات کے ساتھ تلازمۂ خیال کے مختلف انداز بھی ہوسکتے ہیں۔ فرانس کے ایک مشہور شاعر نے اپنے ایک

سانیٹ میں بتایا ہے کہ اس کے لیے فرانسیسی زبان کے مختلف مصوتے کس طرح مختلف رنگوں سے منسلک ہیں۔ مثلاً: /E/ نیلے رنگ سے /u/ سرخ سے وغیرہ۔ لیکن یہ مسئلہ لسانیاتی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے اور مابعد اللسانی مسئلہ ہونے کی وجہ سے ہمارے احاطۂ مطالعہ سے خارج ہے۔

غالبؔ کی شاعری اور اس کے نقادوں کا جب بھی خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں ایک عروسِ نو کی تصویر اُبھرتی ہے جسے کوئی چوٹی سے پکڑتا ہے (غالبؔ کے فارسی نقادوں کا یہی دستور ہے) کوئی گردِ کمر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے (کہ جمالیاتی و تاثراتی نقاد اس کو ناکردہ گناہ پر آمادہ تر نظر آتے ہیں) کوئی اس کے دایم زیرِ نقاب آئینے کی شرح کرتا ہے (کہ صوتی نقادوں سے بہتر اندازوں میں تاک جھانک کون کرسکتا ہے) ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس عروسِ نو کی دل فریبی اندازِ نقشِ پا کو دیکھا جائے۔ صوتیاتی اور لسانیاتی تنقید کے جواز میں بس اسی قدر کہا جاسکتا ہے۔

چھٹا باب: رسم الخط

ابتدائیہ

ماہرین لسانیات نے زبان میں تقریر کو بنیادی حیثیت دی ہے۔تحریری زبان ان کے نزدیک ثانوی درجہ رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ لسانی مطالعوں میں عام طور سے تحریری زبان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور اگر دی گئی تو زبان کے اس مطالعہ کو جسے اسلوبیات کہا جاتا ہے۔زبان کے سلسلے میں رسم خط کا موضوع ماہرین کے نزدیک اب بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور عام خیال کے مطابق کسی بھی زبان کے لیے رسم الخط کا مسئلہ لسانیات کی حدود سے باہر ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حروف اصوات کی علامتیں ہیں اور کوئی بھی زبان آزادانہ طور پر اپنے لیے علامتوں کا استعمال کر سکتی ہے۔جب بہت زیادہ لچک پیدا کی گئی اور زبان کے لیے لکھاوٹ کے طریقوں پر علمی اعتبار سے غور کیا گیا تو صوتی علامتوں کے اس نازک مسئلہ کو لسانیات اور صوتیات کی ذیلی شاخ فنِ تحریر (Graphemics) کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اِدھر آئے دن اردو کا رسم خط بدلنے کی تجویزیں پیش کی جارہی ہیں اور اسے ایک غیر سائنسی رسم خط کہا جارہا ہے۔اگرچہ اردو لکھاوٹ صوتی اعتبار سے مکمل نہیں ہے تاہم حسن اور اختصار میں یہ لکھاوٹ لاثانی ہے۔جہاں تک اس کے نامکمل ہونے کا سوال ہے یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اپنے رسمِ خط کے معاملے میں اپنے طور پر مکمل ہونے کا دعویٰ

نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ خود انگریزی جو بین الاقوامی زبان ہے۔''کمال'' کے معیار سے سب سے زیادہ غیر سائنسی لکھاوٹ ثابت ہوگی۔ اگر چہ ترکی، ملائی، انڈونیشی زبانوں نے اپنا رسم خط بدل کر رومن کو اپنا لیا ہے۔ تاہم اردو کے لیے یہ تقلید نقصان دہ ہوگی۔ جن زبانوں نے اپنا رسم خط بدلا ہے وہ اپنے علاقہ کی تنہا زبانیں ہیں۔ لہٰذا ان کا کسی دوسری زبان میں ضم ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اردو کا ماحول ان زبانوں کے مقابلہ میں بہت مختلف ہے۔ ہندی اردو سے ملتی جلتی زبان ہے۔ اگر اردو کا رسم خط بدلا گیا تو نہ صرف یہ کہ زبان اپنی انفرادیت کھو کر ہندی میں ضم ہو جائے گی بلکہ وہ سارا ادب جو صدیوں پر محیط ہے برباد ہو جائے گا۔ اردو رسم خط کو دیوناگری رسم خط میں تبدیل کرنے کی تجویزیں بھی قطعاً ناقابلِ عمل رہیں گی۔ اردو کا اپنا مزاج اور اس کی اپنی ایک ادا ہے جسے کوئی لکھاوٹ اپنا نہیں سکتی۔ البتہ اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اردو لکھاوٹ میں کچھ ضروری اصلاحات کی جائیں اور املا میں جو غیر یکسانیت ہے اسے دور کیا جائے۔ اردو زبان اور لکھاوٹ کے لیے زبان کے بنیادی کردار کو قائم رکھتے ہوئے اصلاح کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنے چاہیے اور لکھاوٹ کا Graphemics کی روشنی میں مطالعہ زبان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

اس حصہ کے چاروں مضامین اردو کے اس مسئلہ پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں۔ اس حصہ کا پہلا مضمون محمد اسحاق صدیقی کی معروف کتاب ''فن تحریر کی تاریخ'' سے ماخوذ ہے۔ دوسرا مقالہ پروفیسر مسعود حسن کی مختصر اور جامع کتاب ''اردو زبان اور رسم خط'' سے لیا گیا ہے۔ سر رضا علی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''اعمال نامہ'' میں اصلاحِ رسم خط سے جو بحث کی ہے وہی اس کتاب کی زینت ہے اور آخری مضمون پروفیسر آل احمد سرورؔ کا خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے رسمِ خط پر دتی یونیورسٹی کے سمینار میں پڑھا تھا۔ ان مضامین کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ اردو رسم خط اپنی زبان کے لیے کتنا اہم ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض لکھاوٹیں اپنی زبان سے لسانی اعتبار سے بھی بہت گہرا تعلق رکھتی ہیں اور علمِ زبان رسمِ خط کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اردو رسمِ خط، تاریخ اور فن کے آئینے میں

عربی رسم خط کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذریعے ہیں۔ایک روایات اور دوسرے کتبات ۔ کتبوں کی دریافت موجودہ زمانے کا کارنامہ ہے۔قدیم مورخین نے محض روایات کو سامنے رکھا ہے (جیسے ابن ندیم نے الفہرست میں اور بلاذری نے فتوح نے البلدان میں) جن میں سے بعض مشتبہ ہیں اور بعض کی موجودہ تحقیقات سے تردید ہوتی ہے۔

کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی رسم خط اختیار کرلیا تھا اور چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی تک اس میں تغیر وتبدل کر کے بڑی حد تک انفرادیت پیدا کرلی تھی۔عربی رسم خط کے قدیم اور مشہور ترین کتبے یہ ہیں۔

ابتدائی کتبے :۔

1۔ نقشِ نمارہ (تاریخ تحریر 328) دمشق سے جنوب مشرق نمارہ نامی مقام پر ملا تھا۔اس کی زبان عربی ہے۔لکھائی نبطی ۔لیکن عربی رسم خط کی بعض خصوصیات نمایاں ہیں۔

2۔ نقش زبد (تاریخ تحریر 511) 1079 میں زبد نامی مقام پر حلب کے قریب ملا تھا۔یہ یونانی،سریانی اور عربی تین خطوں میں ہے۔

3۔ نقش حرآن (تاریخ تحریر۔۔۔۔۔ء) یہ جبل الدروز کے شمالی علاقے میں حرآں کے ایک گرجے کے دروازے پر کندہ ہے۔ یہ یونانی اور عربی دو خطوں میں ہے۔

خط کوفی:۔

کوفی خط شہر کوفہ سے منسوب ہے۔ جو کسی وقت مسلمانوں کا علمی مرکز تھا۔ اگرچہ اس خط کا استعمال کوفہ کی بنیاد پڑنے اور عربوں کی فتح شام سے پیشتر بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن یہاں کے کاتبوں نے اس خط کو اتنی ترقی دی کہ وہ کوفی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

چونکہ اسلام میں جان داروں کی تصویریں بنانا منع ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اپنے ذوقِ مصوّری کو حروف کی آرائش و زینت میں صرف کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں کوفی خط نے نہایت خوشنما نقاشی کی صورت اختیار کر لی۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں عرب میں کوفی خط رائج تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ بھی اسی خط میں مراسلت فرماتے تھے۔ آپ نے 6ھ (618) میں مختلف بادشاہوں اور سرداروں کے نام جو تبلیغی خطوط روانہ فرمائے تھے، ان میں سے دو بہت مشہور ہیں۔ ایک خط بحرین (مصر) کے حاکم منذر بن ساری کے نام ہے اور دوسرا خط مقوقس عاملِ مصر کے نام۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ 7ھ میں اُسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے لکھا تھا۔ اس وقت تک حروف پر نقطے دینے اور اعراب لگانے کا رواج نہ تھا۔ چنانچہ فرمانِ رسالت بھی ان علامات سے خالی ہے۔

کوفی رسم خط کے مشہور ترین کتبوں میں یروشلم کے قبۃ الصخراء کا کتبہ خصوصیت کے ساتھ بہت اہم ہے۔ اس کی محرابوں پر جو گنبد کو سنبھالے ہوئے ہیں، نیلے پتھر کے چوکوں کا حاشیہ ہے جس پر سونے کے حروف میں آیات قرآنی منقوش ہیں۔ یہ عمارت خلیفہ عبدالملک نے 72ھ میں بنوائی تھی۔ لیکن بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ المامونؔ نے اس کا نام نکلوا کر اپنا نام درج کرا دیا۔

1۔ کتبے میں سنہ تعمیر 72ھ ہے۔ جبکہ مامونؔ کا زمانہ 198ھ سے 218ھ ہے۔
2۔ کتبے کا سنہ خلیفہ عبدالملک کے زمانہ (65 سے 86 ہجری) کے درمیان ہوتا ہے۔
3۔ عرب مورخین نے اس مسجد کی تعمیر خلیفہ عبدالملک سے منسوب کی ہے۔

4۔ کتبے میں دو سنگی چوکوں کا رنگ دوسرے چوکوں کے مقابلے میں گہرا ہے۔

5۔ ان چوکوں کی عبارت گنجان ہے۔ جن کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اس حصے میں عبدالملک میر لکھا تھا۔ جو عبد (اللہ الامام المامون) میر کے مقابلے میں کم جگہ گھیرتا ہے۔ جب ان چوکوں پر مامون کا نام لکھا گیا تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے حروف کی چوڑائی کم کرنا پڑی۔ قبتہ الضحر اء سے پُرانے کتبے ابتدائی خلفا کے سکوں پر پائے جاتے ہیں جو 20ھ کے بعد کے ہیں۔

عرب مصنفین کی رائے میں کوفی رسم خط سطرنجیلی سے ماخوذ تھا۔ لیکن کوفی رسم خط کے پرانے کتبے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ اُن کے حروف اُسی زمانے کے سُریانی حروف سے کئی باتوں میں مختلف ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعد کا کوفی خط سُریانی سے کسی قدر مشابہت رکھتا ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کوفہ میں سطرنجیلی خط رائج تھا۔ جس کے زیرِ اثر کوفی کو سطرنجیلی انداز سے لکھنے لگے۔

خط نسخ:۔

عربی کا رسم خط خط نسخ کہلاتا ہے۔ قدیم عرب مصنفین کا خیال تھا کہ خط نسخ تیسری صدی ہجری کی ایجاد ہے۔ اور اسے کوفی سے اخذ کیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ خط نسخ کوفی کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کے عہد میں مستعمل تھا۔ خط نسخ کے نمونے کسی طرح کوفی سے کم پُرانے نہیں۔ چنانچہ 132ھ کے دو مصری پاسپورٹ اور ایک نجی مراسلہ جو مصر میں 40 ہجری میں لکھا گیا تھا، موجود ہیں۔ خط نسخ میں لکھے ہوئے قرآن مجید کے چند اوراق پیرس کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے چند اوراق کا رسم خط مصری نہیں بلکہ قدیم مکی یا مدنی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ خط نسخ تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا خطِ کوفی اور وہ کوفی سے ماخوذ نہ تھا بلکہ دونوں نبطی خط سے اخذ کیے گئے۔ کوفی خط کوفہ اور بصرہ میں اور خط نسخ مکہ اور مدینہ میں ارتقا پذیر ہوا۔

اعراب:۔

خلافتِ راشدہ تک حروف پر نقطے نہ تھے اور نہ زیر زبر لگائے جاتے تھے۔ محض

شارات تھے جن کو وہی شخص پڑھ سکتا تھا جو عربی زبان کا ماہر ہو۔ جب اسلام غیر عرب اقوام میں پھیلا تو تلاوت قرآن میں دشواریاں پیش آئیں۔

تقریباً 50ھ میں حضرت علیؓ کے شاگرد ابوالاسود دوئلی نے اعراب ایجاد کیے۔ مگر ان کی صورت نقطوں کی تھی۔ زیر کے لیے حرف کے نیچے ایک نقطہ دیا جاتا تھا۔ زبر کے لیے اوپر پیش کے لیے بازو یا کنارے پر اور تنوین کے لیے دو نقطے لگائے جاتے تھے۔1

جب اسلام مصر اور ایران میں پھیلا تو لوگوں کو ہم شکل حروف مثلاً ج، ح، خ، یا ب، ت، ث وغیرہ کے سبب سے نہ صرف قرآن مجید پڑھنے میں دقتیں ہوئیں بلکہ مراسلات اور روز کی تحریروں کے پڑھنے میں بھی اختلاف ہونے لگا۔ یہ کیفیت دیکھ کر خلیفہ عبدالملک بن مروان نے 65ھ میں حجاج بن یوسف عراق کے گورنر کو رسم خط کی اصلاح کا حکم دیا۔ نصر بن عاصم نے حجاج کے منشاء کے مطابق حرفوں میں امتیاز کرنے کے لیے نقطے وضع کیے اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ منقوطہ حروف پر سیاہ نقطے دیے جائیں اور اعراب کے لیے قرمزی رنگ کے نقطے لگائے جائیں۔ اس طرح حروف منقوطہ میں فرق ہوا۔ نقطوں کے ذریعے اعراب لگانے کا یہ طریقہ تقریباً تیس چالیس سال تک جاری رہا۔ پھر عبدالرحمٰن خلیل بن احمد عروضی (متوفی 100ھ) نے اعراب کی خاص شکلیں وضع کیں۔ جس کے بعد اعراب کے لیے قرمزی رنگ کے نقطوں کا استعمال ترک کر دیا گیا۔2

نئے حروف:۔

پہلے عربی میں کل 22 حروف تھے۔ جن میں بعد ازاں 6 حروف (ث، خ، ذ، ض، ظ، غ) کا اضافہ کیا گیا۔ یہ چھ حروف عربی زبان سے مخصوص ہیں۔3

انھیں (ت، ح، د، ص، ط اور ع) میں ایک ایک نقطہ لگا کر بنایا گیا تھا۔ اور یہی حروف ان نو ایجاد حروف کے ناموں کا بھی ماخذ تھے۔

---

1 ان کا خیال غالباً سریانی سے ماخوذ تھا

2 رسالہ دلگداز مئی 1913 مضمون "ابوالاسود دوئلی" از مولانا عبدالحلیم شرر، اردو رسم الخط از محمد سجاد مرزا صفحہ 6

3 جنوبی سامی خط میں بھی یہ چھ حرف پائے جاتے تھے۔

چوتھی صدی عیسوی میں (لا، لا) ایجاد ہوا۔ لیکن یہ کوئی مستقل حرف نہیں۔ ء کو شامل کر کے عربی حروف کی تعداد 29 مانی جاتی ہے۔

حروف کی ترتیب:۔

پہلے عربی حروف کی ترتیب اس طرح تھی۔

اب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت ث خ ذ ض ظ غ

یہ ترتیب نہایت قدیم ہے (صرف آخری چھ حروف عربوں کا اضافہ ہیں اسی لیے انھیں اخیر میں رکھا ہے) اسے ''ترتیب ابجد'' کہتے ہیں۔ کیونکہ پہلے چار حروف کو ملا کر پڑھنے سے ابجد بنتا ہے۔

بعض نے مخارج کے لحاظ سے حروف کو مرتب کیا ہے۔ چنانچہ کتاب العین میں الخلیل نے اور تہذیب میں الازہری نے مخارجی ترتیب کا لحاظ رکھ کر ان کو درج کیا ہے۔[1]

حروف کی موجودہ ترتیب صورتوں کے لحاظ سے ہے۔ یعنی جو حروف ایک طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ ان کو پاس پاس رکھا ہے۔

اب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ لا ء ی

کہتے ہیں ابن مقلہ (متوفی 328ء) نے بچوں کی سہولت کے لیے حروف کو اس طرح ترتیب دیا تھا۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے۔

اشاعت:۔

عربی رسم خط کی اشاعت میں مذہب اسلام کا بڑا ہاتھ تھا۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا۔ وہاں وہاں عربی رسم خط بھی پہنچا۔ قرآن کا رسم خط عربی ہے۔ اس لیے قرآن پڑھنے کے لیے عربی رسم خط کا سیکھنا ضروری ہو گیا۔ اور عربی رسم خط سے واقفیت ہونے پر مقامی زبانیں بھی اسی رسم خط میں لکھی جانے لگیں۔

عربی رسم خط کے علاوہ مصر، طرابلس، ٹیونس، الجزائر، مراکش، سوڈان، حبش، سومالی لینڈ، زنجبار، لبنان، شام، عراق، ایران، افغانستان، کردستان، مکران، پامیر، پاکستان،

[1] ابجد کی ابتدا'' مجموعہ استفسار و جواب جلد دوم از علامہ نیاز فتحپوری

ہندوستان، قازان، ملایا اور جاوا میں مستعمل ہے۔ اور ایک زمانہ تھا جب وہ اندلس صقلیہ، مداغاسگر اور ترکی میں بھی رائج تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں عربی رسم خط کو منسوخ کر کے رومن کو رواج دیا۔

مسلمانوں میں فن خطاطی کی غیر معمولی ترقی کا خاص سبب مذہب تھا۔ بعض حدیثوں میں جانداروں کی تصویریں بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے مصوری کا ذوق رکھنے والے لوگ حروف کی تزئین و آرائش کی طرف مائل رہے۔

چینی آرٹ اور مانوی مذہب نے بھی مسلم خطاطی کو متاثر کیا۔ مانی کے متبعین نہ صرف اپنی کتابوں کو خوش خط لکھتے بلکہ طرح طرح کے نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے۔ اگرچہ مسلمان انھیں زندیق کہتے تھے، تاہم ان کے فن کے قائل تھے۔ اُن کے جواب میں انھوں نے مسلم خطاطی کو بھی پیش کیا اور زمانہ سلف کی تمام اقوام پر سبقت لے گئے۔

عربی حروف میں کچھ ایسا لوچ ہے کہ تھوڑے ہی زمانے میں اس ایک خط سے درجنوں خط اور سینکڑوں طرح کے آرائشی نقوش پیدا ہو گئے۔ یہ نقوش اتنے خوشنما تھے کہ اہلِ یورپ عرصے تک انھیں محض آرائش سمجھ کر اپنی مصنوعات پر نقل کرتے رہے چنانچہ

1۔ مرسیا کے بادشاہ آدفا جس کا زمانہ 757 سے 796 عیسوی ہے۔ اپنے سکوں پر کوفی خط میں کلمہ طیبہ نقش کرایا تھا۔

2۔ نویں صدی عیسوی کی ایک آئرش صلیب پر کوفی خط میں بسم اللہ لکھا ہے۔

3۔ بعض مصوروں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے لباس پر زینت کے لیے کوفی عبارتیں نقل کی ہیں۔

4۔ سسلی کے نارمن بادشاہ راجر دوم (1130 تا 1154) کی تصویر میں تاجپوشی کے لباس پر کوفی کتبہ پایا جاتا ہے۔[1]

5۔ اٹلی، اسپین، اور فرانس کے متعدد کلیساؤں اور خانقاہوں پر آرائش کے لیے آیات

1- P.K Hitti "History of the Arabs"(edinburgh 1940) pages 608,615

M. Ziauddin "Moslem calligraphy "(calcutta 1936) page 7.

قرآنی منقوش نظر آتی ہیں۔

یوں تو عربی رسم خط جس ملک میں پہنچا وہاں کے لوگوں نے اس میں اپنی ضروریات اور ذوق کے مطابق تبدیلیاں کیں۔ لیکن تین ملکوں، عراق، ایران، اور ہندوستان سے خطاطی کا خاص تعلق رہا ہے۔ اس لحاظ سے فنِ خطاطی کی تاریخ کے تین دور مقرر ہو سکتے ہیں۔

پہلا دور (عراق):۔

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں دو خطاطوں کا پتہ چلتا ہے۔ قطبہ جس نے خطِ کوفی سے بادنیٰ تغیر چار خط ایجاد کیے۔ اور خالد جس نے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد (99ھ 101ھ) میں پہلا طلا کار قرآن مجید تیار کیا۔ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی کا طلائی کتبہ اسی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔[1]

عہد مہدی عباسی کے نامور فاضل خلیل بن احمد نحوی (متوفی 170ھ) نے خط کوفی کی اصلاح کی اور موجودہ اعراب ایجاد کیے۔ مامون رشید کے استاد علی بن حمزہ کسائی (متوفی 182ھ) نے خط کوفی پر نظر ثانی کی۔ مامون کو قدیم خطاطوں کی وصلیاں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس کے خزانے میں عہدِ قدیم کے جملہ خطوں کے نمونے موجود تھے۔[2]

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ایران میں اسلام کی اشاعت سے پہلے سات خط رائج تھے۔

1۔ دین دفتریہ، 2۔ دیش دبیریہ، 3۔ اکستج، 4۔ شاہ دبیریہ، 5۔ نامۂ دبیریہ، 6۔ راز سہریہ، 7۔ راس سہریہ۔ انھیں ایرانی ہفت قلم کہتے تھے۔ ان میں سے بعض (7-3) طب، فلسفہ اور منطق وغیرہ کی کتابیں لکھنے کے لیے مخصوص تھے۔ اور بعض (6,4) خفیہ مراسلت میں استعمال کیے جاتے تھے۔[3]

1۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی ''علم الحروف'' دہلی (1934) صفحہ 61
2۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی ''علم الحروف'' دہلی (1934) صفحہ 64
3۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی ''علم الحروف'' دہلی (1934) صفحہ 64

ان کے جواب میں مسلمانوں نے ہر ضرورت کے لیے ایک علاحدہ خط ایجاد کیا۔ اور مامون رشید کے زمانے تک خط کوفی سے درجنوں شاخیں پیدا ہو گئیں۔[1]

خط کوفی کی شاخیں:۔

1۔ قلیم الجلیل:۔ جس میں مسجدوں کے کتبے اور بادشاہوں کے خط لکھے جاتے تھے۔ یہ جلی خط تھا۔

2۔ قلم السجلات:۔ سجل کے معنی قبالہ ودستاویز کے ہیں۔ اس میں دستاویزیں لکھی جاتی تھیں۔ یہ نمبر ایک سے ماخوذ تھا۔

3۔ قلم الدیباج:۔ اس کا ماخذ بھی نمبر (1) تھا۔ غالباً یہ خط پہلے دیباج پر لکھنے کے کام آتا تھا۔ جو ایک قسم کا باریک ریشمی کپڑا ہوتا ہے۔ پھر اس خط میں کتابوں کے شروع کے حصے لکھنے لگے اور انھیں دیباچہ کہا جانے لگا جو فارسی میں دیباچہ ہو گیا۔

4۔ قلم طومار:۔ یہ 2۔ اور 3 کی ترکیب سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی دو قسمیں تھیں۔ طومار کامل یا طومار الکبیر اور مختصر الطومار۔ طومار کے معنی طویل خط کے ہیں۔

5۔ قلم الثلثین:۔ یہ طومار کی شاخ تھا۔ دربار خلافت سے عمال کے نام اسی خط میں مراسلت ہوتی تھی۔

6۔ قلم الزنبور:۔ یہ طومار اور ثلثین سے مل کر بنا تھا۔

7۔ قلم المفتح:۔ یہ ثلثین اور سطر نجیلی سے ماخوذ تھا۔ اسے خط ثقیل بھی کہتے تھے۔

8۔ قلم المؤامرات:۔ اسے امرائے دولت صلاح، مشورے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

9۔ قلم الحرم:۔ خواتین حرم سے مراسلات کے لیے مخصوص تھا۔

10۔ قلم العہود:۔ سلاطین کے معاہدات کے لیے مخصوص تھا۔

11۔ قلم القصص:۔ قصے کہانیاں اس خط میں لکھی جاتی تھیں۔

12۔ قلم الخرفاج:۔ ثلثین کی شاخ تھا۔

ان کے علاوہ عہد مامون میں قلم الرصع، قلم النساخ، مقطوع، الحوائجی، قلم التجار علیہ، خط

(1۔ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی "علم الحروف" دہلی (1934) صفحات 67-66، 75، 74)

مدبج، خط رباش، خط رخش، خط بیاض، اور خط حواشی، بھی رائج تھے۔ لیکن افسوس کہ مشہور خطاطوں کی وصلیاں دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ اور آج یہ بھی نہیں معلوم کہ ان خطوں کی شان کیا تھی اور ان میں باہم فرق کیا تھا۔

مشہور خط :۔

1۔ خط ثلث :۔ صبح الاعشیٰ (مصنفہ علامہ ابوالعباس احمد قلقشندی مطبوعہ مصر) کے مطابق خط ثلث و ثلثین میں معمولی فرق تھا۔ ثلثین ایک ہلکا اور سبک قلم تھا۔ جسے ابراہیم الشجری شاگرد اسحٰق بن حماد شاہ نے ایجاد کیا تھا۔

2۔ خط نسخ :۔ غالباً یہ اور قلم النساخ ایک ہی تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ نامعلوم ہے یہ تاویل کہ خط نسخ کی ایجاد نے قدیم خطوں کو منسوخ کر دیا مشتبہ ہے۔

غالباً یہ اور قلم الجنح ایک ہی تھے۔ حد سے زیادہ باریک خط تھا۔ اسی نامہ بر کبوتر کے بازو میں باندھنے کے لیے ایک پرزے پر لکھا جاتا تھا۔

3۔ خط توقیع :۔ اس کا موجد ابراہیم الشجری کا بھائی یوسف (شاگرد اسحٰق بن حماد شامی) تھا۔ اسے مامون رشید کے وزیر فضل بن سہیل ذوالریاستین نے خاص طور سے پسند کیا اور دفتر انشاء کے کاتبوں کو ہدایت کر دی کہ جملہ فرامین (توقیعات) اس خط میں لکھے جائیں۔ اس کے نام پر یہ خط قلم الریاسی کہلایا اور اسے مناشیر بھی کہتے ہیں۔ کسی کا قطعہ ہے۔

نگار من خط خوش می نوید بغایت خوب دل کش می نوید
مناشیر و محقق و نسخ و ریحاں رقاع و ثلث ہر شش می نوید

4۔ خط رقاع:۔ یہ خط چھوٹے چھوٹے پُرزوں یا رقعوں پر لکھا جاتا تھا۔اس لیے یہ رقاع کے نام سے مشہور ہوا۔

5۔ خط محقق:۔ چونکہ اس کے حروف کی پیائش میں بڑی تحقیق سے کام لیا گیا تھا۔اس لیے محقق کہلایا۔اس میں معاہدے،دستاویزیں اور شاہی خط لکھے جاتے تھے۔

6۔ خط ریحاں:۔ کہتے ہیں۔یہ خط خوبصورتی میں ریحاں کی سی نزاکت رکھتا تھا۔اس لیے ریحاں کے نام سے مشہور ہوا۔لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اسے عہدِ مامون کے نامور خطاط ریحانی (متوفی 834ء) نے ایجاد کیا تھا۔اور اسی کے نام پر اس کا نام پڑا۔

مشہور خطاط:۔

ابنِ مقلہ خط کوفی کا مصلحِ اعظم تھا۔وہ 272ھ میں پیدا ہوا۔تکمیل علوم وفنون کے بعد یکے بعد دیگرے تین خلفاء (المقتدر،القاہر،الرّاضی) کا وزیر رہا۔لیکن حاسدوں نے خلیفہ راضی باللہ کو اس کا مخالف بنا دیا۔جس نے اس کا دایاں ہاتھ کٹوا کر قید خانے میں ڈال دیا۔تب اُس بلند حوصلہ شخص نے قلم بازو سے باندھ کر لکھنا شروع کر دیا اور پھر بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی اور اس سے بھی اتنا ہی اچھا لکھنے لگا جتنا کہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔افسوس کہ یہ باکمال 56 سال کی عمر میں خلیفہ کے حکم سے قتل کیا گیا۔مشہور ہے 310ھ میں ابن مقلہ نے خط کوفی سے چھ خط ایجاد کیے۔

1۔خط ثلث، 2۔خط نسخ، 3۔خط توقیع، 4۔خط رقاع، 5۔خط محقق، 6۔خط ریحاں۔
لیکن جناب اطہر حسین جعفری نے اپنے مضمون "تین خطوں کے موجد ابن مقلہ" (مطبوعہ آج کل۔دہلی۔فروری 1957) میں انھیں صرف محقق، ریحاں اور نسخ کا موجود بتایا ہے۔اور ہم یہ پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ خط ریحاں کا موجد ریحانی تھا۔خط نسخ ابن مقلہ سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔اس لیے وہ اس کے موجود نہیں ہو سکتے۔غالباً انھوں نے اس خط کی اصلاح کی تھی اور خوش نویسی کے اصول مقرر کیے تھے۔خط محقق کو بعض نے ابن بواب کی ایجاد بتایا ہے۔خط توقیع کا موجد یوسف

(شاگرد اسحٰق بن حماد شامی) تھا۔ رہا خط ثلث سو یہ خط ثلثین سے کسی قدر مختلف تھا۔اور ثلثین کا موجد یوسف کا بھائی ابراہیم الشجری (شاگرد اسحٰق بن حماد شامی) تھا۔

ابن بواب:۔ابن مقلہ کے تقریباً 84 سال بعد ابوالحسن علی پیدا ہوا۔ چونکہ اس کا باپ ہلال امیر بویہ کا دربان تھا اس لیے وہ ابن بواب کے نام سے مشہور ہوا۔اس نے سمسانی اور محمد بن اسد سے خطاطی سیکھی تھی جو ابن مقلہ کے شاگرد تھے۔

مورخ ابن خلکان اور امام یافعی کی رائے میں متقدمین اور متاخرین میں کوئی کاتب ابن ہلال کے درجے تک نہیں پہنچتا۔ خطِ نسخ کی تہذیب اور آرائش کا سہرا اُسی کے سر ہے۔ یہ نامور خطاط 413ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا۔ آج دنیا میں جہاں جہاں خط نسخ رائج ہے۔ جملہ خطاط ابن مقلہ اور ابن بواب کے مرہون منت ہیں۔

یعقوت مستعصمی:۔عہدِ عباسیہ کا آخری مشہور خطاط مستعصم باللہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ وہ خط نسخ کا استاد اور ایک خاص طرز کا موجد تھا جو اس کے نام پر خط یاقوت مشہور ہوا۔اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔698 میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

دوسرا دور (ایران):۔

جب عربی رسم خط عجم پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اس میں مزید اصلاح کی۔ حسین بن حسین علی فارسی (عماد الدولہ یا عضد الدولہ دیلمی کے کاتب) نے چوتھی صدی ہجری میں خط رقاع اور توقیع سے ایک نیا خط وضع کیا جو تعلیق کے نام سے مشہور ہوا۔ چنانچہ مولانا جامی فرماتے ہیں۔

کاتباں را ہفت خط باشد بطرزِ مختلف
ثلث و ریحان و محقق ، نسخ و توقیع ورقاع
بعدازاں تعلیق آں خط است کش اہلِ عجم
از خطِ توقیع استنباط کردند اختراع

خط تعلیق شاہی رسل ورسائل، سرکاری کاروبار اور عام مراسلات میں استعمال ہوتا تھا۔

اس لیے اس کا دوسرا نام خط ترسیل بھی مشہور ہوگیا۔[1]

یہ خط پیچیدہ تھا۔ اس کے حرفوں کے پیچ وخم دیکھ کر قاآنی نے ایک موقع پر کہا ہے۔

اے زلفِ تو پیچیدہ تر از خط ترسّل

بر دامنِ زلفِ تو مرا دستِ توسّل

خواجہ ابوالعالی بک نے فارسی زبان کے مخصوص حروف پ، چ، ژ، اور گ ایجاد کیے (پہلے گ پر بجائے دو لکیروں کے تین نقطے رکھے جاتے تھے) اور خطِ تعلیق میں اتنی اصلاح کی کہ لوگ انھیں کو اس کا موجد سمجھنے لگے۔

امیر تیمور کے زمانے (771-801ہجری) میں خواجہ میر علی تبریزی نے خطِ نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد کیا جو نستعلیق (مخفف نسخ وتعلیق کا) کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے شاگرد مولانا سلطان علی مشہدی فرماتے ہیں۔[2]

نسخ و تعلیق گر خفی وجلی است

واضع الاصل خواجہ میر علی است

وضع فرمود اوز ذہن دقیق

از خط نسخ و از خطِ تعلیق

لیکن علامہ ابوالفضل نے دیباچہ مرقع بادشاہی میں لکھا ہے کہ میں نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیق کی وصلیاں دیکھی ہیں۔ اس لیے میر علی تبریزی نستعلیق کے موجود نہیں ہوسکتے۔ اس کا موجد کوئی اور تھا (بعض نے) یاقوت مستعصمی کا نام لکھا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ میر صاحب نستعلیق کے مصلح اول ہیں۔

نستعلیق میں تکلف ونزاکت اس قدر ہے کہ چند خوش خط سطریں گھنٹوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس دقت کو دور کرنے کے لیے حاکم ہرات مرتضیٰ قلی خاں شاملو نے 1100ھ میں

---

[1] اردو رسم خط۔ از محمد سجاد مرزا۔ حیدرآباد دکن 1940 ص 9

[2] انھوں نے اپنے استاد کے حالات ایک مثنوی میں لکھے ہیں جس کے اشعار بالا منقول ہیں (مجالس المومنین قاضی نور اللہ شوستری) علم الحروف، ص 10

نستعلیق اور تعلیق کو ملا کر (بعض نستعلیق اور ثلث بتاتے ہیں) ایک نیا خط وضع کیا۔ جو خطِ شکستہ کے نام سے مشہور ہوا۔ دراصل یہ نستعلیق کی مختصر صورت ہے اور اس کا منشاز ودنویسی ہے۔ اس کے دائرے اور شوشے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن ان ٹوٹے ہوئے حروف میں بھی خاصی دلکشی ہے۔ یہ خط خانگی اور دفتری مراسلت کے لیے رائج ہوگیا۔ اس سلسلے میں مرتضیٰ قلی کے میر منشی محمد شفیع نے خط شکستہ اور نستعلیق سے (بعض ریحان کہتے ہیں) ایک نیا خط ایجاد کیا شکستہ آمیز یا شفیعہ کہتے ہیں۔

مشہور خطاط:۔

میر علی ہروی:۔ میر علی تبریزی اور ان کے شاگردوں کے بعد ابوالفضل نے میر علی ہروی کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے۔ یہ ہرات کے رہنے والے تھے۔ 909ھ میں رسم الخط پر ایک رسالہ لکھا جو برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے۔ ان کی لکھی گلستاں پیرس کی لائبریری میں اور مطلع الانوار پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے۔

محمد حسین تبریزی:۔ (دسویں صدی ہجری) سید احمد مشہدی کے شاگرد اور میر عماد کے استاد تھے۔ پہلے شاہ اسمٰعیل ثانی کے وزیر تھے۔ لیکن بعد کو جب بادشاہ ناخوش ہوگیا تو ہندوستان چلے آئے اور یہیں ساری عمر بسر کردی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان امیر شاہی کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔[1]

میر عماد الحسینی قزوینی:۔ اصفہان میں درویشانہ وضع سے رہا کرتے تھے۔ شاہ عباس صفوی نے انھیں شاہنامہ فردوسی لکھنے پر مامور کیا اور معاوضہ صرف 70 تومان (سونے کا ایک سکہ) مقرر کیا۔ جب سال گزر گیا تو بادشاہ نے کتاب منگوا بھیجی۔ میر عماد نے 70 اشعار پیش کردئے اور کہلا بھیجا کہ 70 تومان میں صرف اتنا ہی لکھا جاسکتا ہے۔ اس پر بادشاہ برہم ہوا اور بات یہاں تک بڑھی کہ 1024ھ میر صاحب کو بہ عمر 63 سال حمام میں قتل کروادیا۔

عبدالرشید دیلمی:۔ یہ آقا رشید کے نام سے مشہور ہیں۔ میر عماد کے بھانجے داماد اور

[1] علامہ نیاز فتحپوری۔ نگار سالنامہ 1955 ''علوم اسلامی وعلمائے اسلام نمبر''، ص 138-137

انھیں کے شاگرد تھے۔ میر عماد کے انجام سے خوفزدہ ہو کر شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان چلے آئے جس نے انھیں درباری خوش نویس اور شاہزادہ دارالشکوہ کا استاد مقرر کیا۔ 1081ھ یا 1085 میں بمقام آگرہ انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

تیسرا دور (ہندوستان):

اردو رسم خط:۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے اردو زبان کی ابتدا ہوئی تو ہندو اسے دیوناگری خط میں اور مسلمان فارسی خط میں لکھتے تھے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ اس نئی زبان کے لیے فارسی خط زیادہ موزوں ہے کیونکہ اردو میں بہت سے الفاظ عربی فارسی کے شامل ہیں جن کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے دیوناگری میں نشانات نہ تھے۔ اس لیے اردو زبان کے لیے فارسی خط اختیار کر لیا گیا۔ ہندی کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے ط اور ھ کے اضافے سے 14 نئے حروف (ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ) بنائے گئے۔ پہلے ٹ، ڈ، اور ڑ پر بجائے ط کے چار نقطے (: :) رکھے جاتے تھے۔ ان کی جگہ ط نے کب لی۔ یہ امر تحقیق طلب ہے۔ سندھی خط سے اس مسئلے پر کچھ روشنی پڑتی ہے جس میں بعض حروف پر چار نقطے لگائے جاتے ہیں۔

سندھی رسمِ خط

ا الف	ب بے	ب ٻ	پ بھے	ت تے	ث تھے	ث ٹے	ت ٹھے
ث ثے	پ پے	ف پھے	ج جیم	ڄ یے	جھ جھ	ڃ یں	چ جے
ڇ چھے	ح حائے	خ خائے	د دال	ڌ دھال	ڏ ڈے	ڊ ڈے	د ڈھے
ذ ذائے	ر رے	ڙ ڑے	ز زے	س سے	ش شے	ص صاد	ض ضاد
ط طوئے	ظ ظوئے	ع عین	غ غین	ف فے	ق قاف	ک کے	گ گھے
گ گے	گ گ	گھ گھے	گ نگے	ل لام	م میم	ن نون	ن ڑیں
		و واوَ	ھ ھے	ی یے	ء ہمزہ		

لفظوں کے اضافے سے نئے حروف کی ایجاد ایک عام بات ہے۔ لیکن سندھی خط
میں یہ چیز انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ سندھی کا رسم خط اگرچہ نسخ ہے لیکن اُس میں فارسی کے مخصوص

(پ، چ، گ) بھی کام آتے ہیں۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاید اردو سے پہلے سندھی کے لیے عربی، فارسی خط اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ:

1۔ ڑ کی پرانی صورت (ڑ) اب تک سندھی میں پائی جاتی ہے۔ سندھی کے بیشتر حروف چار نقطوں کے اضافے سے بنے ہیں۔ اردو والوں نے پہلے اس کو نقل کی لیکن بعد میں ط اور ھ کے اضافے سے نئے حروف بنانا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور اس کی تحریک غالباً سندھی خط سے ہوئی جس میں بعض حروف ط اور ھ کے اضافے سے بنائے گئے تھے۔

2۔ سندھی کے صرف ایک حرف (ٹ) پر ط کا اضافہ کیا گیا ہے جب کہ اردو میں تین حروف (ٹ، ڈ، ڑ) پر ط نظر آتا ہے۔

3۔ سندھی کے صرف دو حروف (جھ، گھ) میں ھ پایا جاتا ہے جب کہ اردو کے گیارہ حروف ھ کے اضافے سے بنے ہیں۔

---

1 ایسے خانوں کے حروف کی آوازیں سندھی سے مخصوص ہیں انھیں آہستہ سے ادا کیا جاتا ہے

اردو رسمِ خط کی علمی حیثیت

ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسمِ خط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسمِ خط پر ترجیح دیتے ہیں اور اردو کی موجودہ تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ظاہر میں یہ اعتراض جہت وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے۔ مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس کے فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جو ایک مثال سے سمجھ میں آ جائے گی۔ فرض کیجیے کہ کہیں لفظ خط لکھا ہوا ہے۔ اسے تین طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔ خَط، خِط، خُط مگر خِط اور خُط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور خط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے جہاں کہیں ہم خط لکھا ہوا دیکھیں گے اسے بلا تامل خط ہی پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر خِط یا خُط کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں خِط یا خُط کوئی لفظ نہیں ہے اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اِس موقع پر وہ لوگ نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو اردو زبان سے واقف نہیں۔ مگر صرف حروف سیکھ کر کسی زبان کی تحریروں کا بالکل صحیح پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس میں اردو کی کیا تخصیص ہے۔ پھر یہ اتفاق تو شاذ و نادر ہی ہوگا کہ جو شخص اردو نہ جانتا ہو وہ اردو کی تحریریں پڑھنا چاہے۔ ایسے نادر اتفاقات کے خیال سے اردو کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ اگر لفظوں پر اعراب لگے ہوئے ہوں تو ایک حرف شناس آدمی بغیر مطلب سمجھے ہوئے بھی اردو کی عبارت پڑھ سکتا ہے۔ آخر اعراب بھی تو ہمارے رسم الخط کا ضروری جزو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ابتدائی درسی کتابوں کے علاوہ اعراب کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور یہ مہارت پیدا کر لیتے ہیں کہ بغیر اعراب کے کسی تحریر کو روانی کے ساتھ پڑھ لیں۔

یہ مہارت پیدا کرنے میں اردو رسم خط کی ایک خاص خصوصیت سے بہت مدد ملتی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ اردو تحریر میں لفظ کا اصل ڈھانچہ صرف حروف صوت (Consonants) سے بنتا ہے۔ اعراب (Vowels) اس ڈھانچے کے اندر بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ حرفوں کے اوپر یا نیچے الگ سے لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی لفظ کو پڑھتے وقت نگاہ اور توجہ کا مرکز اس کا اصل ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نقش جو دماغ میں بنتا ہے اس میں اس کا ڈھانچہ بہت اجاگر ہوتا ہے اور اعراب دھندلے۔ اور چونکہ اعراب کو ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اس لیے اردو عبارت بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لی جاسکتی ہے۔ یہ بات ان تحریروں میں پیدا نہیں ہوسکتی جن میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ناگری اور رومن تحریروں میں ہوتا ہے۔

اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا پڑھنا ناگری تحریر میں اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اردو تحریر میں۔ جو شخص اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اردو عبارت آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اردو تحریر کوئی سوا سو برس سے کچہریوں اور دفتروں میں استعمال کی جارہی ہے اور اس سے پہلے بھی جب کچہریوں اور دفتروں کی زبان فارسی تھی تب بھی یہی حروف سیکڑوں برس استعمال میں رہ چکے تھے۔ پولیس کچہری والوں کی گھسیٹ لکھائی لفظوں کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ پھر بھی ان حرفوں کی وجہ سے کوئی خاص دقت کبھی پیش نہیں آئی۔ کبھی

سننے میں نہیں آیا کہ اس رسمِ خط کی خرابی سے ایک فریق کی جگہ دوسرے پر ڈگری ہوگئی ہو۔ یا مجرم کی جگہ کوئی بے قصور سزا پا گیا ہو۔ صدیوں کے ان عملی تجربوں کے مقابلے میں خیالی اعتراض اور فرضی دشواریاں کیا اہمیت رکھتی ہیں؟

فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہوگئے تھے کہ ہندی کتابیں بھی انھیں حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو بلند درجہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں اور خود میرے مختصر کتابی ذخیرے میں ہندی کی کئی کتابیں فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:

1۔ سُندر سنگار — مصنفہ سندر کوی
2۔ رسارنو — سکھ دیو کوی۔ نائکا بھید۔ گنگادھر نے 1213ھ میں نقل کی
3۔ بھاکھا بھوکھن النکار — 1213ھ میں نقل کی گئی۔
4۔ امر چندرکا۔ بلاغت — مصنفہ: اَمرلیس
5۔ رَسک پریا — مصنفہ: کیشو داس
6۔ رس راج — مصنفہ: متی رام۔ منالال، شیو پرشاد، امید علی، اور طالب حق نے 1218ھ میں نقل کی۔
7۔ رام چندر چندرکا — مصنفہ: کیشو داس۔ سمبت 1860 میں نقل کی گئی۔
8۔ ایکارتھ — مصنفہ: نند داس
9۔ نام مالا — 1215ھ میں نقل کی گئی
10۔ انور چندرکا — مصنفہ: انور کوی
11۔ لیلاوتی ٹیکا — مصنفہ: ودّیادھر
12۔ بھگود گیتا — مصنفہ: ہری بلبھ۔ سمبت 1874 میں نقل کی گئی

13 و 14۔ دو رسالے نائکا بھید پر

15۔ ایک منظوم کتاب مصنفہ: بہاری لال

16۔ ایک مجموعہ جس میں رحیم، احمد، تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ناگری کے مقابلے میں اردو کی تحریر بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ناگری کا سیکھنا نسبتہً کچھ آسان ہو، مگر اتنا آسان نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ اردو اور ناگری تحریروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تفصیلی اور طولانی بحث درکار ہے۔ اس سلسلے میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا ہیں۔

1۔ اردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں۔

2۔ اردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

3۔ ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس سے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دیر لگتی ہے اور لکھنے میں بھی۔

4۔ ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ثقیل آوازیں حقیقت میں نئی آوازیں نہیں ہیں، بلکہ خفیف آوازوں میں ھ کی آواز شامل ہونے سے بن جاتی ہیں۔ اردو تحریر میں اس حقیقت پر نظر رکھی گئی ہے اور ثقیل آوازوں کے لیے علاحدہ علامتیں مقرر کر کے حرفوں کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کو ظاہر کرنے کے لیے معمولی حرفوں کے ساتھ ھ لکھ دی جاتی ہے۔ رومن رسم خط میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ت کی ثقیل صورت تھ کے لیے T کے ساتھ H لکھ دیا جاتا ہے۔ جیسے: Theme, Thin, Mathew, Thorax, Thursday, Thought, Thank ناگری میں بھی جن ثقیل آوازوں کے لیے مخصوص حرف موجود نہیں ہیں وہ اسی طرح لکھی جاتی ہیں کہ معمولی حرفوں

کو (g) کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً: کولھو، چولھا، آلھا، کلہاڑی، کمہار، تمھاری، ننھا، کنھیا میں لھ، مھ، اور نھ کی آوازیں یوں ظاہر کی جاتی ہیں Ug Eg Yg اسی طرح کل ثقیل آوازیں ظاہر کی جاسکتی تھیں۔ ان کے لیے علاحدہ علاحدہ علامتیں مقرر کرنے سے

ناگری حرفوں کی تعداد بلاضرورت بڑھ گئی۔اس کے باوجود ر اور ھ کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوئی ہے جیسے سرھانا، وہ ناگری تحریر میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ڑ اور ھ کی مخلوط آواز کا ہے جیسے گاڑھا،کڑھائی، چڑھنا،گڑھ۔

5۔ ناگری میں زبر کی حرکت حرف کی ذات میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفوں کی تمام حرکتوں کے لیے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں،مگر زبر کے لیے کوئی ماترا نہیں ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملا کر لکھتے ہیں اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔اس طرح دو دو حرفوں کے ملانے سے جو نئی صورتیں یا مرکب حرف بنتے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔بعض موقعوں پر تین تین حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں۔میڈیکل ہال پریس، بنارس میں 1877 کی چھپی ہوئی ہندی پرائمر میں ناگری کے دہرے اور تہرے حروف دیے ہوئے ہیں۔دو دو حرفوں[1] کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں اُن کی تعداد 382 اور تین تین حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں اُن کی تعداد 67 ہے۔اس طرح ناگری کے مرکب حرفوں کی مجموعی تعداد 449 ہوئی۔دو تین حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اصول بھی مقرر نہیں ہے۔اس لیے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

6۔ ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ہے۔مشدد حرف ادھورا لکھ کر پورے حرف سے ملا دیا جاتا ہے۔ادھورے حرفوں کی صورتیں اور ان کو پورے حرفوں سے ملانے کے طریقے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو یاد رکھنے کے لیے بہت محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔اردو تحریر میں حرف پر تشدید کی چھوٹی سی علامت بنا دینا کافی ہوتا ہے۔

7۔ ناگری میں حرف ر کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں جو مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر مختلف صورتوں سے لکھی جاتی ہیں۔اسی طرح نونِ غنہ کے لیے کئی علامتیں ہیں

1۔ یہ پرائمر کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے لیے چھاپی گئی تھی۔
اس کا ایک نسخہ مکرمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ادیب

جو مختلف حرفوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حرف ش کی آواز کے لیے بھی ناگری میں دو حرف ہیں۔ بعض لفظوں میں ایک حرف لکھا جاتا ہے بعض میں دوسرا۔

8۔ بعض آوازوں کے لیے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے۔ خواہ ایک حرف لکھا جائے خواہ دوسرا جیسے ()، اور (v)۔( ) اور (k÷) (jkk) اور ( )۔

9۔ کھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ راور و کی علامتوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔ مثلاً دوا کھانا ہے لکھا جائے تو اس کو دوا روانہ ہے، بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور اب خ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے نیچے نقطہ بھی نہیں دیا جاسکتا اس لیے اب اس فقرے کو دواخانہ ہے، بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ چیزیں ناگری تحریر میں اچھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہیں اور ان سب پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے تمام لفظوں کو بھی فقط سن کر ناگری حرفوں میں صحیح طور پر لکھ لینا ممکن نہیں ہے۔ سینکڑوں لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے بڑی مدت اور کافی محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناگری کے بعض حرف جو صرف سنسکرت لفظوں میں آتے ہیں ان کی صورت بہت پیچیدہ اور تلفظ نہایت مشکل ہے۔ یہ حروف ہندی الف بے سے تقریباً خارج کر دیے گئے تھے۔ مگر اب جب کہ ہندی لفظوں کا تلفظ اصل سنسکرت کے مطابق کیا جارہا ہے۔ اور سنسکرت کے نئے الفاظ ہندی میں کثرت سے داخل کیے جارہے ہیں تو وہ حروف بھی استعمال میں آئیں گے اور تحریر کی دقتوں کو بڑھائیں گے۔

ناگری رسم خط کے طرف دار اکثر ان دقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو تحریر سیکھنے میں ناگری سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، تو بھی آخر میں اردو ہی کی تحریر زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ یعنی اگر ایک آدمی تیس چالیس برس تک برابر اردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ناگری حرفوں میں تو اردو میں لکھنے والے کے کام کی مقدار زیادہ نکلے گی اور اس کو ابتدا میں جو تھوڑے سے وقت کا نقصان پہنچا تھا اس سے کہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اردو کی تحریر ایک

طرح کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) ہے۔ جس کو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص پڑھ لکھ سکتا ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی اور اس عجلت پسندی اور اقتصادی کش مکش کے زمانے میں یہ وقت اور کاغذ کی بچت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعوے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ یہ دعوے حقیقت سے بہت دور ہیں۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ World, Dog, Pen, Was, Mirage, Bird کے سے معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے، دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہو سکتا۔ مثلاً یہ، وہ، چھاؤں، کھڑاؤں، چناؤ، پھیلاؤ، دکھاو، سناؤ، سرھانا، جواہر، نہرو۔ اِن حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جا سکتے ہیں۔ اردو رسم خط کے لیے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا تو بے خوف تردید کیا ہی جا سکتا ہے کہ اردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

ناگری میں ڑ اور ڑھ کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ ڈ اور ڈھ کے نیچے ایک نقطہ لگا کر یہ آوازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔ اسی طرح چند قریب المخرج حرفوں کے نیچے نقطہ لگا کر خ، ذ، ز، ض، ظ، غ، ف، ق کی آوازیں ادا کرنے کا نہایت آسان طریقہ رائج تھا۔ لیکن اتر پردیش کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت نے تعلیم، کتابت، طباعت، وغیرہ کے بڑے بڑے ماہروں کے مشورے سے ناگری خط میں جو اصلاحیں کی ہیں ان کی رو سے اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اس طرح متعدد آوازیں ناگری رسم خط سے خارج ہو گئیں اور اردو کے ہزاروں اور انگریزی، فرانسیسی وغیرہ کے سینکڑوں لفظ جن میں یہ آوازیں شامل ہیں۔ اگر ناگری خط میں لکھے جائیں تو ان کی ہیئت ہی بگڑ جائے گی۔ فیض، پھیج، غالب، گالب، اور غزل، گجل، ہو جائے گی۔ خزانہ، کھجانا، خربوزہ، کھربوجا، اور افریقہ، اپھریکا بن جائے گا۔ ٹیلی فون، ٹیلی پھون، فرانس، پھرانس، فزکس، پھجکس ہو جائے گا۔ اس طرح اب اردو کے لیے ناگری رسم خط اور زیادہ

ناموزوں ہوگیا ہے۔

اگر کسی حیثیت سے ناگری تحریر اردو تحریر سے بہتر ٹھہرے تو بھی اس حقیقت کا انکار نہ کیا جاسکے گا کہ ناگری خط ہندوستان کے بعض حصوں کے سوا دنیا کے کسی اور خطے میں مستعمل نہیں ہے اور اردو کا رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں، یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے ایک بڑے حصے میں رائج ہے۔ اور دنیا کی کئی زبانیں انھیں حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ہندوستان کو ان تمام ملکوں سے تجارتی اور تہذیبی تعلقات قائم کرنا ہیں تو اردو زبان کے ساتھ فارسی خط کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ فارسی خط تو ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے۔ اس کو ترک کرنے کا کیا ذکر، اگر ہندوستان کو اپنے پاس پڑوس کے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا ہیں، تو اس کو برمی، چینی، جاپانی، روسی وغیرہ کے رسم خط بھی سیکھنا پڑیں گے۔

اردو کی تحریر کو اور زیادہ آسان بنانے کے خیال سے بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، یہ آٹھ حرف اردو کے حروف تہجی سے خارج کر دئے جائیں، اس لیے کہ جو آوازیں ان حرفوں سے ادا کی جاتی ہیں۔ ان کے لیے دوسرے حروف موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں کا ہر حرف ایک مخصوص آواز کی علامت ہے جو کسی دوسرے حرف سے ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ ان حرفوں کی مخصوص آوازوں کو ہم ادا بھی کر سکتے ہیں مگر بالعموم ایسا نہیں کرتے، بلکہ ث اور ص کو س کی طرح، ذ، ض، ظ کو ز کی طرح، ح، کو ہ کی طرح اور ع کو الف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ حرف زائد اور بے ضرورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ حرف تحریر میں کچھ دشواریاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر وہ کون سا رسم خط ہے، جس میں اس طرح کی دشواریاں نہیں ہیں اور جس کے صرف حروف سیکھ لینے سے تمام الفاظ صحیح لکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں؟ ان حرفوں کی وجہ سے اردو کے بہت سے لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہی دقت ناگری تحریر میں بھی ہے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے۔ اور یہی دقت اردو اور ناگری دونوں سے کہیں زیادہ رومن تحریر میں موجود ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔

یہ حروف جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی

خود بتا دیتے ہیں۔ جیسے نال، اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب، اور صواب، کسرت اور کثرت، علم، اور الم ، عام اور آم، حائل اور ہائل، لعل اور لال، ذکی اور زکی، اسیر اور اثیر، سریا اور صریر، بار اور حار، صور اور سور، جال اور جعل، صدا اور سدا، باد اور بعد، صد اور سد، تان اور طعن، باز اور بعض، عرض اور ارض ، عیال اور ایال، سفر اور صفر، حال اور ہال، تانا اور طعنہ، زن اور ظن، ماموراور معمور، صورت اور سورت، حل اور ہل، جالی اور جعلی، عرضی اور ارضی جن لفظوں کے تلفظ یکساں اور معنی مختلف ہیں اگر ان کا املا بھی یکساں ہو جائے تو جو غلط فہمیاں ابھی صرف کانوں کے ذریعے سے ہوتی ہیں وہ آنکھوں کے ذریعے سے بھی ہونے لگیں گی۔

یہی حروف ہم کو اس بات کا پتا لگانے میں مدد دیتے ہیں کہ کون لفظ کس لسانی خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ لفظوں کے خاندانی، ملکی اور نسلی امتیازات پر غور کرنے سے بیش قیمت تاریخی اور جغرافی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور قوموں اور ملکوں کے باہمی تعلقات کا پتا لگتا ہے۔ ان حرفوں کے ترک کردینے سے بہت سے لفظوں کی صورت بدل جائے گی اور اس سے ایک طرف اس طرح کی معلومات اور انکشافات کا ایک دروازہ بند ہو جائے گا اور دوسری طرف جب لفظوں کی اصل کا پتہ نہ لگ سکے گا تو نہ ان کے بنیادی معنی معلوم ہوسکیں گے، نہ لغوی اور مجازی معنوں کا تعلق نظر آئے گا۔ نہ عام اور خاص مفہوم کا ربط سمجھ میں آئے گا۔ اس طرح اردو رفتہ رفتہ وہ خصوصیتیں کھو بیٹھے گی جو ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور جو ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور زبان دانوں کی صدیوں کی مسلسل کوششوں سے اردو کو حاصل ہو چکی ہیں اسکے علاوہ کچھ کم مقدار میں وہ تمام نقصانات پہنچیں گے جو کوئی نیا رسم خط اختیار کرنے سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان حرفوں کو نکال ڈالنے سے لفظوں کی صورت کیا سے کیا ہو جائے گی۔

موجودہ صورت	مجوزہ صورت
حضرت	ہزرت
عرض	ارز

صاحب	سابب
طرح	ترہ
حفیظ	ہفیز

جن لوگوں کی نگاہیں ترہ ، ارز ، اور ہزرت کی عادی ہو جائیں گی وہ طرح ، عرض ، حضرت ، کو کیونکر پڑھ سکیں گے ۔ اگر ان کی تعلیم کی اعلیٰ منزلوں میں یہ خارج کیے ہوئے حروف سکھا بھی دیے جائیں تو بھی ان لفظوں کو ان صورتوں میں پڑھنا ان کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول ٹٹول کے اور ہجے لگا لگا کے نہیں پڑھا جاتا ، بلکہ اس کی معین صورت اس کے تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور صورت ، تلفظ اور معنی میں ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ ادھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی اُدھر وہ پڑھ بھی لیا گیا اور سمجھ بھی لیا گیا۔ صورت بدل جانے سے لفظ کا پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں بھی دیر لگ جاتی ہے ۔ یعنی اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں دماغ پر معمول سے زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔

بعض لوگ اردو حرفوں کے ناموں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حروف مفرد آوازوں کی علامتیں ہیں ۔ ان کے ناموں کا کئی کئی آوازوں سے مرکب ہونا درست نہیں ۔ مثلاً اَ کی آواز کو ظاہر کرنے والے حرف کا الف ، نام رکھنا مناسب نہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ ناگری میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ درست ہے کہ حرف جس آواز کو ظاہر کرتا ہے وہی آواز اس حرف کا نام ہے مثلاً اَ کی آواز کے لیے جو حرف ہے اس کا نام بھی اَ ہے ۔ یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو الف ، اَ کی آواز کا نام نہیں ہے بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جو اَ، آ، اِ، اِی، اُ، او، اِے، اَے، اُو، اَو میں مشترک ہے ۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہیں ۔ اس مجرد آواز کی علامت اَ ہے اور اس علامت کا نام الف ہے ۔ یہی حالت اور سب حرفوں کی ہے ۔ مثلاً میم کہ یہ مَ کا نام نہیں ہے بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جس سے ان لفظوں کی ابتدا ہوتی ہے ۔ مَن ، ماش ، مِس ، میر ، مُل ، مُوٹھ ، میخ ، مَیل ، مُوچ ، مَوج ، یہ سب لفظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے

ہیں مگر اس کی حرکت ہر جگہ مختلف ہے جس سے اس ایک آواز کی دس صورتیں ہوگئی ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی صورت کو مَ کہنا درست ہے۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صورت کو بھی مَ کہہ لیجیے۔ اِس لیے کہ مَ کی حرکت کو کھینچنے ہی سے مَا بن جاتا ہے۔ اِن دو صورتوں کو چھوڑ کر باقی آٹھ صورتوں کو مَ کہنا اور یہ دعوے کرنا کہ ناگری میں حرفوں کی جو آوازیں ہیں وہی ان کے نام ہیں۔ کہاں تک درست ہے۔

جس طرح اوپر دی ہوئی مثالوں میں مَس، میر، اور مُل، موٹھ، مِنج، مَیل، مُوچ، مَوچ کی ابتدائی متحرک آواز مَ نہیں ہے، اسی طرح نام، دام، کام کی آخری ساکن آواز بھی مَ نہیں ہے۔ اس لیے ناگری میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حرف کا نام بھی مَ نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں ہندی اور اردو تلفظ کا ایک اصولی فرق توجہ کے قابل ہے۔ ہندی میں لفظ کی آخری آواز متحرک ہوتی ہے۔ جیسے رام، شیام، اس لیے ہندی میں ان لفظوں کے آخری کو م کہنا درست ہے، لیکن اردو میں اسم کی آخری آواز ہمیشہ ساکن ہوتی ہے اس لیے رام، اور شیام، کی آخری آواز کو بھی اردو میں مَ نہیں کہہ سکتے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظر انداز کردی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اسی وجہ سے آوازوں کے ایسے نام رکھے گئے ہیں جن سے زبر کی حرکت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہندی میں بھی ہر آواز دس مختلف حرکتیں اختیار کرسکتی ہے اس لیے وہ نام بیشتر حالتوں میں آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر آواز کو متحرک ماننے اور زبر کو اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً: مَ پر اُو کا ماترا اور گ پر ای کا ماترا لگانے سے مَوٗ اور گئِی کی آوازیں نکلنا چاہیے۔ ان کو مُو اور گی پڑھنا اصولاً صحیح نہ ہوگا، بلکہ آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔

اردو میں دنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں۔ اس لیے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے اور اس طرح اردو رسم خط ناگری کی تحریر ان بے اصولیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کی طرف توجہ دلانا

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے جس کی وہ علامت ہے اور اس طرح حرفوں کے نام ان کی آوازوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ناگری حرفوں کے نام لائق تعریف ہیں نہ اردو حرفوں کے نام اعتراض کے قابل۔

بعض لوگ رومن رسم خط کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اردو اور ہندی دونوں کے لیے رومن خط اختیار کر لیا جائے تو ان زبانوں کے افتراق کا ایک بڑا سبب دور ہو جائے گا اور دونوں مل کر ایک ہو جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ مگر جب ان دونوں زبانوں کو قریب لانے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے بلکہ کوئی خواہش بھی معلوم نہیں ہوتی اور جب ہندی کے بعض بڑے ذی اثر حامی بالاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کی آمیزش کرنا چاہئے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ملک کی عام زبان ہونا چاہئے تو صرف رسم خط کی تبدیلی سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر ہم رومن حروف اختیار کر لیں تو اردو اور ہندی کے میل سے ایک عام فہم زبان تو پیدا نہ ہوگی البتہ اردو اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی اور اس کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرنے سے غیر ملک اور غیر زبان والوں کو اردو سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن کسی زبان کا رسم خط معیّن کرتے وقت اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی آسانی یا فائدے کا خیال اصل اصول ہونا چاہئے جب ہم اس اصول پر اس مسئلے کو طے کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ رسم خط کو اردو کے لیے سب سے زیادہ مناسب پاتے ہیں۔ مدتِ دراز کے تجربے سے اپنی ضرورتوں کے موافق جو ترمیمیں اس رسم خط میں ہوتی رہی ہیں۔ انھوں نے اس کو اردو کے لیے سب سے زیادہ موزوں بنا دیا ہے۔ اب اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا خط اختیار کر لیا جائے تو اس کی ضروری ترمیم و اصلاح کے لیے پھر ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ پھر بھی س کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ بنا لینا مشکوک ہی رہے گا۔

رومن رسم خط اختیار کر لینے کا ایک فائدہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کو سیکھ کر ہم کو مختلف تحریروں کے سیکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ہم اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں رومن نط کی مدد سے بہ آسانی پڑھ سکیں گے۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اگر تمام زبانیں رومن

حرفوں میں لکھی جانے لگیں تو ہم کو کوئی زبان سیکھنے کے لیے نئی صورتوں کے مفرد حروف کم سیکھنا پڑیں گے اور اس سے وقت کی کچھ بچت ہوگی۔ مگر اس زبان کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی دو تین حرفوں کو ملا کر ایک حرف ماننا ہوگا۔ کبھی نئے حروف بنانا اور نئی علامتیں مقرر کرنا ہوں گی۔ کبھی پرانے حرفوں سے نئی آوازیں ادا کرنا ہوں گی اور کبھی ایک پرانا اور ایک اپنا حرف ملا کر لکھنا ہوگا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اس کثرت سے واقع ہوں گی مگر حرفوں میں بہت کچھ یکسانی ہونے کے باوجود ہر زبان کا رسمِ خط بدل جائے گا اور یہ ممکن نہ ہوگا کہ بغیر کسی زبان سے واقفیت پیدا کیے ہوئے اس کی لکھی ہوئی عبارت صحیح پڑھ لی جائے۔

تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو لوگ ساری عمر رومن حرفوں میں انگریزی پڑھتے لکھتے رہے ہیں وہ انھیں حرفوں میں لکھی ہوئی فرانسیسی یا جرمن عبارت کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو اور رومن حرفوں میں لکھی ہوئی انگریزی کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ان کو رومن میں لکھی ہوئی اردو کو پڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور بہت دماغی محنت کرنا پڑتی ہے۔ زبان نہ جاننے کی حالت میں اکثر لفظوں کا پڑھنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص جس نے رومن حروف سیکھ لیے ہوں، مگر نہ انگریزی زبان سے واقف ہو نہ اردو سے، وہ اگر کسی عبارت میں Maze لکھا ہوا دیکھے تو وہ کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کو میز پڑھنا چاہیے یا مزے۔ اسی طرح Mail کے بارے میں یہ طے نہیں کر سکتا کہ اس کو میل پڑھے یا مَیل۔ لیکن جو شخص یہ دونوں زبانیں جانتا ہو وہ ان لفظوں کو انگریزی عبارت میں میز اور مَیل پڑھے گا اور اردو عبارت میں مزے اور میل۔ ایک دوسری صورت ملاحظہ ہو۔ اگر کہیں اردو کے لفظ لوگ اور تھے لکھے ہوئے ہوں یعنی Log اور the اور ان کو کوئی ایسا شخص پڑھے جو صرف انگریزی زبان جانتا ہو تو یقیناً وہ ان کو لاگ اور دی پڑھے گا۔ لوگ اور تھے ہرگز نہیں پڑھے گا۔ ایسی ہی نہ معلوم کتنی دقتیں پیش آئیں گی۔ جن کا حل زبان کے علم کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ پس یہ دعوے کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ رومن حرفوں کے ذریعے سے اِن حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

رومن حروف سیکھ کر ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتوں کا پڑھ سکنا تو ایک خیال محال ہے۔ اگر انگریزی داں حضرات غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ صرف انگریزی پڑھ لینے کی قابلیت جو ان میں پیدا ہوتی ہے وہ بھی فقط رومن حروف سیکھ لینے کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قابلیت پیدا کرنے کے لیے وہ لفظوں کا املا، تلفظ اور معنی سالہا سال تک یاد کرتے رہے ہیں اور اس کے بعد بھی جب کوئی نیا لفظ دیکھنے یا سننے میں آجاتا ہے تو اس کا صحیح تلفظ یا املا ڈکشنری سے پوچھنا پڑتا ہے۔ خود سے نہ اس کو صحیح طریقے سے بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

اب تک دنیا میں کوئی ایسا رسم خط ایجاد نہیں ہوا جو کل زبانوں کا ذکر کسی ایک زبان کی تمام آوازوں کو پورے طور پر ادا کر سکتا ہو۔ خالص صوتیاتی اصول پر بنایا ہوا رسم خط بھی تمام آوازوں کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت ہو سکتی ہے لیکن اس کی یہ صلاحیت ہی اس کو ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ صوتی رسمِ خط جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی زیادہ ناقابلِ عمل ہوگا۔ یہ بات بظاہر قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔ ایک ہی شخص ایک ہی لفظ بولتا ہے تو مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں اس کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی جگہ کے رہنے والے لوگ ایک ہی لفظ کو مختلف لہجوں سے ادا کرتے ہیں۔ مختلف مقاموں کے رہنے والوں میں تو لہجے کا اختلاف بہت ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوتی رسم خط اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی لفظ کو لہجے کے تغیر کے ساتھ ایک نئی صورت سے لکھنا ہوگا۔ اس طرح کسی لفظ کی کوئی معین صورت ہی باقی نہ رہے گی۔ بلکہ ایک ایک لفظ کی بہت بہت سی صورتیں ہو جائیں گی۔ ان سب مختلف تحریری صورتوں کو ایک ہی لفظ سمجھنا بھی مشکل ہوگا۔ اور وہ دماغی پریشانی پیدا ہوگی کہ پڑھنا لکھنا ایک مصیبت بن جائے گا۔

صوتی رسمِ خط کو جتنا مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی حرفوں اور علامتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور اتنا ہی ان کا یاد رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ انھیں دقتوں سے بچنے کے لیے ہر زبان کی تحریر میں عملی آسانی کو صوتیاتی صحت پر مقدم رکھنا پڑتا ہے۔ لفظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ حرفوں کی

آوازوں اور ان کی حرکتوں میں ایسے ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ ان کو علامتوں کے ذریعے سے بالکل ٹھیک ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس لیے صوتیات کے ماہروں کی بھی یہی رائے ہے کہ ہر لفظ کی معیاری مکتوبی صورت صرف ایک ہونا چاہئے۔ یعنی لفظ کی تحریری صورت کو اس کے لفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہیے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتی ہے۔ اردو کے رسم خط کو بھی اسی عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

ایک مدت تک ہندوستان کی عدالتی، دفتری، تجارتی، سیاسی اور علمی زبان انگریزی رہی ہے۔ انگریزی پڑھنے والے اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور انگریزی ہی کے ذریعے سے ہم رومن حرفوں سے آشنا ہوئے ہیں۔ جو لوگ اردو کے لیے رومن رسم خط تجویز کرتے ہیں انھوں نے بھی رومن حرفوں کا استعمال انگریزی ہی سے سیکھا ہے اس لیے انگریزی کے رسم خط پر ایک نظر ڈالنا اور اردو کے رسم خط سے اس کا مقابلہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

انگریزی زبان صدیوں سے رومن حروف میں لکھی جارہی ہے اور اس کے رسم خط میں اصلاحیں بھی ہوتی رہی ہیں مگر اب بھی اس میں اتنی خرابیاں موجود ہیں کہ اردو کا موجودہ رسم خط اس سے کہیں بہتر ہے۔ اس دعوے کو تفصیلی بحث بہت پھیلاؤ چاہتی ہے یہاں صرف چند باتیں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ اردو کی تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ دشواری پیدا کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حروف استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اردو میں تین آوازوں کے لیے دو دو حرف، ایک کے لیے تین حرف اور ایک کے لیے چار حرف ہیں۔ مگر ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جو ایک سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے بعض لفظوں کو لکھنے میں تو کچھ دقت ہو سکتی ہے مگر ان کو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ صرف چند لفظ ایسے ہیں جن میں ن کا حرف میم کی آواز دیتا ہے۔ مگر ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی لفظ میں ساکن نون کے بعد متحرک بے آتی ہے۔ جیسے، سنبر، عنبر، سنبل، اس کے خلاف انگریزی کی تحریر میں جہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں وہاں ایک ایک حرف کی کئی کئی آوازیں بھی ہیں۔ اس لیے جو دقت بولے ہوئے لفظوں کے لکھنے میں پیش آتی ہے وہی لکھے

ہوئے لفظوں کے پڑھنے میں بھی پیش آتی ہے اور انگریزی لکھنا پڑھنا اردو لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

2۔ اردو میں ہر آواز ایک مفرد حرف سے ادا کی جاتی ہے۔ انگریزی میں مرکب اور دُہرے حرفوں سے بھی بہت کام لیا جاتا ہے اور ایسے حرفوں کی آوازیں بھی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ مثلاً ch کہیں چ کی آواز دیتا ہے کہیں ک کی اور کہیں ش کی۔

3۔ اردو میں عربی لفظوں کی ابتدا میں کبھی کبھی الف لام لگا دیا جاتا ہے جو تعریف اور تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ان دو حرفوں میں کبھی ایک کبھی دونوں کوئی آواز نہیں دیتے۔ اسی طرح فارسی کے چند لفظ ہیں جن میں واو کا حرف کوئی آواز نہیں دیتا جیسے خواب، خواہش، مگر ان دونوں چیزوں کے لیے قاعدے مقرر ہیں۔ انگریزی میں خاموش حروف جو بالکل بے ضرورت ہوتے ہیں، کثرت سے آتے ہیں۔ ہر جگہ آسکتے ہیں اور کسی مقررہ قاعدے کی پابندی نہیں کرتے۔

4۔ اردو میں حرفوں کی حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تھوڑی سی مفرد علامتیں ہیں۔ ہر علامت صرف ایک حرکت کے لیے اور ہر حرکت کے لیے صرف ایک علامت ہے۔ انگریزی میں حرکتوں کی یہ علامتیں، جو حرفوں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔ وہ بھی حروف صحیح کی طرح مفرد، مرکب، دہری، اور بے ضرورت سبھی طرح کی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود نہ کسی حرکت کے لیے کوئی ایک علامت مخصوص ہے۔ نہ کسی علامت کے لیے کوئی ایک حرکت مخصوص ہے۔ مثلاً Gow, Road, For, Go Shoulder ان پانچ لفظوں میں ایک ہی حرکت کے لیے پانچ علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ یعنی Ou, Ow, Oa,Oe,O اس کے خلاف Shoe, Poet, Does اور Foe ان چار لفظوں میں ایک ہی علامت Oe چار مختلف حرکتوں کا کام دے رہی ہے۔ [1]

5۔ اردو میں حرکت کی علامت ہمیشہ متحرک حرف کے ساتھ آتی ہے۔ انگریزی میں اس کے خلاف بھی ہوتا ہے مثلاً Daie,Joke,fine ان لفظوں میں J,F اور D متحرک حرف ہیں۔ اس لیے حرکتوں کی علامتیں صرف انھیں حرفوں کے بعد ہونا چاہیے تھیں۔ K,N اور T ساکن حرف ہیں۔ ان

[1] یہ مثالیں پروفیسر جولس کے ایک رسالے سے لی گئی ہیں۔

کے بعد حرکت کی ایک علامت یعنی E کا آنا خلافِ اصول بات ہے۔

اردو کے فارسی رسمِ خط اور انگریزی کے رومن رسمِ خط کا مقابلہ جو مختصر اور سرسری طور پر یہاں کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ اردو میں تحریر کی جو دقت بیان کی جاتی ہے وہ انگریزی میں بدرجہ زیادہ ہے۔ مثلاً انگریزی کا ایک معمولی اور کثیر الاستعمال لفظ ہے Conceive اس میں ابتدائی حرف C کی جگہ k اور ch بھی لکھا جا سکتا ہے۔ o کی جگہ u بھی آ سکتا ہے۔ دوسرے c کی جگہ s بھی ہو سکتا ہے۔ Ei کی جگہ IE, EE اور EA بھی لکھا جا سکتا ہے اور آخری حرف E کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بارہ تبدیلیاں ہیں جو اس ایک لفظ کی تحریری صورت میں کی جا سکتی ہیں۔ یعنی ان میں سے ایک یا زیادہ تبدیلیوں کے ساتھ اگر یہ لفظ لکھا جائے تو انگریزی کے موجودہ رسمِ خط کے اعتبار سے اس کا یہی تلفظ باقی رہ سکتا ہے۔ اب اگر ایک ہی آواز کے حرفوں کو بدل بدل کر اس لفظ کو لکھیں تو اس کی چھیانوے صورتیں بن سکتی ہیں۔ اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ رومن حرفوں کی ذات میں یہ صفت داخل نہیں ہے کہ ان کو اختیار کر لینے سے پڑھنے لکھنے کی دقتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

انگریزی کے رسم خط کی خرابی کی مثال میں جو لفظ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام لفظوں کی حالت بالکل اسی کی سی نہیں ہے مگر انگریزی کے تقریباً اسی فی صدی الفاظ ایسے ضرور ہیں جو ایک سے زیادہ اور بعض حالتوں میں بہت زیادہ صورتوں سے لکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی ان کا جو املا صحیح سمجھا جاتا ہے وہ کسی قاعدے پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف ایک رسمی اور روایتی چیز ہے۔

اگر انگریزی کے رسمِ خط کی ان تمام بے قاعدگیوں پر جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اصولی حیثیت سے نظر کی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگریزی میں تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ کی حالت یہ ہے کہ ان کو سن کر صحیح صورت سے لکھ دینا یا لکھا ہوا دیکھ کر صحیح تلفظ سے پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس طرح انگریزی کا رسمِ خط اتنا مشکل دکھائی دے گا کہ اس کا پڑھنا لکھنا تقریباً محال معلوم ہونے لگا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی رسمِ خط کے ساتھ انگریزی ان عظیم زبانوں میں ہے جن کے پڑھنے اور لکھنے والے تعداد میں دنیا کی بیشتر زبانوں سے زیادہ ہیں اور دنیا کے بہت سے

حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصولی طور پر جتنی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ عملی طور پر اتنی پیش نہیں آتیں۔

بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے بہت سی دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں ۔ ابتدا میں کچھ لفظوں کا املا یاد کرنا پڑتا ہے ۔ اس کے بعد مشاہدے کی تکرار سے بہت سے لفظوں کے نقش بغیر کسی خاص کاوش کے طالب علم کے ذہن میں اتر آتے ہیں اور پھر وہ مماثلت ، مشابہت ، تقابل ، اشتقاق وغیرہ کی رہنمائی میں ان لفظوں کے قیاس پر دوسرے لفظوں کی مکتوبی صورت کا اندازہ کر لیتا ہے ۔ اس طرح اصولی دشواریاں منزل میں بہت کچھ آسان ہو جاتی ہیں ۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اردو کا فارسی رسمِ خط اصولی حیثیت سے بھی انگریزی کے رومن رسم خط سے کہیں زیادہ آسان ہے اس کو برتنے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رومن رسمِ خط کو اردو کے موجودہ رسم خط پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غیر ملکوں کی عیسائی مشنریوں نے جو نہ اردو کے طرفدار تھے نہ ہندی کے اور جنھیں نہ اردو کو فروغ دینا تھا نہ ہندی کو 'جب شمالی ہند میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو ایک مدت تک اپنا تبلیغی لٹریچر رومن حرفوں میں چھاپتے رہے ۔ مگر جب رومن رسم الخط کسی طرح مقبول نہ بن سکا تو آخر کار اس کو چھوڑ کر اردو ، ناگری حرفوں میں اپنی کتابیں چھاپنے لگے ۔ جو تجربہ ایک مرتبہ کیا جا چکا ہے اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔

رسم خط بدلنے سے زبان کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے ۔ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہو تو بحث کی ضرورت نہیں ۔ مِسَر ، گُپت ، سر یواسَتو کے سے کثیر الاستعمال لفظوں کو جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے نام ہیں اور تو اور خود ہندو اور وہ بھی تعلیم یافتہ ہندو مِسرا ، گُپتا ، سیر یواستوا بولنے لگے ہیں ۔ یہ رومن رسم خط ہی کی برکت تو ہے ۔ تانگا کو ٹانگا ، تاتا ، کو ٹاٹا اور والمیا کو ڈالمیا کر دینا بھی رومن حروف کا کارنامہ ہے ۔ صرف یہی چند مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ رومن حرف ہمارے لفظوں کی صورت بگاڑ کر زبان کی شکل ہی بدل دیں گے۔

اگر رومن خط ہمارے لفظوں کا صحیح تلفظ باقی رکھ سکے تو بھی۔اس سے طرح طرح کے نقصان ضرور پہنچیں گے۔ایک تو وہ اس رشتے کو قطع کردے گا جو ہماری زبان کے حال کو اس کے ماضی سے جوڑتا ہے۔دوسرے وہ بہت سے لفظوں کی اصل اور حقیقت پر پردہ ڈال دے گا اور یہ سمجھنا ممکن نہ رہے گا کہ کون لفظ کس خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے یعنی اردو خط میں سے چند حرفوں کو خارج کر دینے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں وہی نقصان رومن رسم خط سے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں پہنچے گا۔اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے اردو کا موجودہ رسم خط وہی ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔اگر ہم ایشیائی ملکوں اور ایشیائی زبانوں سے رشتہ توڑ کر یورپ اور یورپی زبانوں سے ناتا جوڑنا چاہتے ہوں تو اس خط کو چھوڑ کر رومن خط اختیار کرنے کا مشورہ ہمارے لیے قابل قبول ہوسکتا ہے۔

فارسی زبان اردو کے لیے ایک بنیادی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں اور اردو میں ماں بیٹی کا تعلق ہے۔عربی سے بھی اردو کو برابر تقویت پہنچتی رہی ہے۔ان دونوں زبانوں کا رسم خط تقریباً بالکل وہی ہے جو اردو کا ہے۔اس لیے اگر اردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اس کے موجودہ رسم خط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔رومن ہو یا کوئی دوسرا رسم خط وہ اس تعلق کو قطع کردے گا۔اور یہ اردو کے لیے بے حد مضر ہوگا۔

اردو زبان و ادب کو فارسی زبان و ادب سے جو قریبی تعلق ہے اس کی بنا پر اردو کا بااصول مطالعہ فارسی کی واقفیت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔اس کے علاوہ اردو قواعد اور لغت کی قدیم کتابیں فارسی میں ہیں۔اردو شاعروں کے قدیم تذکرے اور ہزاروں قطعات تاریخ جو اردو ادب کی تاریخ کے قیمتی ماخذ ہیں فارسی میں ہیں اور ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ جس کا اردو زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے۔اس کا تقریباً کل ذخیرہ فارسی میں ہے۔اس لیے اردو میں ادبی تحقیق کے واسطے فارسی کا علم ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کے لسانی اور ادبی تعلقات کی وجہ سے اردو جاننے والوں کے لیے فارسی کا سیکھ لینا آسان ہے۔اگر اردو کا رسم خط بدل دیا جائے تو اس سے آسانی میں بہت کمی ہو جائے گی۔اور صرف یہی نہ ہوگا بلکہ فارسی کی تحصیل کا ایک بہت بڑا محرک جاتا رہے گا۔

حروف کی تبدیلی سے ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوگا کہ حساب جمل کا وجود نہ رہے گا۔ اور وہ بے شمار تاریخی نام اور قطعات تاریخ جو جودت طبع اور قوت تلاش کی حیرت خیز مظاہرے ہیں اور گزشتہ حالات وواقعات کا زمانہ معین کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ سب بے کار ہو جائیں گے۔

یہ چند باتیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کسی زبان کے لیے جو رسم خط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ وریشے میں اس طرح بھر جاتا ہے کہ اس کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔

مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضرور ٹھہرتا ہے کہ اردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے اپنی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں اصلاحیں کی جاسکتی ہیں، مگر صرف ایسی جو اس کی صورت کو مسخ نہ کردیں۔ آج کل بعض لوگ اردو کے لیے نئے نئے خط ایجاد کررہے ہیں۔ ان صاحبوں سے درخواست ہے کہ وہ اس ایجاد کی زحمت میں نہ پڑیں۔ اصلاح کی مناسب صورتیں تجویز کریں۔

اردو رسم خط میں ضرورت زمانہ کے مطابق اصلاحیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہوسکتی ہیں۔ اس کام کے لیے ماہرین کی ایک نمائندہ کل ہند کمیٹی بننا چاہیے جو مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کرکے ادیبوں، ناشروں، طابعوں، کاتبوں اور معلموں سے مشورہ کرنے کے بعد اردو رسم خط کے قاعدے معین کردیے، یہ قاعدے کثیر تعداد میں چھاپ کر اردو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے والوں، اردو کے رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں، اردو میں کتابیں اور مقالے لکھنے والوں اور سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں کے پاس بھیج دیے جائیں اور سررشتۂ تعلیم کی منظوری کے بعد درسی کتابوں میں ان کی پابندی لازمی کردی جائے۔ مدرسین طلبہ کو روزانہ مشقوں میں اور ممتحنین امتحانوں کی کاپیوں میں ان قواعد کی خلاف ورزیوں کو اسی طرح غلطیوں میں شمار کریں جس طرح املے کی دوسری غلطیوں کو یعنی جس طرح طاقت کی جگہ تاقت لکھنے کو غلطی

قرار دیتے ہیں اسی طرح کہار کو کھار لکھنا بھی غلطی سمجھیں اور اس غلطی کے نمبر کاٹیں۔ اس سلسلے میں نشانات، اوقاف اور استعمال اعراب کے اصول اور محل مقرر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اصول مقرر ہو جائیں تو اعراب کی ضرورت بہت ہی کم رہ جائے اور اردو کی عبارت کا صحیح پڑھنا بہت آسان ہو جائے۔

کسی زبان میں تحریر کے بعد ایک بہت اہم مسئلہ طباعت کا ہے جو ترویج و اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اردو کتابیں اب تک بالعموم لیتھو میں چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ زمانہ عجلت کا ہے اور لیتھو کی چھپائی اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چھاپنے کی نئی نئی مشینیں اور نئے نئے طریقے جن سے چھپائی کا کام بڑی خوبی، بہت آسانی اور نہایت عجلت کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ان سے لیتھو کی چھپائی میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو کی کتابیں بھی ٹائپ میں چھاپی جائیں۔ مگر اب تک ہندوستان میں اردو ٹائپ کا اچھا مطبع ایک بھی نہیں ہے جہاں ہر طرح کا ٹائپ اور ہر طرح کی مشینیں موجود ہوں۔ ٹائپ کے ذکر کے ساتھ وہ کوششیں ضرور یاد آ جاتی ہیں جو نستعلیق ٹائپ بنانے کے لیے کی گئیں۔ بہت سا وقت اور کثیر سرمایہ ان کوششوں میں صرف کیا گیا مگر کامیابی کی منزل دور ہی رہی۔ ٹائپ میں نستعلیق خط کی خوبیاں باقی رکھنا اور وہ بھی اس طرح کی چھپائی میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ممکن نہیں معلوم ہوتا نستعلیق خط ایران میں ایجاد ہوا، وہاں کے بادشاہوں اور امیروں نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس کی ترقی میں مدد دی۔ ایران میں خطاط کی قدر مصوری سے کم نہ تھی۔ وہاں سیکڑوں بڑے بڑے خطاط گزرے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں شاید ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہاں کے لوگ عام طور پر نستعلیق خط ہندوستانیوں سے کہیں بہتر لکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ایرانیوں نے ضرورت زمانہ کو دیکھ کر اپنی کتابیں معمولی ٹائپ میں چھاپنا شروع کر دیں۔ انھوں نے نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش میں اپنا وقت اور روپیہ برباد نہیں کیا۔ پھر آخر ہم کو نستعلیق کی محبت اس قدر کیوں دامنگیر ہو گئی تھی کہ ایک غیر ممکن کام کو ممکن بنانے میں لگے رہے۔ اتنی کوشش اگر موجودہ ٹائپ کو خوبصورت اور مقبول بنانے میں کی جاتی تو بہتر نتائج برآمد ہوتے۔ ہندوستان میں نستعلیق ٹائپ آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے تیار ہو چکا تھا، اور متعدد مطبعوں نے اس سے کام لینا

شروع کر دیا تھا۔ مگر غالباً طباعت کی دشواریوں سے مجبور ہو کر اہل مطبع نے کچھ مدت تجربہ کرنے کے بعد اس ٹائپ کو ترک کر دیا۔

نستعلیق ٹائپ کے مطبعے زیادہ تر کلکتے میں قائم کیے گئے تھے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں، مطبع محمدی، مطبع احمدی، مطبع نبوی، مطبع طبی، مطبع کریمی، مطبع انوری، مطبع مرآۃ الاخبار، مطبع محمد فیض اللہ۔ ان مطبعوں کی چھپی ہوئی دو درجن کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی ایسا ہونی چاہیے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں، تا کہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔

اصلاح اردو، اور رسم الخط

جدت طراز طبیعتوں اور ترقی پسند ادب کے مدعیوں نے آج کل اردو کو فٹ بال بنا رکھا ہے۔ یوں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ کس کس کی شکایت کی جائے۔ مگر ان نام نہاد ترقی پسند ادیبوں میں انگریزی داں حضرات پیش پیش ہیں اور آگے بڑھانے کی نیت سے اردو، ادب کی فٹ بال کو ٹھوکر لگانا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں۔ مصلحان ادب کی یہ جماعت جوشیلی ہے۔ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس جماعت کی صف اول کے مورچہ جمانے والوں میں ہندو مسلمان دونوں نظر آتے ہیں۔ میں اس جماعت کی جدوجہد کی دل سے قدر کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ بمصرعہ: اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ۔ مگر اتنا یاد رہے کہ ادب کی خوبصورت عمارت فٹ بال کا میدان نہیں ہے۔ فٹ بال میں بے تحاشا ٹھوکریں لگانے سے کھیلنے والے منزل کے قریب پہنچ سکتے ہیں لیکن ادبی عمارت کے نقش و نگار اور پچی کاری میں یورپ کے گہرے اور بے روپ رنگ بھرنا ایسا ہی نامرغوب، مکروہ اور بدنما ہوگا جیسے گورنمنٹ ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کی وہ نامشکور کوششیں جو اس نے دہلی اور آگرہ کے قلعوں کے نازک کام کی مرمت کرنے، سنگ مرمر اور سمنٹ اور سنگ اسود یں مسالے اور کول تار کا جوڑ لگانے اور اس طرح کانے، کو اندھا بنانے میں صرف کی ہیں۔ امتدادِ .مانہ اور وحشیوں کے دستِ تظلم نے ان دونوں بے نظیر عمارتوں کے بعض حصوں کو کانا بنا دیا تھا۔

محکمۂ آثار قدیمہ کے عملِ جراحی نے انھیں چوپٹ اندھا کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ انگریزی دان مصلحانِ ادب کے ہاتھوں اردو کا بھی کہیں یہی انجام نہ ہو۔ میرے نزدیک اردو کی اصلاح یا اس کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش میں سینہ زوری اور شدت سے کام لینے کا دردناک نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے خط و خال پر زیادہ روپ برسنے کے اس کی صورت مسخ ہو جائے گی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جن جن صوبوں کی زبان اس وقت اردو ہے وہاں ہر صوبے کی بولی جداگانہ ہو جائے گی۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ رسم خط کی اصلاح کی جائے۔ ہمارا رسم خط وہی ہے جس میں عربی یا فارسی لکھی جاتی ہے۔ اس رسم خط کا برقرار رکھنا لازمی ہے۔ اگر اس رسم خط کی بجائے کوئی ایسا رسم خط اختیار کیا جائے جو بائیں جانب سے دہنی طرف کو لکھا جاتا ہے تو اردو پاک صاف زبان نہ رہے گی اور بالآخر اس زبان سے مغلوب ہو جائے گی جس کا رسم خط اختیار کیا جائے گا۔

اردو، زبان کا تعلق موجودہ رسم خط سے:۔

رسم خط کی تبدیلی کا مسئلہ یورپ کی کورانہ تقلید کے باعث پیدا نہیں ہوا، بلکہ فی الحقیقت اردو رسم خط پر ایسا زبردست اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ جس طریقے سے حروف ملا کر لفظ ان تینوں زبانوں میں بنائے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان کے سیکھنے میں بچوں اور طلبا کا جو ان تینوں زبانوں کی تحصیل کرنا چاہیں بڑا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری صرف بچوں اور طلبا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں جو تحریک خواندگی بالغان کی ہو رہی ہے اس کے پھیلانے میں موجودہ رسم خط کے باعث غیر معمولی دشواریاں پیش آتی ہیں جس شخص کی عمر تیں اور چالیس سال کے درمیان ہے اس کو حروف شناسی اور عبارت پڑھنے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کے علاوہ حروف کے ملانے اور یہ یاد رکھنے میں کہ کون حرف کس کس حرف سے جائز طور پر ملا کر لکھا جا سکتا ہے لکھنے والے کے دماغ پر غیر ضروری بار پڑتا ہے۔ ناگری کے حامیوں کی طرف سے اردو، رسم خط پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان میں ہمیشہ اس اعتراض کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

ترکوں نے لاطینی رسم خط کیوں اختیار کیا:۔

میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ناگری کے طرف داروں کا یہ اعتراض کلیۃً نیک

نیتی اور صداقت پر مبنی ہے۔ مگر ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اتاترک مصطفےٰ کمال نے جن وجوہ سے متاثر ہوکر عربی رسم خط کی بجائے لاطینی رسم خط کو اختیار کیا۔ ان میں سب سے بڑی وجہ یہی دشواری تھی جو حروف ملانے کے باعث ان تمام زبانوں میں پائی جاتی ہے جو عربی یا فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس مسئلے پر متعدد ترکوں سے میری گفتگو ہوئی ہے جن میں مسٹر بورائے Boray کا نام خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے۔ مسٹر بورائے دو سال سے ہندوستان میں ترکی کے ٹریڈ کمشنر ہیں اور شملہ اور دہلی میں رہتے ہیں۔ سب حضرات کی ذاتی علم کی بنیاد پر رائے ہے کہ ترکی میں لاطینی رسم خط جاری کرنے کا اثر یہ ہوا ہے کہ تعلیم بالغان نہ صرف ملک میں بڑی سرعت سے پھیل گئی ہے بلکہ اسکول اور کالجوں کے زمانۂ تعلیم کے معیاد میں بھی متعدبہ کی واقع ہوگئی ہے۔ میں ترکی زبان سے واقف ہوں۔ اس لیے اس تجربہ کے بارے میں جو اتاترک نے لاطینی رسم خط کو اختیار کرتے ہیں کیا کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کرسکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے ترکوں کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ اتحاد و نسل و مذہب، لباس و تاریخ و روایت و تہذیب و شائستگی کے باعث جو زبان بھی ترک اختیار کریں گے وہ سارے ملک کی زبان ہوگی اور اس زبان کی حریف ترکی کو کوئی اور زبان نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ملک کی یہ حالت ہے کہ انگریزی کے علاوہ جو حکومت کی زبان ہے ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تمل اور پنجابی ایسی زبانیں ہیں جو اپنے کو اردو کا حریف سمجھتی اور اردو، پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ہم کو خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حریفوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

رسم خط کے معاملے میں ترکوں کی تقلید خودکشی ہوگی:۔

اس تمام بحث کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نہ رومن خط کو اختیار کرسکتے ہیں نہ اردو کو ناگری حروف میں لکھنے پر راضی ہوسکتے ہیں۔ ترکوں کی تقلید کرنے کی صورت میں انگریزی سے اور ناگری رسم خط اختیار کرنے کی صورت میں ہندی سے ہماری زبان مغلوب ہوجائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا۔ ہماری زبان کی خصوصیات جن کا تعلق تلفظ اور املا سے ہے کم ہوتی جائیں گی۔ اور ان خصوصیات کی جگہ انگریزی یا ہندی کے الفاظ کا استعمال رفتہ رفتہ رواج پا جائے گا۔ ہر زبان میں الفاظ کے تلفظ اور معنی کا رسم خط سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ تلفظ اور معنی کو رسم خط سے جدا کرنا بالکل ناممکن ہے مثلاً ہماری زبان میں ظ، ض، ذ، ز، چاروں حرف کم و بیش

ہم آواز ہیں۔ اسی طرح ث، س اور ص کی آواز بھی یکساں ہے۔ ت اور ط کی آواز بھی ایسی ہی ملتی جلتی ہے جیسی ہ اور ح کی۔ رومن یا ناگری رسم خط اختیار کرنے کی صورت میں حرف ز، س، ت اور ہ، کارآمد حروف رہیں گے۔ بقیہ حروف بے کار ہو جائیں گے اور اعتراضات کے علاوہ سب سے بڑا اعتراض اس تجویز پر یہ وارد ہوتا ہے کہ اس کو عملی جامہ پہنانے سے املا کے وجود کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

ہر زبان کی خصوصیت املا ہے:۔

زبان کے لیے املا کی خصوصیت ایسی ہی لازمی ہے جیسے جوہر کے لیے عرض یا رنگ کے لیے کپڑا۔ املا کی خصوصیت تنہا اردو، فارسی یا عربی زبانوں ہی میں موجود نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام شائستہ اور ہمہ گیر زبانوں کا سنگ بنیاد ان کا املا ہے۔ انگریزی املا کی اصلاح کی کوشش عرصۂ دراز سے ہو رہی ہے لیکن اس میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی نہ آئندہ کسی کامیابی کی امید ہے۔ امریکہ میں البتہ بعض الفاظ کے املا میں تھوڑی سی تبدیلی امریکہ والوں نے کر لی ہے۔ مگر اس تبدیلی پر انگلستان کے باشندے ہنستے ہیں۔ ان تمام وجوہ کی بنیاد پر میری قطعی رائے ہے کہ اگر ہم اس ملک میں اپنی تہذیب و شائستگی، تمدن، مذہب، تاریخ روایات، ادب اور زبان یعنی کلچر کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ موجودہ انقلابی دور میں اپنے رسم خط میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہونے دیں اور بائیں جانب سے داہنی جانب کو زبان لکھی جاتی ہے ان کی طرف ترکوں کی کورانہ تقلید میں ہرگز توجہ نہ کریں۔ میری ناچیز رائے میں ہمارے کلچر یعنی ان تمام باتوں کا تعلق ہماری تہذیب و شائستگی، مذہب، تاریخی روایات ادب اور زبان سے ہے، انحصار موجودہ رسم خط کو برقرار رکھنے پر ہے۔

اردو کتاب کی اصلاح، میری چار تجویزیں

اردو کے ادیب املا کی کسی ایسی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہو سکتے جس کا اثر زبان کی خوبی اور لطافت پر برا پڑے۔ بعض تبدیلیاں البتہ ایسی ہیں جن سے بغیر املا کی تبدیلی کے اردو کتابت کے دائرے کو زیادہ وسیع، سہل اور مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ اس بارہ میں چار تجویزیں میرے ذہن میں

ہیں جن کو اردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ ہے کہ حروف جار اور بعض دوسرے سیدھے سادے حروف اور الفاظ کو اور حروف و الفاظ سے نہ ملایا جائے۔ مثلاً کا، کی، کے، گا۔ گی۔ گے کو اور حرفوں یا لفظوں سے ملا کر اردو کتابت میں مزید دشواریاں پیدا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ مرکب الفاظ خواہ فارسی کے ہوں خواہ ہندی کے ان کے حصے جدا جدا لکھے جائیں مثلاً سمجھدار کو سمجھ دار، گلچیں کو گل چیں، آہنگر کو آہن گر، مہتاب کو مہ تاب۔ بیتاب کو بے تاب، کمیاب کو کم یاب، راہگیر کو راہ گیر طلبگار کو طلب گار، فیلبان کو فیل بان۔ احسانمند کو احسان مند، المناک کو الم ناک خشمگین کو خشم گیں۔ نامور کو نام ور لکھا جائے۔ مرکب الفاظ کے حصوں کو علاحدہ علاحدہ لکھنے سے ایک حد تک کتابت کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ بعض مرکب الفاظ ایسے ضرور ہیں جن کے دونوں حصوں کو علاحدہ علاحدہ لکھنا آنکھ کو بھلا نہیں معلوم ہوتا مثلاً گل زاد۔ دست خط، تن خواہ، رخ سار، باغ بان۔ یہ پانچوں مرکب الفاظ مثال کے طور پر میں نے پیش کیے ہیں۔ اس قبیل کے اور بھی بہت سے مرکب الفاظ ہوں گے جن کے حصوں کا علاحدہ علاحدہ لکھنا نظر پر گراں گزرے گا۔ لیکن میرے نزدیک کتابت میں سہولت اور اردو رسم خط کو وسعت دینے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پرانے طریق کی بجائے نئی طرز کتابت اختیار کی جائے تیسری تجویز: اس اور اس۔ ان اور ان کی کتابت سے تعلق رکھتی ہے۔ موجود طرز کتابت یہ ہے کہ عام طور پر ان دونوں لفظوں کے نیچے زیر یا پیش نہیں لگایا جاتا بلکہ زیر یا پیش کے ساتھ ان الفاظ کا پڑھنا پڑھنے والے کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ جب اس یا ان کا زیر کے ساتھ پڑھا جانا مقصود ہو تو زیر نہ لگایا جائے اور جب پیش کے ساتھ پڑھا جانا مطلوب ہو تو بجائے پیش کے الف کے بعد واؤ لکھ دیا جائے۔ اس طرح ایک کم بیس (یعنی 19) اور ایک کم تیس (یعنی 29) انیس اور انتیس لکھا جائے۔ چوتھی تجویز یہ ہے کہ اگر کسی اسم کے آخر ہائے اہو زیادہ ہائے مختفی (چھوٹی ہ) ہے تو واحد کو ہ سے اور جمع کو ے (یعنی یائے مجہول) سے لکھا جائے۔ مثلاً ایک ڈاک خانہ، چار ڈاک خانے۔ ایک درجہ، چار درجے ایک ہفتہ، چار ہفتے۔ اصلاح کتابت کی یہ چار تجویزیں نئی نہیں ہیں۔ وقتاً فوقتاً ادیبوں نے اصلاح کتابت پر زور دیا ہے اور بعض ضروری باتیں ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔ اردو، بڑھنے والی زبان ہے اور ہر بڑھنے والی

زبان میں کتابت کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ انگریزی کی کتابت میں گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میں نے اصلاح کتابت کے بارے میں اردو کے بعض ادیبوں سے مشورہ کیا جو تقریباً سب کے سب میری تجاویز کو مفید سمجھتے ہیں۔ ایک دوست نے جو شوخ طبع بھی ہیں۔ ایک اعتراض ضرور کیا کہ اوس (اسم اشارہ) اور اُوس (شبنم) نیز اون (اسم اشارہ) اور اُون (ریشم) کی طرز تحریری میں کچھ امتیاز نہ رہے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کتابت میں تشابہوں سے بچنا ناممکن ہے۔ مگر سیاق عبارت سے ہمیشہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کون سا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً (مصرع) پڑ گئی اوس چمن میں نہ ہوا ہے نہ ہوس) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اُوس سے شبنم مراد ہے۔ اسی طرح (مصرع) اون سے ہم سے رسم الفت چھٹ گئی۔ ڈنکے کی چوٹ بتا رہا ہے کہ لفظ اون سے مقصود معشوق ہے نہ کہ بھیڑ کے بال۔

جو چار تجویزیں اصلاح کتابت کے بارے میں میں نے پیش کی ہیں اون کا نمونہ ذیل کے خط میں پیش کیا جاتا ہے جس میں حروف اور الفاظ علاحدہ علاحدہ یا یہ کہوں کہ جدید طرز سے لکھے گئے ہیں۔ اس خط سے معلوم ہوگا کہ ان تبدیلیوں کا اثر ہماری زبان پر انقلابی نہیں بلکہ اصلاحی ہوگا۔

سہارن پور۔ 17 جولائی 1943

کرم فرمائے بندہ۔ آپ کے خط کا اس قدر انتظار تھا کہ ڈاک خانہ جانے اور ڈاک لانے کے لیے میں نے پرس رام کو کہہ رکھا تھا۔ رات کے وقت معلوم ہوا کہ نامہ بر کو ایک سو تین درجے کا بخار ہے ڈاک لانے کی خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے۔ میں نے مہدی علی خاں حسن پور سے جو اس وقت موجود تھا کہا صبح کی ڈاک تم لانا۔ اس نے دریافت کیا کس وقت ڈاک بٹتی ہے۔ میں نے کہا منہ اندھیرے جانا بے کار ہے۔ جب سورج پھیل جائے۔ اس دم گھر سے چلنا۔ مہدی علی سمجھ دار آدمی ہے۔ دن کے ساڑھے آٹھ بجے اس نے ڈاک لا کر دی۔ جس میں آپ کا خط بھی تھا۔

۱۔ چوب کلاں یہاں دستیاب نہ ہوسکی۔ کالی چرن کو اس وقت خط لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور سے اودیس تو لیتا آئے راستے میں نواب گنج ٹھہر کر خوب کلاں حاضر خدمت کرے گا۔

2۔ فتح یاب خاں توپ خانہ میں ملازمت کے خواہش مند ہیں۔ اپنے دوست کپتان نام دار بیگ کے نام اگر آپ سفارش کا خط لکھ دیں تو اس ہوش مند اور دیانت دار آدمی کا کام بن جائے۔ وہ اب بھی آپ کا تابع دار ہے۔ آئندہ احسان مند بھی رہے گا۔

3۔ غزل کے بارے میں جو رائے آپ نے ظاہر کی ہے۔ بس عین میرے دل کی بات ہے۔ خمار کے بغیر مے کشی میں کیا لطف رہے گا۔ سنگ دل، مشکل بسمل سب قافیے اچھے ہیں۔

4۔ فوجوں کی ریلیں دن رات یہاں سے گزر رہی ہیں جس کے باعث پھل کم یاب ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کم بخت لڑائی کب تک چلے گی۔ آموں کے پارسل کی رسید ہم رشتہ ہے۔

5۔ برخوردار سعادت علی دو ہفتے یہاں رہ کر پرسوں بال بچوں کے ساتھ گول کنڈہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے کلکتہ جائیں گے۔ ایک ہزار میل سے اوپر کا سفر ہے۔

عقیدت مند
فتح علی

کتابت کا جو طریقہ اس وقت رائج ہے اس کے لحاظ سے بہت ممکن بلکہ، اغلب ہے کہ لکھنے والا بہت سے حروف اور الفاظ ملا کر لکھے اور خطِ مذکور کی کتابت اس طرح کرے۔

سہارنپور۔ 17 جولائی 1943

کرم فرمائے بندہ۔ آپکے خط کا اسقدر انتظار تھا کہ ڈاکخانہ جانے اور ڈاک لانے کے لیے میں نے پرسرام کو کہہ رکھا تھا۔ رات کے وقت معلوم ہوا کہ نامبردہ کو ایک سوتین درجہ کا بخار ہے۔ ڈاک لانیکی خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے۔ میں نے مہدی علی خاں ساکن حسنپور سے جو اسوقت موجود تھا کہا۔ صبح کی ڈاک تم لانا۔ اوسنے دریافت کیا۔ اسوقت ڈاک بٹتی ہے۔ مینے کہا۔ منہ اندھیرے جانا بیکار ہے۔ جب سورج پھیلجائے ادسدم گھر سے چلنا۔ مہدی علی سمجھدار آدمی ہے۔ دن کے ساڑھے آٹھ بجے اس نے ڈاک لا کر دی جس میں آپکا خط بھی تھا۔

1۔ چوبکلاں یہاں دست یاب نہو سکی۔ کالپچرن کو اسوقت خط لکھا ہے کہ شاہجہانپور سے انیس تولہ لیتا آئے راستہ میں نوابگنج ٹھیر کر خوبکلاں حاضر خدمت کریگا۔

2۔ فتحیاب خاں توپخانہ میں ملازمت کے خواہشمند ہیں۔ اپنے دوست کپتان نامدار بیگ

کے نام اگر آپ سفارش کا خط لکھدیں تو اس ہوشمند اور دیانتدار آدمی کا کام بنجائے۔ وہ اب بھی آپ کا تابعدار ہے۔ آئندہ احسانمند بھی رہیگا۔

3۔ غزل کے بارےمیں جو رائے آپنے ظاہر کی ہے۔ بس عین میرے دلکی بات ہے۔ خمار کے بغیر میکشی میں کیا لطف رہیگا۔ سنگدل، مشکل، بسمل سب قافیے اچھے ہیں۔

4۔ فوجوں کی ریلیں دن رات یہاں سے گزر رہی ہیں جس کے باعث پھل کمیاب ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کم بخت لڑائی کب تک چلے گی۔ آموں کے پارسل کی رسید ہمرشتہ ہے۔

5۔ برخوردار سعادت علی دو ہفتے یہاں رہکر پرسوں بال بچوں کے ساتھ گولکنڈہ روانہ ہو گئے۔ وہاں سے کلکتہ جائیں گے۔ ایک ہزار میل سے اوپر کا سفر ہے۔

عقیدتمند
فتحعلی

حروف ملانے کی دشواریاں:۔

حروف ملانے سے جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا احساس عام طور پر اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ بچپن سے ہم کو حروف اور الفاظ ملانا سکھایا جاتا ہے جس کے باعث غیر ضروری حروف اور الفاظ کو ملا کر پڑھنے اور لکھنے کی عادت ہماری طبیعت ثانی ہو گئی ہے۔ جب میں پبلک سروس کمیشن کا ممبر تھا تو انڈین سول سروس کے امیدواروں کا زبانی امتحان ایک کمیٹی لیتی تھی جس کا میں ہر سال ممبر ہوتا تھا۔ ایک سال مجھے خیال آیا کہ جن امیدواروں نے امتحان میں فارسی لی ہے ان سے کچھ ایسی عبارت یا شعر پڑھواؤں جس میں غیر ضروری حروف اور الفاظ ملا کر لکھے گئے ہوں۔ خوشخطی کے نمونوں کی ایک کتاب میرے پاس اس زمانے میں موجود تھی جس میں فارسی اور اردو کی رباعیاں اور اشعار مختلف خوش نویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود تھے۔ میں نے بعض امیدواروں سے ایک شعر پڑھوایا جو حسب ذیل طریقے سے لکھا ہوا تھا شعر:

چمنمیستگلرویاں جوجھکیگا تجھکیںہو نگے
تو پابوسیکو پھر کسکسطر تجھکیںوں گے

جن امیدواروں سے میں نے یہ شعر پڑھوایا ان میں تقریباً ایک تہائی شعر پڑھ سکے۔

ایک تہائی نے شعر پڑھا مگر کئی منٹ تک سوچنے اور سمجھنے کے بعد اور پھر کچھ لفظ غلط پڑھے اور کچھ صحیح۔ ایک تہائی پڑھنے سے قاصر رہے۔ اس شعر کی معمولی کتابت درج ذیل ہے:

چمن میں مست گل رویاں جو پی کے مل جھکے ہوں گے
تو پابوسی کو پھر کس کس طرح کے گل جھکے ہوں گے

اردو رسم الخط: عملی وتہذیبی نقطۂ نظر سے

یادش بخیر اکبرؔ الٰہ آبادی نے ایک رقعے میں آنے والے چند خطرات کا ذکر کرتے ہوئے رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنے خدشے کا اس طرح اظہار کیا تھا۔

نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیب رقم ہوں گے

اکبر ہر تبدیلی سے خائف تھے۔ یہاں تک کہ پائپ کا پانی پینے سے اور ٹائپ میں تحریر پڑھنے سے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ انھیں اپنی تہذیب اور زبان سے بڑی محبت تھی اور اس کو کسی طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اکبر عاشق بھی تھے اور عارف بھی اس لیے انھوں نے عرصہ ہوا جو کچھ زبان وادب کے سلسلے میں کہا تھا۔ آج بھی ہمارے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ تہذیبی سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر تہذیب کے بنیادی عناصر باقی رہتے ہیں۔ تہذیب کی بنیاد ہل جائے تو انسان کی شخصیت کا رنگ محل ڈانواں ڈول ہو جائے۔ زبان صرف معلومات کے اظہار کا ذریعہ نہیں۔ خیال کی تخلیق اور ترسیل کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر یہ جذبے کی جان بھی ہے اور علامت کے رمز وایما کی کان بھی۔ کوئی شخصیت اس وقت تک اپنے قد کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے منہ میں اس کی اپنی زبان نہ ہو۔ زبان پر قدرت کے بغیر نہ خیالات کی پرواز ممکن

ہے۔ نہ علم کی صحت، نہ ادب کی جادوگری۔ اور یہاں مانگے کے اجالے سے کام نہیں چلتا۔ اپنے لہو کا چراغ جلانا پڑتا ہے، اپنے باطن میں جھانکنا پڑتا ہے، اپنے سرمایے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی زبانیں سیکھ کر ہم عالم فاضل بن سکتے ہیں مگر اپنے گھر کا چراغ نہیں بن سکتے، اپنے باغ کا پھول نہیں کہلائے جا سکتے۔ ہم میں علم آ سکتا ہے، بصیرت نہیں آ سکتی۔ ہم معلومات کی مشین بن سکتے ہیں، انسان نہیں بن سکتے۔

مالی نوسکی نے کہا ہے کہ دنیا کی سب زبانیں بالقوت برابر ہیں۔ ہر ایک میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے افکار و اقدار کی اعلیٰ ترین منزلوں تک پہنچ سکے۔ ابتدائی قبائل کی چھوٹی چھوٹی اور بکھری ہوئی زبانوں کو موقع ملتا تو انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، روسی، عربی، چینی جیسی زبانوں سے ہمسری کر سکتی تھیں۔ اس لیے ہر زبان برابر ہے۔ زبان کی عظمت بولنے والوں کی تعداد سے نہیں، اس کے ادب کی بلندی، اس کے افکار و اقدار کی ہمہ گیری۔ اس کے علمی سرمایے کی وسعت اور گیرائی اور اس کے فن کاروں کے گنجینۂ معنی کے طلسمات سے متعین ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ یہ سب قومی زبانیں ہیں اور کسی کو نہ کسی پر فوقیت ہے نہ کوئی کسی معنی میں کسی سے کمتر ہے۔ ہاں یہ بالکل دوسری بات ہے کہ سہولت کے لیے کسی ایک زبان کو رشتے کی زبان (Link Language) کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر سب زبانوں کے بولنے والے ہندی کو (Link Language) مان لیں تو ہندی کو یہ درجہ ملنا چاہیے۔ اگر لوگوں کا یہ اصرار ہو کہ جب تک ہندی پر سب کا اتفاق نہ ہو، انگریزی کی موجودہ حیثیت برقرار رہے تو سنجیدہ اور معقول اور وطن کے سچے پریمی انگریزی اور ہندی کو ساتھ چلانے پر زور دیں گے۔ اردو کا جھگڑا نہ ہندی سے ہے نہ بنگالی سے نہ تامل سے۔ اردو کسی زبان کی جگہ لینا نہیں چاہتی۔ یہ اپنا جائز حق اور مناسب درجہ چاہتی ہے۔ سچی قومیت کسی زبان کو دبانے میں نہیں، ہر زبان کو اس کا مناسب درجہ اور حق دینے میں ہے۔ بات سیدھی سادی ہے مگر جب تعصب اور تنگ نظری کی عینک چڑھی ہوئی ہو تو یہ سیدھی اور سچی بات لوگوں کو نظر نہیں آتی مگر ہمیں تو ہر حال میں اپنی بات کہے جانا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ بالآخر حق و صداقت کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ نہ ہندی کی شیلی ہے۔ نہ عربی فارسی کی ذیلی

تعمیر۔ یہ کھڑی بولی کی بنیاد پر پروان چڑھی۔ یہ واقعہ ہے کہ کھڑی بولی کا ابتدائی ادب اور درمیانی ادب بیشتر اردو کا ہے۔ جدید ہندی تو خواہ لوگ کچھ کہیں انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ اردو اور ہندی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ دونوں بہنیں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں۔ ان کے نقش ونگار اور خط وخال میں خاصی مشابہت بھی ہے مگر ان دونوں بہنوں میں سے ایک کو راج سنگھاسن پر بٹھانا اور دوسری کو ٹھکرانا، تہذیب، ادب، انسانیت سبھی کی شریعت میں قابل اعتراض ہے۔ یہ اردو زبان جب سے وجود میں آئی اس رسم الخط میں لکھی گئی جسے آج ہم اردو رسم خط کہتے ہیں۔ کیا ہوا اگر یہ رسم الخط عربی اور فارسی رسم الخط پر مبنی ہے۔ عربوں اور ایرانیوں سے ہم نے بہت سی چیزیں لی ہیں۔ مگر ان چیزوں کو اپنے طور پر برتا ہے۔ ہم نے فارسی رسم الخط میں متعدد حرفوں کے اضافے کر کے اسے اپنا رسم الخط بنالیا ہے۔ اب یہ اردو رسم الخط ہے اسے فارسی یا عربی رسم الخط نہیں کہنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ بالکل شروع میں اور آج کل اردو کی بہت سی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی ملتی ہیں۔ اردو کے لیے رومن رسم الخط بھی استعمال ہوا ہے اور فوج میں تو بہت عرصے تک اس کا رواج رہا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے مقالے میں ایسی بہت سی ہندی کی کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو پہلے اردو رسم الخط میں استعمال ہوا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اسے اردو رسم الخط کے بجائے اپنا رسم الخط مان لیں۔ اس منطق کی رو سے تو اردو رسم الخط ہندی کے لیے بھی استعمال کرنے کی دلیل نکل آتی ہے مگر ابتدائی دور کی طفلانہ باتوں کو لوگ جوانی میں ترک کر دیتے ہیں۔ آدمی اپنے بچپن سے نہیں اپنی جوانی سے پہچانا جاتا ہے جب اس کا کردار بن جائے اور اس کی شخصیت مکمل ہو جائے۔ اردو کے لیے صدیوں سے موجودہ رسم الخط استعمال ہو رہا ہے۔ اب یہ وہ جلد ہے جو زبان کے جسم پر ہے۔ اس جلد کو آپ بدل دیں تو زبان کے جسم کو آنچ آئے گی۔ رسم الخط کوئی لباس نہیں ہے کہ ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا، یہ کوئی غلاف نہیں ہے کہ ایک علاحدہ کیا اور دوسرا چڑھا دیا۔ اگر ڈرنگر کا یہ قول صحیح ہے کہ فن تحریر تہذیب انسانی کی کلید ہے تو رسم الخط اس تحریر کا کوڈیا قفل ہے۔ جب تک یہ قفل نہ ہو آپ کلید سے صحیح کام نہیں لے سکتے۔

رسم الخط صرف علم نہیں دیتا ذہنی کشادگی اور نفسیاتی طمانیت بھی عطا کرتا ہے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ الفاظ کے معنی جانتے ہیں مگر شعر کا مطلب نہیں بتا سکتے یہ ماورائے

شاعری اور ماورائے سخن بات جو ذہن بتاتا ہے اور ذہن کی ساری اعصابی توانائی سے عبارت ہے۔ اسی رسم الخط کے ذریعہ سے ممکن ہے جس سے ہم مانوس ہیں جو ہمیں صرف استاد نے نہیں پڑھایا۔ بلکہ ہم نے گھر کی کتابوں میں دیکھا، دیواروں پر وصلیوں میں پایا۔ مراسلات کو ماں باپ کے حوالے کرتے ہوئے دیکھا اور خود حرف پہچاننے سے پہلے جس سے آشنا ہوئے۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ اردو دیوناگری یا رومن رسم الخط کے ذریعے بھی پڑھا سکتے ہیں۔ آپ بے شک کچھ الفاظ، کچھ اسباق، کچھ حکایتیں کچھ کاروباری باتیں سکھا دیں گے۔ مگر پڑھنے والوں کو اردو زبان اچھی طرح نہیں آئے گی اور ادب کی روح تک تو ان کی رسائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ درست ہے کہ عام لوگوں کی ہمارے سارے کلاسیکل سرمایے تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ مگر ہو تو سکتی ہے۔ دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تو اس ناپیدا کنار سمندر کے چند قطرے ہی مل سکیں گے اور ہر دریا کو کوزے میں بند کیا بھی نہیں جاسکتا۔ ترکی میں اتاترک نے رومن رسم الخط رائج تو کردیا مگر ترک اس جھٹکے سے ابھی جانبر نہیں ہوسکے ہیں۔ ہمارے یہاں تو سارے سرمایے کے منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فراق نے ایک دفعہ اپنی کتابوں کی الماری میں کتابوں کی قطار کی طرف اشارہ کرکے بڑے مزے کی بات کہی تھی۔

I Do Not Read Them, I Need Them

میں انھیں پڑھتا نہیں ہوں مگر ان سب کی مجھے ضرورت رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی سب کتابیں کون پڑھ سکتا ہے مگر ان سب کتابوں کی ضرورت سبھی کو ہے اور پھر بقدر شوق اور حسب استعداد ہر ایک انھیں پڑھ سکتا ہے۔ اس لیے رسم الخط کے سلسلے میں یہ مسئلہ میرے نزدیک بنیادی ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کتابوں تک پہنچ سکے۔ گولیوں میں بند غذا (Tabloids) سے ہم چاند تک تو پہنچ سکتے ہیں مگر دھرتی پر سیدھے سبھاؤ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح دیوناگری رسم الخط یا رومن رسم الخط میں اردو کی چند کتابوں یا چند سو کتابوں تک رسائی کے معنی اردو ادب تک رسائی کے نہیں ہیں۔ بقول پوپ کے تھوڑا علم خطرناک ہے۔ خوب سیر ہوکر پیو یا مقدس چشمے کو آلودہ نہ کرو' یا تو اتنا کرو کہ پینے کا دعویٰ نہ کرو۔ اردو کے لیے جو لوگ ناگری رسم الخط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ خدا جانے کیسے اس وسوسے میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ اردو اگر مری نہیں تو نیم جان ہے اور اس زبان

کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ دیوناگری رسم الخط کے ذریعے سے یہ ہندی پڑھنے والوں کے دلوں میں پہنچ جائے اور بالآخر رسم الخط کو ترک کر کے کسی طرح اپنی جان بچالے، اول تو یہ خطرناک خوش فہمی ہے کہ دیوناگری رسم خط اختیار کر لینے کے بعد اردو کی مقبولیت بڑھ جائے گی۔ دوسرے میں تو سرے سے یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوں کہ اردو نیم جان ہے یا مر رہی ہے۔ جن لوگوں کا ایمان ضعیف ہے وہ ذرا ہوا تیز چلے یا آندھی آئے تو تلے اوپر ہونے لگتے ہیں، اردو پر نہ پیمبری وقت پڑا ہے نہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں، نہ اردو سمٹ کر چند شہروں تک رہ گئی ہے۔ نہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، یہ اردو جاگیردارانہ ماحول کی یادگار ہے۔ نہ یہ مصنوعی زبان ہے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کا سب سے شاندار عطیہ ہے۔ یہ ہندوستان کی دھرتی سے اُگی۔ ہندوستان کے کھیتوں میں پھلی پھولی، یہاں کے بازاروں، خانقاہوں اور درباروں میں بڑھی اور جوان ہوئی اور یہاں کی ہر کروٹ، ہر تحریک، ہر کشمکش، ہر درد و داغ، سوز و ساز، آرزو اور جستجو کی امین ہے۔ 1961 کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ اڑتیس لاکھ ہندوستانی یہ زبان بولتے ہیں۔ یہ تعداد بہت سے ملکوں کی آبادی سے بڑی ہے۔ 1971 کی مردم شماری مارچ میں ہونے والی ہے۔[1]

اندازہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد موجودہ حالات کے باوجود اور دقتوں اور دشواریوں کے باوصف تین کروڑ سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو بولنے والے کم ہو رہے ہیں۔ اگر ملک کی تقسیم کے وقت کچھ اردو بولنے والے چلے گئے تو ان کی جگہ بہت سے آبھی گئے۔ ہمارے صنم خانے کو کعبے سے بھی پاسبان ملے ہیں۔ پھر ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں جس میں اردو بولنے والے موجود نہ ہوں اور اتر پردیش میں انہتر لاکھ، بہار میں اکتالیس لاکھ، مہاراشٹر میں ستائیس لاکھ، آندھرا پردیش میں پچیس لاکھ، میسور میں بیس لاکھ، مغربی بنگال میں آٹھ لاکھ، مدھیہ پردیش میں آٹھ لاکھ، تامل ناڈو میں چھ لاکھ، گجرات میں چھ لاکھ، راجستھان میں پانچ لاکھ، اڑیسہ میں دو لاکھ، ہریانے میں دو لاکھ اور دہلی میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آبادی تو 1961 کی مردم شماری میں دکھائی گئی ہے۔ یہ تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اور دقتوں،

---

[1] اس مردم شماری کے اعداد و شمار ابھی سامنے نہیں آئے ہیں۔ (دلوی)

دشواریوں کے باوجود بڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم کا ریاستی حکومتیں مناسب انتظام نہیں کرتیں۔ اس کے چلن پر رکاوٹیں ہیں۔ اس کے خلاف کچھ حلقوں میں تعصب ہے۔ یہ تعصب دور ہوجائے۔ یہ رکاوٹیں نہ رہیں اور اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو۔ تو آپ اردو کی ترقی دیکھئے گا۔ اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم پہلے سے بہت زیادہ بڑھی ہے لگ بھگ چالیس یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو میں تحقیق اور تنقید دونوں کا معیار پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اردو میں اخبار آج بھی انگریزی اور ہندی کے بعد سب سے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں ہر سال جو کتابیں نکلتی ہیں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے کم نہیں ہو رہی ہے۔ اردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے آندھرا پردیش میں تلنگانہ اور ہماچل پردیش کی ثانوی زبان ہے۔ پنجاب کی ثانوی زبان منوانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا، میسور، اور دہلی میں اسے سرکاری زبان منوانے کی تحریک اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسے تسلیم نہ کرلیا جائے۔ میں ہندوستانی جمہوریت سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندوستانی عوام پر میرا ایمان مستحکم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انھیں کچھ عرصے تک اور بہکایا جاسکتا ہے۔ مگر بالآخران کا ضمیر جاگے گا اور وہ اردو کو اس کا حق دیں گے۔ اردو کسی دوسرے دریا کے معاون کی حیثیت سے نہیں، ایک آزاد، خودمختار، اپنی ایک انفرادیت رکھنے والے اپنی رو میں بہنے والے، اپنی موجوں کے زیروبم سے ہزاروں آئینے دکھلانے والے دریا کی حیثیت سے اپنا فیض عام کرتی رہے گی۔ اپنے سے مایوس دوسروں پر تکیہ کرنے والے سیاست کے شکار یا تجارت کے غلام اردو سے مایوس ہیں تو ہوں، ہندوستان کے کروڑوں عوام جن کی زندگی، جن کا وجود، جن کی شخصیت، جن کا کردار، جن کا مزاج اردو سے بنا ہے۔ وہ نہ اپنے سے مایوس ہیں نہ اپنی زبان سے۔ اردو ہر زبان سے فیض حاصل کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ اردو ہر زبان کو بہت کچھ دیتی رہے گی۔ یہ آزادانہ اور دوستانہ لین دین جاری رہے گا اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ اردو بدلے گی بھی۔ نئے نئے الفاظ بھی لے گی اور خیالات بھی۔ اظہار کے سانچے بھی اور افکار کے ڈھانچے بھی اس کے خمیر میں وسیع المشربی، کشادگی، وسعتِ قلب قلندری اور آزادی ہے۔ یہ رسم خط دے کر زبان کا سودا کیوں کرے۔ آپ نے وہ پرانا قصہ سنا ہوگا: شاہا دو رخ بدہ دولا رام راہ مدہ۔ یہاں رخ دیتے ہیں تو دلارام

بھی جاتی ہے بلکہ رخ دلارام کے پاسبان ہیں اور پاسبانوں کی نگہداشت ہر مستعد اور چوکنے ادارے کا فرض ہے۔

دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کے حامی بڑی شدومد سے کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی تو ایک ہی زبان ہیں۔ اردو اپنے الگ اسٹائل میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے بچانے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ ہندی کے اسٹائل میں مل جائے مجھے ایسے لوگوں کی فہم وفراست پر حیرت ہوتی ہے بحث کے لیے کوئی دھرم ویر بھارتی، کوئی یش پال یہ کہہ دیتا ہے کہ اردو کا سارا سرمایہ بھی ہندی کا سرمایہ ہے۔ مگر آج تک میری نظر سے کسی یونیورسٹی کا ہندی کا ایسا نصاب نہیں گزرا جس میں پرساد، نرالا اور میتھلی شرن گپت اور بھارتیندو، اور تلسی، سور، میرا، کبیر کے ساتھ میر، سودا، نظیر، انیس، اکبر، اقبال، چکبست، سرسید، سرشار، نذیر احمد، حالی، شبلی، کو جگہ دی گئی ہو۔ ہندی رسم الخط میں تو اب وہ نقطے بھی اڑا دیے گئے ہیں جو اردو کی آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے مسعود حسین خان[1] کا وہ پر لطف مضمون پڑھا ہوگا جس میں ہمارے ممتاز شعرا کے ان اشعار کا نمونہ دیا گیا ہے جو ہندی رسم الخط میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ چند سیاسی مداریوں۔ یا ادبی شعبدہ بازوں کے کہنے میں آکر ہم کس طرح اپنی متاع عزیز ایک امید موہوم پر قربان کردیں جبکہ آج تک کسی نے ان حضرات کے کہنے پر عمل کر کے اردو اور ہندی ادب کا ایک مشترک نصاب نہیں بنایا۔ ہم کیسے یہ گوارا کرلیں کہ ہماری زبان کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ہم اپنے دریا کا سارا پانی ایک بڑے دریا میں کیسے ملا دیں۔ جمنا بھی جب گنگا میں ملی تو کچھ دور تک اس کا ہلکا نیلا رنگ باقی رہا مگر ذرا آگے چل کر وہ گنگا میں غائب ہو گیا۔ بقول شاعر:

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

جن لوگوں کا قومی یکجہتی کا تصور ایک مذہب یا ایک زبان کا ہے۔ وہ ہندوستانی جمہوریت کے مزاج کو نہیں سمجھتے۔ ہندوستانی جمہوریت کی بات آپ غالب کی زبان سے سنیے:

[1] مطبوعہ "ہماری زبان" علی گڑھ

ہے رنگِ لالہ و گلِ نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہا ر کا اثبات چاہیے
سر پائے خم یہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے

ہندوستانی جمہوریت تصوف کی طرح کثرت میں وحدت کی قائل ہے اور یہاں کثرت اور وحدت دونوں پر اصرار ہے اور کثرت میں وحدت پر بھی۔ اس لیے جہاں ہر زبان کو آزادانہ ترقی کرنی چاہیے۔ نہ کسی دوسری زبان پر تکیہ کر کے نہ کسی وسیع قلمرو کا ایک حصہ بن کر۔ آخر دو بہنوں کو بھی تو بالآخر اپنی زندگی الگ الگ گزارنی پڑتی ہے۔ وہ ساری عمر ساتھ نہیں رہتیں۔ نہ ایک بہن دوسری کی خاطر اپنا مستقبل تج سکتی ہے۔ اردو سے یہ توقع کیوں ہو۔

جب لوگ اردو کے زوال کا ماتم کرتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے ذریعے سے ہندی کا قلعہ جیتنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب لوگ یہ کہہ کر کہ دیوناگری رسم الخط زیادہ سائنٹفک ہے یا صوتی حیثیت سے مکمل ہے۔ ہمیں طعنہ دیتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط مقر نہیں ہے۔ ہر رسم الخط میں کچھ خوبیاں ہیں اور کچھ خامیاں۔ کوئی ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے، کوئی دوسرے لحاظ سے۔ جب حسن کا کوئی مطلق معیار وضع کرنا آسان نہیں اور جب اس میں نظارے کے علاوہ ذوق نظر کو بھی دخل ہے تو کسی رسم الخط کو سائنٹفک کہہ کر دوسرے کو گرانا میرے نزدیک فریب دہی ہے۔ خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ، یہ صحیح ہے کہ دیوناگری صوتی حیثیت سے بہتر ہے مگر آخر صوری حیثیت بھی تو کوئی چیز ہے پھر سائنس کا لفظ کوئی ایسا منتر نہیں کہ پڑھ کر پھونک دیا اور سب ڈھیر ہو گئے۔ زبان، مذہب، ادب، تہذیب، عقیدے کے معاملے میں سائنس نہیں چلتی۔ انسان مشین نہیں ہے وہ جذبات اور جبلتوں کی پوٹ ہے۔ آج کے انسان میں ابتدائی انسان سے لے کر موجودہ دور کے تہذیبی سفر تک کے اثرات موجود ہیں۔ انسان فارمولوں، چارٹوں، حسابی اعداد میں بند نہیں ہے۔ سائنس کا لفظ کوئی سم سم نہیں ہے کہ آپ نے

بڑھا اور خزانے کا دروازہ کھل گیا۔ زبان سے کہنے، عقل سے جاننے اور دل سے ماننے میں فرق ہے۔ میں عقل کو مانتا ہوں۔ سائنس کی اہمیت کا قائل ہوں مگر دل کی بات بھی سمجھتا ہوں۔ اور رسم الخط کے سلسلے میں برنارڈ شا کی پر زور تلقین کے باوجود انگریزوں کی قدامت پسندی کا راز بھی جانتا ہوں۔ زبان کے معاملے میں سائنس کے اصول کام نہیں دیتے۔ زبان کی اپنی سائنس ہے۔ لسانیات کے ماہرین کتابی قواعد کو نہیں مانتے۔ چلن کی منطق کو تسلیم کرتے ہیں۔ سائنس کے طاعت وزہد کا سارا ثواب تسلیم مگر زبان وادب میں بالآخر قول فیصل یہی ہے۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ یہ ہٹ دھری نہیں ہے۔ نفسیاتی صداقت ہے اور آپ چاہے اور کتنی ہی صداقتوں سے انکار کر دیں۔ نفسیاتی صداقت سے آپ نے انکار کیا اور آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنی شخصیت کی کمی یا ناہمواری گوارا کر لی۔

اردو رسم الخط کی وجہ سے پڑوسی ملکوں سے ہمارا رشتہ استوار ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں پانچ زبانیں مشترک ہیں۔ اردو، بنگالی، پنجابی، سندھی، کشمیری، ان میں بنگالی کو چھوڑ کر چار کے لیے اردو رسم الخط استعمال ہوتا ہے۔ جب آزادی کے بعد سندھی بڑی تعداد میں ہندوستان آئے تو پھر سرکاری حلقوں کے اثر سے ان کے یہاں سندھی کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی تحریک چلی۔ مگر میں یہ بات بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ سندھیوں کی بڑی تعداد ہر طرح کے دباؤ کے باوجود اپنے رسم الخط کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ملک میں زبان ایک رسم الخط میں لکھی جائے اور دوسرے میں دوسرے رسم الخط میں۔ زبان وادب کا رشتہ بعض اوقات جغرافیائی حدود کو پار کر کے اپنا اثر دکھاتا ہے۔ مجھے اب تک آنند شنکر رے، مشہور بنگالی مصنف کی بات یاد ہے جو انھوں کئی سال ہوئے شملے کے ایک سمینار میں کہی تھی۔ مشرقی بنگال کے ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑے فخر سے وہاں کے رسالوں اور نئی مطبوعات کا ذکر کیا۔ صبیح الدین کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک تھی۔ شکاگو میں ایک نوجوان بنگالی مسلمان شمس الباری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ٹیگور کا اس خلوص ومحبت سے ذکر کرتا تھا۔ گویا وہی اس کا نام لیوا ہو۔ اسے پاکستان کی حکومت سے شکایت تھی کہ اس نے ایک زمانے میں ٹیگور کے گیتوں پر پابندی لگا دی تھی۔ غرض ہمسایہ

ملکوں میں ایک ہی زبان کا چلن ہو تو زبانوں کے دو رسم الخط دو دیواریں بن جاتے ہیں۔ ایک رسم الخط دونوں کے درمیان تہذیبی رشتے استوار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اردو رسم الخط کے ذریعے سے صرف پاکستان و افغانستان سے نہیں پورے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ سے ہمارے تہذیبی روابط برقرار رہ سکتے ہیں۔

ہاں جو لوگ تدریسی ضروریات یا موجودہ طباعتی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان کی بات توجہ سے سنی چاہیے اور اس پر غور کرنا چاہیے۔ ہمیں رسم الخط میں تبدیلی کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں آج کے دور کی ضروریات کے مطابق رسم الخط میں اصلاح ضرور کرنی چاہیے۔ دراصل ہمارے رسم الخط کی بہت سی الجھنیں نستعلیق طرز تحریر سے وابستہ ہیں۔ چونکہ اس رسم الخط میں حرفوں کی شکلیں بدل جاتی ہیں مثلاً ب کی آٹھ شکلیں ہوتی ہیں۔ اس لیے بچوں اور غیر ملکیوں کے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے اور اس کے سیکھنے اور یاد کرنے میں دیر ہوتی ہے۔ دوسرے اگرچہ آفسیٹ کی وجہ سے نستعلیق کی بہت سی دشواریوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور فوٹو لے کر ہم بڑی تعداد میں کتابیں اور اخبار چھاپ سکتے ہیں مگر کتابت میں بہر حال بہت وقت صرف ہوتا ہے اور پھر آفسیٹ میں اتنا خرچہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اس لیے آج سے نہیں کچھ عرصے سے اردو زبان و ادب کے کچھ بہی خواہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہمیں طباعت کے لیے نسخ طرز تحریر کو اختیار کر لینا چاہیے۔ چھوٹے پریسوں میں ہاتھ سے کمپوزنگ ہو سکتا ہے اور بڑے پریسوں میں مانو ٹائپ اور لائنو ٹائپ مشینیں لگائی جا سکتی ہیں۔ لائنو ٹائپ میں پوری پوری سطریں ایک ساتھ ڈھل جاتی ہیں اور مانو ٹائپ میں ایک ایک لفظ ڈھلتا ہے۔ لائنو میں ایک لفظ کی صحت کرنی ہو تو سطر بدلنی پڑے گی۔ مانو میں صرف ایک لفظ کو نکال دینا کافی ہوگا۔ اخباروں کے لیے لائنو اور کتابوں کے لیے مانو زیادہ موزوں رہے گا۔ ہم چونکہ نستعلیق سے مانوس ہیں اور اس کے دائروں کے شیدائی اس لیے ہمیں نسخ بھدا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بچپن سے نستعلیق طرز میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے آئے ہیں۔ میں نے حال میں پاکستان کی وہ کتابیں دیکھیں جو بچوں کو تیسرے اور چوتھے درجے میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ نسخ ٹائپ میں چھپی تھیں۔ حروف جلی اور روشن تھے۔ اور چونکہ کاغذ اور طباعت دونوں اچھے تھے اس لیے مجھے تو

یہ کتابیں اچھی معلوم ہوئیں۔ نستعلیق رسم الخط کو ترک کرنے کا سوال نہیں ہے۔ عام لکھاوٹ کے لیے یہ اب بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خاص قسم کی مطبوعات کے جو خاص موقعوں پر تیار ہوں یا خاص خاص کاموں کے لیے نستعلیق رسم الخط میں فوٹو آفسیٹ کے ذریعے بھی کتابیں چھاپی جاسکتی ہیں۔ آخر ایران میں بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ جہاں عام رواج نسخ ٹائپ کا ہے۔ خاص مطبوعات نستعلیق میں چھاپی جاتی ہیں۔ نستعلیق صرف خط نہیں بلکہ فن لطیف بھی ہے۔ اس فن لطیف کو باقی رکھنا چاہیے۔ مگر عام تدریس اور طباعت کے لیے نسخ کا استعمال ضروری ہے۔ ہمیں بڑے پیمانے پر درسی کتابیں تیار کرنا ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کے ایڈیشن نکالنے ہیں۔ اس کا انتظام کرنا کہ ہمارے اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھپیں، جب یہ نسخ ٹائپ کے ذریعے سے ہوسکتا ہے تو اسے اختیار کر لینے میں پس و پیش کیوں؟

انجمن ترقی اردو ہند نے 1962، 1963 میں رسم الخط میں اصلاحات کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی تھی۔ جس کی تجاویز رسالہ اردو اکتوبر 1923 میں شائع ہوئی تھیں۔ ان اصلاحات پر انجمن حیدر آباد کی درسی کتابوں میں ایک حد تک عمل بھی ہوا تھا۔ پھر 3 / اکتوبر 1945 کے ہماری زبان میں ایک اور کمیٹی کی روداد چھپی تھی۔ اصلاحات کے سلسلے میں دراصل مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی خدمات ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھی جائیں گی۔ ان حضرات نے انشاء کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے کہ اردو میں کوئی لفظ خواہ عربی کا ہو یا فارسی کا یا ترکی کا جس طرح اردو میں رائج ہوگیا ہے خواہ اصل کی رو سے صحیح ہے یا غلط اسے اردو کا لفظ سمجھنا چاہیے۔ املا کے لیے بہت مناسب اصلاحات تجویز کی تھیں۔ ان اصلاحات کی خوبی یہ تھی کہ ان میں چلن استعمال، آواز اور تلفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے آج کی تدریسی اور طباعتی ضروریات کے لیے گنجائش نکالی گئی تھی۔ ان سفارشات پر کچھ لوگوں نے عمل کیا اور ایک زمانے میں رسالہ اردو انجمن کی مطبوعات میں بھی ان کا لحاظ رکھا گیا۔ مگر آئے دن کی ضروریات، کاتبوں کی عادت اور سرمایے کی کمی کی وجہ سے ان پر پورا عمل نہ ہوسکا۔ انجمن ترقی اردو ہند نے 1956 میں پھر رسم الخط کی اصلاح کے لیے ایک ماہرین کی کمیٹی بنائی۔ اس کے سوال نامے کے جواب میں اسی جواب موصول ہوئے۔ اسی میں سے اگرچہ چینیشہ نے سفارش کی تھی کہ چھپائی کے لیے نسخ اور لکھاوٹ کے لیے

نستعلیق استعمال ہو مگر انجمن کی جولائی 1957 کی کانفرنس میں اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بہر حال میری رائے میں ہمیں اس معاملے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے اور تمام متعلقہ حضرات کو اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ رفتہ رفتہ چھپائی کا سب کام ٹائپ میں کریں۔ اس کے لیے حکومت اور بڑے اداروں کو تجارتی حلقوں کے لیے سہولتیں پیدا کرنی پڑیں گی۔ ٹائپ فی الحال مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے ٹائپ کی مشین لگانے کے لیے امداد دینی پڑے گی۔ جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں ان کو اس پر راضی کرنا پڑے گا کہ فی الحال ٹائپ کی کچھ مہنگی کتابیں خریدیں لیکن ایسے معاملات میں سب فوراً ساتھ نہیں ہوتے۔ یہ عمل رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس تبدیلی میں بھی کچھ دیر لگے گی۔ میرے نزدیک حسب ذیل اصلاحات پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی تدریسی اور طباعتی ضروریات پوری ہوں گی۔ اردو کی خود مختار اور آزاد حیثیت برقرار رہے گی۔ موجودہ روپ میں کوئی ایسی تبدیلی بھی نہ ہوگی کہ تحریر نامانوس ہو جائے، نو آموز حضرات کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ہمارے رسم الخط پر اعتراضات کم ہو جائیں گے۔ یہ جو آئے دن کوئی نہ کوئی ضعفِ ایمان کا شکار احساس کمتری کا مریض یا ابن الوقت رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔ اس کی اپیل باقی نہ رہے گی۔

طباعت کے لیے نسخ ٹائپ اختیار کرنے کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ ہر ملنے والے حرف کی دو سے زیادہ شکلیں نہ ہوں۔ ایک پوری، ایک آدھی، مثلاً ع کی شکل عہد میں کچھ ہے "بعد" میں کچھ۔ "سمع" میں کچھ اور "ساع" میں کچھ۔ اگر ایک "عہد" کی سی شکل شروع یا درمیان میں اور ایک ساع کی عین کی شکل آخر میں رہے تو نو آموزوں کی الجھن اور پریشانی دور ہو جائے گی۔ اسی طرح آدھی ب اور پوری ب کے لیے مد اور باب میں ب کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ سجاد مرزا کے بنیادی ٹائپ میں اس کا التزام رکھا گیا تھا۔ اس طرح کرسی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ بنیادی ٹائپ کو اختیار کیا جائے یا نہیں مگر جوڑوں کی زیادتی سے ٹائپ میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا حل ضروری ہے اور یہاں مانوس حسن کا سوال نہیں آنا چاہیے۔ آسانی، سہولت، صحت اور کفالت کو دیکھنا چاہیے۔ کچھ لوگ س۔ ص۔ ث۔ میں سے ایک حرف اختیار کر لینے پر زور دیتے ہیں۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ جس طرح غالب کے ابتدائی کلام کے رنگ اور آرزو لکھنوی کے

رنگ دونوں کو میں اردو کے دائرے سے خارج کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جس طرح ابوالکلام آزاد کے اسٹائل اور عبدالحق کے اسٹائل دونوں کے حسن کو مانتا ہوں۔ اسی طرح ان عربی فارسی الفاظ کو جو ہماری زبان میں آ گئے ہیں۔ بگاڑنے کا قائل نہیں۔ محبت چھوٹی ہ سے لکھی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ میں محبت کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ ہاں خورشید کو ''و'' کے بجائے پیش سے غالبؔ نے بھی لکھا ہے۔ زکوۃ کو عربی قاعدے سے لکھنے کے بجائے زکات، رحمٰن کو رحمان، اسمٰعیل بلکہ عیسیٰ اور موسیٰ کو الف سے لکھنے کے حق میں ہوں۔ لغت میں اس کا اصلی تلفظ مل جائے گا اور اصل زبان کی شکل بھی۔ لیکن عام طور پر جس طرح بولا جائے اسی طرح لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ ''ے'' کے استعمال کے سلسلے میں بھی کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے تھی کہ بڑی ے کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے۔ میرے نزدیک یائے معروف اور یائے مجہول عام طور پر پوری لکھنی چاہیے۔ ہاں آے، طئے، جے کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے آدھی یائے معروف یعنی ای، طی، خی لکھی جا سکتی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق میز کو مےز، میر کو مِیر، لکیر کو لکِیر، مے کو مَی لکھنا ٹھیک رہے گا۔ دشواری یہ لکھنے میں پڑے گی تو اس کے بجائے صرف ے سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ صوتی لحاظ سے مناسب یہی ہے۔ ہمزہ کے سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمزہ صرف وہاں لکھنا چاہیے جہاں آواز ٹوٹ جائے۔ دیے، لیے بغیر ہمزہ کے اور گئے، نئے، آئے، جائے ہمزہ کے ساتھ لکھنے چاہئیں۔ کوئی، پائی، کوءی، پاءی لکھنا بہتر ہوگا۔ جہاں آخر میں الف کی آواز آتی ہے وہاں ہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پتہ کے بجائے پتا، بٹوارہ کے بجائے بٹوارا، پردہ کے بجائے پردا، کویلہ کے بجائے کویلا لکھنا بہتر ہوگا۔ کنواں، ہنسا، پھانسی میں نون غنہ کے اظہار کے لیے v کا نشان ضرور بنانا چاہیے۔ بلِ کُل، فورن، ادنا، اعلا تو اب لوگ لکھنے لگے ہیں۔ میں تو عبدالحفیظ کو بھی عبدل حفیظ اور فضل الرحمٰن کو فضل رحمان لکھنے کے حق میں ہوں۔ عبدل دہلوی کا ابراہیم نامہ ابھی مسعود حسین خان کی ترتیب سے شائع ہوا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ عبدل علاحدہ تو اردو کے قاعدے سے لکھا جائے مگر عبدالحفیظ عربی قاعدے سے لکھنا ضروری ہو۔

رسم خط کے سلسلے میں ایک آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اردو کی کتابیں ان لوگوں کے لیے جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں چھاپی جاتی ہیں تو

نہ صرف مجھے اس پر کوئی اعتراض ہے بلکہ میں اس کی حمایت کرتا ہوں ۔ کیونکہ اس طرح ہماری زبان کے الفاظ کسی نہ کسی طرح ایک وسیع تر حلقے تک پہنچتے ہیں۔ کوئی گھر بیٹھے اپنے ٹیلی ویژن پر باغ کا منظر دیکھنا چاہتا ہے تو وہ ہمارے پھولوں کے حسن، ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچانے اور روح کو بالیدہ کرنے والے رنگوں، ان کی مست کرنے والی خوشبو کا اندازہ نہ کر پائے گا مگر ہمارے باغ کی بہار کا کچھ تو فیض اس تک پہنچ ہی جائے گا۔ ہم کیوں اسے اس حق سے محروم کریں۔ ہاں جو ہماری زبان و ادب کی قدروں، اس کے فکر و فن کے تاج محل، اس کی ساحری، اس کے رزم و بزم، اس کی بلندی اور اس کی گیرائی، اس کی نفاست اور اس کی صلابت، اس میں مستی اندیشہ ہائے افلاکی اور زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم اس کی روایت اور اس کے تجربے، اس کی شیرینی، اس کے مزے، اس کی گمبھیرتا اور اس کی اعلیٰ سنجیدگی سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو اسے ہمارے رسم الخط کو سیکھنا چاہیے۔ مغرب کے لوگ تو مشرق کی مردہ زبانوں اور معدوم لکھاوٹوں کے سلسلے میں عمریں گزار دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ سہل پسندی کیوں ہے۔ زبان و ادب پر ہی نہیں، تہذیبوں اور قوموں پر بھی مشکل وقت آتے ہیں مگر زبانوں کے شیدائی اور تہذیبوں کے عاشق ہر مشکل پر قابو پانے کا عزم کرتے ہیں ۔ مایوس نہیں ہوتے ۔ ماتم نہیں کرتے۔ حالات کے حوالے اپنے کو نہیں کرتے ۔ دریا میں تنکے کی طرح نہیں بہتے۔ جب لندن پر جرمن ہوا باز طوفانی گولہ باری کر رہے تھے تو ایک دکان پر یہ تختہ لگا ہوا تھا۔ Usual Business کاروبار اسی طرح چالو ہے ۔ ہماری زبان و ادب کا کاروبار کاروبارِ شوق ہے اور کاروبارِ شوق میں وقتی نفع نقصان کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مستقل نفع نقصان کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ میں نہ اردو کو قریب مرگ سمجھتا ہوں، نہ روز بروز سکڑنے والی زبان، آزادی کے بعد ایک بڑے حلقے کی تنگ نظری کے باوجود یہ زبان زندہ اور توانا ہے۔ اس کے ادب میں آج کی ہر موج اور ہر ذہنی رو کے نقوش ملتے ہیں۔ فراقؔ اور فیضؔ ابھی موجود ہیں اور نئے، فراقؔ اور فیضؔ ابھر رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں اردو زبان کا چرچا امریکہ اور روس اور کئی دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ غالبؔ کی صد سالہ برسی تقریبات عالمگیر پیمانے پر منائی گئی تھیں۔ دقتیں اور دشواریاں ہیں۔ مگر ان کو دور کرنے کی سعی بھی جاری ہے اور ہم انھیں دور کر کے رہیں گے۔ اب بھی کچھ لوگ

سادہ لوحی یا ایمان کی کمزوری یا احساس کمتری یا سراسیمگی یا ذاتی مفادات کی وجہ سے کبھی رسمِ خط بدلنے کی بات کرتے ہیں یا کبھی ابتدائی ثانوی تعلیم کی منزل پر مادری زبان کے بجائے ریاستی یا علاقائی زبان پڑھانے کی۔ تو ان سے چکبست مرحوم کے الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے:۔

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

ہم نہ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں کیونکہ ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے،
جس بھیس میں جو آئے۔

تعارف

مقالہ نگاروں کا تعارف:۔

1۔ علامہ سید سلیمان ندوی	:	مشہور محقق، عالم اور سیرت نگار، مصنف نقوش سلیمانی، سیرۃ النبیؐ، سیرت عائشہؓ وغیرہ
2۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق	:	مشہور محقق، عالم اور ادیب، مصنف نصرتی، قواعدِ اردو، چند ہم عصر و مرتب سب رس، قطب مشتری، گلشنِ عشق وغیرہ۔
3۔ مولانا وحید الدین سلیم	:	محقق، عالم اور شاعر، سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، مصنف وضعِ اصطلاحات
4۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت	:	ماہر زبان اور قواعد نویس، مصنف اردو شاعری کی چار کتابیں، اصولِ اردو، جانِ اردو وغیرہ
۵۔ پنڈت دتاتریہ کیفی	:	مشہور محقق، ماہر زبان و عالم اور شاعر، مصنف کیفیہ، منشورات، واردات وغیرہ

6۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی : محقق، عالم، ماہر زبان، سابق پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی ،الہ آباد

7۔ سر رضا علی : قومی لیڈر۔ ممبر پبلک سروس کمیشن، مصنف اعمال نامہ

8۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور : محقق، ماہر زبان اور ماہر دکنیات مصنف اردو شہ پارے، ہندوستانی لسانیات ، ہندوستانی صوتیات (انگریزی) ، سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی و کشمیر یونیورسٹی

9۔ پروفیسر عبدالقادر سروری : محقق اور ماہر لسانیات مصنف زبان اور علم زبان، دنیائے افسانہ فہرست مخطوطات جامعہ عثمانیہ

10۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان : مشہور محقق ، ناقد اور ماہر لسانیات مرتب قدیم اردو، ابراہیم نامہ، بکٹ کہانی و مصنف مقدمہ تاریخ زبان اردو و شعر و زبان ، پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

11۔ پروفیسر احتشام حسین : بالغ نظر نقاد ، ادیب اور ماہر زبان ، مصنف مترجم و مرتب ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' مصنف تنقید اور عملی تنقید'' ذوقِ ادب اور شعور وغیرہ، پروفیسر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

12۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی : مشہور عالم اور محقق سابق صدر شعبۂ اردو لکھنو یونیورسٹی ،مصنف اردو زبان اور رسم الخط لکھنو کا شاہی اسٹیج

13۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری : ماہر لسانیات و محقق صدر ترقی اردو بورڈ، کراچی، مصنف و مرتب اردو لسانیات، لسانی مسائل وغیرہ

14۔ پروفیسر آلِ احمد سرور : مشہور ناقد پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

15۔ ڈاکٹر گیان چند جین	:	محقق و ماہر زبان پروفیسر جموں و کشمیر یونیورسٹی، جموں، مصنف اردو کی نثری داستانیں، تحریریں اور شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا
16۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	:	نوجوان محقق و ماہر لسانیات، مصنف اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، کرخنداری اردو (انگریزی) ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی
17۔ ڈاکٹر مغنی تبسم	:	نوجوان ناقد استاد شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مصنف فانی بدایونی و مرتب شعر و حکمت
18۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل	:	استاد شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
19۔ محمد اسحاق صدیقی	:	محقق زبان و مصنف، فنِ تحریر کی تاریخ

کتابیات

لسانیات اور صوتیات پر منتخب کتابیات جو لسانیات سے دلچسپی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

ENGLISH BOOKS

1- Course in Gen.Linguistics	: F.D.Sassure
2- Language	: Bloomfield
3- Language	: Dward Sapir
4- Language: Its Orign&Development	: Jesperson
5- Language	: Vendryes
6- Mankind, Nation&idividaul	: Jesperson
7- Leave your Language Alone	: Hall
8- Int to Linguistics	: Hall

9- An outline of Linguistics Analysis : Blook & Trager

10- An int to Descriptive Linguistics : G.A Gleason

11- A Course in Modern Linguistics : C.F Hockett

12- Language Hindi in Cantact : Urial Wenreich

13- Language in Culture & Society : Ed. Dell Hymes

14- Social linguistics : Ed.Sol Saporta

15- Language & Its Structure : Langacker

16- Aspects of Language : Bolinger

17- Linguistics & Literary Style : Ed. freeman

18- Description & Measurement of Bilingualism : Ed.L.G. Kelly

19- Geteral Linguistics: An Survey : R.H. Robins.

20- Linguistic Sciences & Language Teaching : M.A,K. halliday& Others

21- Linguistic Across Culture : Rubertlado

22- Elements of General Phonetics : Devid Abecrombie

23- An out line of english phonetics : Danial Jones

24- General Phonetics : Haffner

25- Phonetics : K.L. Pike

26- Phonemics : K.L. Pike

27- Morphology : E.Nida

28- Hindustani Phonetics : Dr. S.M. Qadri Zore

29- Karkhndari Urdu : Dr. G.C. Narang

30- A grammer of Urdu (Hindustani) : J.T. Platts

''اردو میں لسانی تحقیق'' پروفیسر عبدالستار دلوی کی مرتبہ کتاب ہے جس میں لسانی مطالعے سے متعلق نامورانِ ادب کے تقریباً تمام اہم مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کو ''حرف وصوت'' ''زبان اور بولی'' ''لفظ و معنی'' ''اردوزبان-افکارومسائل'' ''صوت وشعر'' اور ''رسم الخط'' کے ذیلی عنوانات میں تقسیم کر کے اردو کے تقریباً تمام اہم ماہرین لسانیات کے معروف مقالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مرتب پروفیسر عبدالستار دلوی ہیں جو اردو زبان وادب کے معروف وممتاز محقق ہیں۔ ان کا ادبی تحقیق وتنقید ہی نہیں بلکہ زبان وادب کی تدریس سے بھی لمبا اور گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ ممبئی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری کے بانی ڈائریکٹر تھے اور ملک و بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر و وزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ ان دنوں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''اردو زبان اور سماجی سیاق''، ''اردو میں لسانی تحقیق''، ''دوزبانیں دوادب''، ''اقبال کا ایک ممدوح - بھرتری ہری'' اور ''اقبال اور بمبئی'' وغیرہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-073-2
9 789351 600732
NCPUL New Delhi
Price: ₹ 193.00

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی - 110025